یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

جولائی ۱۹۹۳ء

ھدایہ: -/130 روپے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰھُمَّ عرفنی نفسک فانّک ان لم تعرفنی نفسک لم اعرف نبیّک اللّٰھم عرفنی نبیّک فانّک إن لم تعرفنی نبیّک لم اعرف حجّتک اللّٰھم عرفنی حجتک فانّک ان لم تعرفنی حجّتک ضللت عن دینی۔

"اھداء"

اس عالم میں مجھے کوئی ایسی ذات ستودہ صفات نظر نہیں آتی جس کی بارگاہ میں اس مجموعہ کو تقدیم کروں۔ سوائے ان ذواتِ مقدّسہ کے جن کو لسانِ وحی ترجمان نے قرینِ قرآن قرار دیا اور فرمایا۔ انّی تارک فیکم الثّقلین کتب اللّٰہ وعترتی "الحدیث" پس میں اس کتاب کو آلِ محمدؐ کی بارگاہِ قدس میں بطور ہدیہ پیش کر کے خوشنودی و رضائے خالق کی امید کرتا ہوں کیونکہ ان کی رضا و خوشنودی سے اللہ راضی و خوشنود ہوتا ہے۔

صلی اللّٰہُ علیکم یا اھل بیت النبوۃ وموضع الرسالۃ ومختلف الملائکۃ ومھبط الوحی والتنزیل ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ وبعد فھذہٖ ھدیۃ منی الیکم فتقبلوھا بقبول حسن یا سادتی وموالی۔ فانی موال لولیکم ومعاد لعدوکم عجّل اللّٰہ فرجکم۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله رب العالمين الرحمٰن الرحيم

ملك يوم الدين اياك نعبد و اياك نستعين

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ

وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَاب ط

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ

بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

سِيْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ

هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ

مِنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا

خَالِدُوْنَ ٥ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔

فہرست عناوین

اے اللہ! حضرات محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کے صدقہ میں مجھے اپنے دینِ متین کی خدمت کی مزید توفیق عطا فرما اور میری اس کتاب یعنی تفسیر انوار النجف کو صحفِ ابرار میں جگہ دے اور مومنین کرام کو زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کی سعادت نصیب فرما اور اس کو میرے لئے اور میرے آباء کرام اور میرے اعزاء وجملہ لواحقین نیز اساتذہ و تلامذہ کے لئے ذریعۂ بخشش و نجات قرار دے (آمین)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمہید

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا !

مدت سے طبیعت میں خیال پیدا ہوا تھا۔ اور چند روزہ دل میں تڑپ بھی پیدا ہوئی تھی لیکن عرصہ محدود تک کے لئے اور وہ صرف اس لئے کہ نہ حالات مقتضی تھے اور نہ اسباب موافق تھے نہ وقت میں گنجائش تھی اور نہ ہمت میں اسقدر یارا تھا۔ بس دل ہی دل میں ہاں اور نہ کی کشمکش تھوڑے وقت تک رہ کر منصرم ہو جاتی رہی۔ نجفِ اشرف میں گو اتنا وقت گزارنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ جتنا طبیعت چاہتی تھی۔ تاہم اپنے فرائض کا احساس تھوڑے ہی عرصہ میں پھر از سرِ نو پیدا ہو کر تیز سے تیز تر ہو گیا۔ حتّٰی کہ باوجود اسباب ظاہریہ کی عدم مساعدت کے اضمحلال پذیر نہ ہو سکا۔

وہ خیال یہ کہ خدمتِ علوم آلِ محمدؐ میں تدریسی فرائض سنبھالنے کے علاوہ تصنیف و تالیف کی طرف بھی اندام کروں۔ تاکہ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ اَفْضَلُ مِنْ دِمَاءِ الشُّهَدَاءِ کا مقدس جملہ صرف کانوں تک ہی محدود نہ رہ جائے بلکہ عملی اقدام کر کے امیدوارانِ اجر کے زمرہ میں خواہ آخری نمبر پہ ہی سہی شمار ہو جاؤں۔ متعدد گوشوں میں خیال دوڑایا کہ کس چیز پر قلم اٹھاؤں پھر کافی ذہنی جوڑ توڑ کے بعد اسی نظریہ پر پہنچ کر آخر کار طبیعت نے قرار پکڑا کہ قرآن مجید ہی کی خدمت پر لمحات فرصت کو صرف کروں کیونکہ یہ اساسِ دین بھی ہے اور اصل علوم بھی۔ لہٰذا باوجود انتہائی ہمت شکن حالات کے اسی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کا عزم مصمم کر کے تفسیر قرآن کے لکھنے پر کمر باندھی۔

چنانچہ اپنے دماغ میں یہ فیصلہ کر کے نجفِ اشرف کے زمانِ قیام میں ہی بعض عنوانات قائم کر کے بطور مقدمۂ تفسیر لکھنا شروع کر دیا۔ تاکہ شہرِ نجف بابِ مدینۂ علوم نبویہ کی بارگاہِ فیض بار سے اس خیرِ کثیر کی ابتداء انتہاء تک پہنچنے کی بشارت کی حامل ہو۔ صرف فال نیک قرار دیکر وہاں ابتداء کر لی اور اس کے بعد فوراً مراجعت وطن مالوف (پاکستان) کا مرحلہ پیش آگیا۔

یہاں پہنچ کر پھر خیالات میں تشتت و افتراق سا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ عالمِ خواب میں مولائے کونین ابوالحسنین بابِ العلوم النبویہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی بارگاہِ اقدس سے اشارہ پا کر اپنے گھر میں ہی مدرسہ دینیہ کی تشکیل کا ارادہ کر لیا۔ جس کا نام اپنے حسنِ عقیدت کی بناء پر جامعہ علمیہ "باب النجف" تجویز کیا۔ جس کی پہلی تحریک ۴ شوال سنہ ۱۳۷۴ھ بروز جمعہ ہوئی۔ اور اسی ماہ کے آخر میں سنگِ بنیاد رکھا گیا اور ساتھ ساتھ طلبہ کرام کے پہنچ جانے پر تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

دو سال کا عرصہ تو دوڑ دھوپ اور مدرسہ کے ابتدائی حالات کو سنوارنے کی کوشش میں صرف ہو گئے۔ جب

قدرے فراغت ملی تو ارادہ سابقہ کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن مدرسہ کی تعمیری منازل ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں لہذا صرف دو چار ورق مسودہ کے طور پر لکھنے کے بعد دفتر کتابت کو بند کر دیا۔

چونکہ تفسیر قرآن کے لکھنے کے متعلق اشتہارات شائع ہو چکے تھے۔ لہذا جہاں کہیں بسلسلۂ مجالس سفر کرنے کا اتفاق ہوتا تو ارباب محبت اور صاحبانِ عقیدت ملاقات ہوتے ہی رسمی احوال پرسی کے بعد تفسیر کے متعلق دریافت کرتے لکھی ہے یا نہ ؟ کتنی لکھی جا چکی ہے اور کس قدر باقی ہے ؟ اس قسم کے سوالات کے سننے کے بعد خجالت زدہ ہو کر جواب میں نفی نہ کر سکتا تھا اور نہ اثبات کی جرأت تھی۔ سوائے اس کے کہ اِدھر اُدھر کی باتوں سے ٹال دیا جاتا۔ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

بہر کیف ایک برس کامل اسی طرح ٹال مٹول میں گذر گیا اور یہ مدرسہ کا تیسرا سال تھا۔

بحمد اللہ اسی سال مدرسہ کا تعمیری کام بہت کچھ ختم ہو گیا اور طبیعت میں کافی سکون و اطمینان آگیا۔ لہذا دیرینہ خواہش کی تکمیل کا موقعہ پاکر لکھنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ میں لائق صد ستائش ہیں وہ لوگ جنہوں نے تعمیری اخراجات میں میرا بوجھ ہلکا کر کے مجھے اس قسم کے مشاغل سے سبکدوش کر دیا۔ خصوصاً ملک میوہ[1] رک سلمہ جس نے جامع مسجد باب النجف کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا اور عالی جناب سید غلام حسین شاہ صاحب فرزند سید علی شاہ صاحب مرحوم ساکن سید علیاں جنہوں نے تعمیر مسجد باب النجف کے لئے گرانقدر عطیہ کی پیش کش فرمائی۔

اور فخر سادات مخدوم سید محمد راجو سجادہ نشین شاہ یوسف گردیز ملتان جنہوں نے جامعہ علمیہ باب النجف کے وسیع احاطہ میں اپنے نام سے ایک علیحدہ مدرسہ بنوایا جو پانچ کمروں پر مشتمل ہے جس کا نام احاطۂ یوسفیہ تجویز ہوا اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً مدرسہ کی دیگر امداد بھی فرماتے رہتے ہیں۔

اور صوفی محمد انور سلمہ آف لاہور جنہوں نے مدرسہ کی باقی تعمیر کمروں کی تکمیل میں معتد بہ حصہ لیا۔ اُن کے علاوہ سید غلام رضا شاہ[2] صاحب ساکن نوشہرہ (سابق ذیلدار) سید عبدالغفار شاہ صاحب۔ ساکن ممووالی۔ سید امیر حسین شاہ صاحب ساکن مٹھہ پور۔ ملک غلام محمد ساکن واندھی شاہ داؤد۔ زوار کالو خان[2] ساکن جبار والا اور ملک فدا حسین جاڑا جنرل سیکرٹری مدرسہ ہذا جنہوں نے عمارتی لکڑی سے مدرسہ ہذا کی بہت کافی اعانت فرمائی۔

خداوند کریم ان کے اور باقی سب معاونین کے عطیہ جات کو شرفِ قبولیت مرحمت فرما کر ان کو اجرِ جزیل عطا کرے[3] آمین۔ اور بے حد ناشکری بلکہ انتہائی ناقدرشناسی ہو گی۔ اگر اس مقام پر اپنے قبلہ و کعبہ

---

[1] فوت ہو چکے ہیں خداوند کریم ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے [2] یہ بھی وفات پا چکے ہیں۔ خدا ان کو بخشے۔

[3] اس سلسلہ میں ملک غلام حیدر جاڑا لائق صد تحسین ہیں جن کی مساعی جمیلہ سے مدرسہ کے کمروں کی تعمیر میں حائل شدہ رکاوٹیں دور ہوئیں۔

والد ماجد[1] ادام اللہ ظلہ العالی کو فراموش کر دوں۔ جن کے وجودِ مسعود کی برکات اور با اخلاص دعاؤں کے اثرات کے علاوہ جانی ومالی تعاون اور غیر معمولی عملی جدّ وجہد سے مدرسہ کا خیالی خاکہ ناقابلِ انکار حقیقت بن کے رہا۔ ضعیفی اور پیری کے باوجود تعمیر مدرسہ میں انہوں نے وہ نمایاں خدمات انجام دیں جو نوجوانوں کو محوِ حیرت کر دیں اور یہ سب کچھ ان کے خلوص اور قوّتِ ایمان کا نتیجہ تھا۔ خداوندکریم ان کے سایۂ عاطفت کو ہمارے اوپر دیرگاہ رکھے اور ہمیں ان کے فیوض وبرکات سے مستفید ہونے کا زیادہ موقعہ بخشے۔

آخر میں ان طلبائے کرام کا شکریہ کرتا ہوں جن کے عملی تعاون سے باب النجف نے جامۂ حقیقت پہنا۔ سچ ہے اگر طلبہ کرام ہمت ہار جاتے تو مدرسہ کا تعمیری کام جو دنوں میں پورا ہوا وہ سالوں میں پورا ہوتا۔ خداوندکریم ان کی خدمات کو مقبول فرمائے اور اس کے صلہ میں ان کے دامن کو دولت علم وعمل سے بھر دے اور ان کو زیادہ سے زیادہ خدمتِ دین کا شوق عطا فرمائے۔

وہ طلبائے کرام جو ابتدائے تعمیر مدرسہ سے آخر تک شریک رہے ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

(۱) مولوی سید کرامت علی شاہ ساکن وِجھ ضلع سرگودہا۔ نائب مدرس جامع المنتظر لاہور۔ (۲) مولوی مشتاق احمد جاڑا۔ (۳) مولوی کاظم حسین جاڑا[2] (۴) مولوی سید امداد حسین شاہ ساکن کارلو والا متصل علاقہ بھکر ضلع میانوالی (۵) مولوی سید ضمیر باقر شاہ ساکن کلور کوٹ ضلع میانوالی (۶) مولوی محمد اعجاز خلف الرشید مولانا مولوی محمد حسن ٹاٹے پوری ساکن ڈیرہ اسماعیل خان (۷) سید نیاز حسن[3] ساکن کا ٹھگڑھ ضلع ڈیرہ (۸) محمد ہاشم ساکن جاڑا (۹) سید فیروز حسین شاہ ساکن گرہ بلوچ علاقہ ٹانک ضلع ڈیرہ (۱۰) سید ضیاء حسین شاہ ساکن گرہ بلوچ (ٹانک) (۱۱) غلام باقر ساکن نورنگ (ٹانک) (۱۲) ربنواز ساکن بھوک قریشی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان۔

خداوندکریم ان کو اور باقی تمام طلباء علوم آلِ محمدؐ کو تحصیل علوم دینیہ میں بلند حوصلگی عطا فرمائے اور مجھے ان کی صحیح خدمت کرنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق مرحمت فرمائے۔

جامع مسجد باب النجف کی ابتدائے تعمیر ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ کو ہوئی اور اس کی تکمیل ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ کو ہوئی اور شمال وجنوب میں (مسجد کی ہر دو طرف) جو اٹھارہ کمرے (مع مدرسہ یوسفیہ) ہیں ان کی ابتدائے تعمیر ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۸۱ھ کو اور تکمیل حسبِ سابق ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو ہوئی۔ وَالحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ اب اس کام سے

---

[1] الحاج ملک اللہ بخش جاڑا غفر اللہ واسکنہ فی فرادیس جنانہ جن کی وفات ۱۴ رماہ رمضان ۱۳۹۰ھ اور ۱۵ رماہ رمضان کی درمیانی رات مطابق ۱۳ راگست ۱۹۷۰ء ۱۰ بجے شب بدھوار اور صبح جمعرات ۱۰ بجے دن اپنی بستی جاڑا کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

[2] جو آجکل جامعہ حسینیہ جھنگ صدر میں بحیثیت پرنسپل تدریسی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

[3] فارغ التحصیل ہونے کے بعد قنال پور میں خطیب مقرر ہوئے تھے ۱۹۶۸ء میں ایکسیڈنٹ کے حادثہ سے وفات پا گئے ہیں خدا ان کو مغفرت کرے۔ آمین

کسی حد تک سبکدوش ہو جانے کے بعد تصنیف کی طرف اقدام کی جرأت کی بہت کوشش کی کہ کوئی نائب مدرس ایسا ملے جو میری طرح طالب علمی حیثیت کو اپناتے ہوئے امور تدریسیہ کی خاطر خواہ انجام دہی کے علاوہ تصنیف و تالیف میں میرا ہاتھ بٹائے۔ لیکن زمانہ کی ناسازگار ہوا نے ہم سے وہ رُخ بھی پھیر دیئے، جن پر ہمیں بہت زیادہ توقع تھی۔ جب پرانے با اخلاص اور عقیدت مند شاگردوں کے کندھوں پر سہارا لینے کی کوشش کی تو سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ جن پر سو فیصدی وفاداری کا ظن تھا۔ وہ سو فیصدی خود غرض مطلب پرست اور بہانہ جُو نکلے۔ بہت عرصہ تک کفِ افسوس ملتا رہا۔ کاش ایسوں سے ایسی توقعات وابستہ نہ کی ہوتیں۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔

جب اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار چکنے کے بعد معاون کے میسر نہ آنے کا کسی حد تک یقین ہُوا۔ اور اُمیدیں ختم ہوئیں اور اس طرف ہماری تمدید میں جس قدر اضافہ ہوتا گیا اس طرف احباب کے اصرار میں بجائے تخفیف کے تشدید کا اضافہ ہوتا گیا۔ پس اللہ پر بھروسہ کر کے تدریسی اوقات سے تھوڑا تھوڑا وقت بچا کر یہ کام شروع کر دیا۔ چنانچہ دس جمادی الثانیہ ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۵۸ء ۸ پوہ ۲۰۱۵ بکرمی۔ شب سوموار مقدمہ تفسیر کو لکھنا شروع کر دیا چونکہ اس کی پہل بارگاہِ قدس شہ نجف میں ہوئی تھی۔ لہذا تفسیر کے لئے "انوار النجف فی اسرار المصحف" نام تجویز کیا۔ اور بحمد اللہ ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۷۶ء بروز جمعرات ۴ بجے بعد دوپہر تفسیر کا کام مکمل ہو گیا۔

اس تفسیر میں مطمح نظر یہ ہے کہ احادیث و اقوال آئمہ اہلبیت کی روشنی میں مطالب قرآنیہ اور مقاصد ربانیہ کی ترجمانی کی جائے۔ باوجودیکہ اپنی علمی بے بضاعتی اور ذہنی کم مائیگی کے پیشِ نظر اس مقصد عظیم کو نبھانے کے لئے کمزوری کو بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن قرآنی خدمات سے موجودہ دَور کے ذمہ دار حضرات کی غیر معمولی تساہل شعاری بلکہ انتہائی پہلوتہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ڈر بھی محسوس ہوتا ہے کہ کہیں اس خیر کثیر کو ترک کر کے زیر بار نہ ہو جاؤں۔

خدا سے دُعا مانگتا ہوں کہ مجھے قرآن مجید کی صحیح خدمات انجام دینے والوں کے زمرہ میں محشور فرمائے اور قرآن کو نظر انداز کرنے والے یا مطالب قرآنیہ میں اپنی رائے کو دخل دینے والے گروہوں میں میرا حشر نہ کرے اور مجھے اس کار خیر کی انجام دہی میں تائید غیبی سے سرفراز فرما کر توفیق اتمام مرحمت فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ اللّٰھم اجعلنی ممن یذکر فتنفعہ الذکری۔

بحمد اللہ دعا مستجاب ہوئی اور تقریباً ۱۷ سال ۴ ماہ کی مسلسل محنت و کاوش کے بعد یہ تفسیر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اور اس مقدمہ کے ساتھ تفسیر ہذا کل چودہ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔

سلسلۂ اسناد

اکابر ملت بیضا و مصابیح شریعت غرّا حضرات علمائے عراق سے اجازہ روایت حاصل کرنے اور سلسلۂ جلیلۂ روایانِ احادیث ائمہ اطہار علیہم السلام میں منسلک ہونے کے بعد چاہتا ہوں کہ حاصل شدہ نعمت عظمیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بارگاہِ ربّ العزّت میں بنہایت عجز و انکساری دعا مانگوں کہ مجھے اس کار خیر کثیر یعنی ارادہ تالیف تفسیر میں اپنی عنایتِ عالیہ سے موید و موفق فرمائے۔ تاکہ میرا شمار بھی ان لوگوں میں سے ہو سکے۔ جنہوں نے ترویج معالمِ دینِ مبین کے لئے قلم اٹھائی اور اپنے صحیفۂ اعمال میں خدمات علوم آلِ محمدؐ کے غیر فانی و لازوال نقوش ثبت کئے

وماتوفیقی اِلّا باللّٰہ العلی العظیم

بطور تبرک اپنے سلسلۂ سند کو آئمہ طاہرینؑ کے ساتھ متصل کرنے کے لئے رجال سند کا ذکر کرتا ہوں فاقول

بحمد اللّٰہ حدثنی شیخی العلامہ محی الشریعۃ البیضاء ممیت البدعات العمیاء فخار العلماء ختام الفقہاء خاتمۃ المحدثین الاعلم الاورع آیۃ اللّٰہ العظمیٰ حجۃ الاسلام والمسلمین استاذ الفقہاء والمجتہدین الحاج محمد محسن المدعو بآقا بزرگ الطہرانی مدظلّہ اجازنی فی دارہٖ للسادس عشر من الجمیدی الثانیہ سنہ ۱۳۷۴ عن شیخہ العلامۃ خاتمۃ المحدثین والمجتہدین الحاج المیرزا حسین النوری المتوفی فی النجف فی (۱۳۲۰) عن استاذہ واستاذ الکل الشیخ العلامۃ المرتضیٰ الانصاری المتوفی (۱۲۸۱)

عن استاذہ وشیخہ الاوحد صاحب المستند المولی احمد النراقی المتوفی (۱۲۴۵) عن شیخہ واستاذہ آیۃ اللّٰہ بحر العلوم السید مہدی الطباطبائی المتوفی (۱۲۱۲) عن شیخہ الاستاذ الوحید الآقا محمد باقر البہبہانی المتوفی بالحائر الشریف (۱۲۰۶) عن والدہ و استاذہ الاجل المولی محمد اکمل عن العلامۃ الاعلم المولی محمد باقر المجلسی المتوفی (۱۱۱۱) عن والدہ العلامہ المولی محمد تقی بن مقصود علی المجلسی المتوفی (۱۰۷۰)

عن شیخ الاسلام والمسلمین بہاء الملۃ والدین محمد العاملی المتوفی (۱۰۳۰)

عن والدہ الشیخ عز الدین حسین بن عبد الصمد الحارثی المتوفی (۹۸۴)

عن استاذہ السعید الشیخ زین الدین الشہید المتوفی (۹۶۶)

عن الشیخ الفقیہ علی بن عبد العالی المیسی المتوفی (۹۳۸)

عن الشیخ محمد بن محمد بن محمد بن داؤد المؤذن الجزینی ابن عم الشهید الاوّل

عن الشیخ ضیاء الدین علی بن الشهید -

عن والده العلامہ السعید الشیخ شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن محمد المکی الجزینی

الشهید فی (۷۸۶) عن استاذہ فخر الدین محمد المعروف بفخر المحققین المتوفی (۷۷۱)

عن والدہ و استاذہ شیخ جمال الدین ابی منصور الحسن بن یوسف بن المطهر الحلی الشهیر بالعلامہ

المتوفی (۷۲۶) عن استاذہ الشیخ نجم الدین ابی القاسم جعفر بن الحسن بن سعید الحلی الشهیر بالمحقق

الحلی المتوفی (۶۷۶) عن الشیخ تاج الدین الحسن بن علی الدربی -

عن الشیخ ابی عبداللہ محمد بن احمد بن شهر یار الخازن لمشهد امیر المومنین علیہ السلام -

عن شیخہ و شیخ الطائفۃ الشیخ ابی جعفر محمد بن الحسن بن علی الطوسی المتوفی (۴۶۰)

عن شیخہ و استاذہ السعید الشیخ ابی عبداللہ محمد بن محمد ابن النعمان المفید المتوفی (۴۱۳)

عن شیخہ و استاذہ الشیخ ابی قاسم جعفر بن محمد بن قولویہ القمی المتوفی (۳۸۶)

عن شیخہ ثقۃ الاسلام الشیخ ابی جعفر محمد بن یعقوب الکلینی المتوفی (۳۲۹)

عن علی بن ابراهیم عن ابراهیم بن هاشم عن الحسن بن الحسین الفارسی عن عبدالرحمٰن

بن یزید عن ابیہ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قال رسول اللہ طلب العلم فریضۃ علی

کل مسلم الا ان اللہ یحب بغاۃ العلم

باسناد متصل حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ ہر مسلمان پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔ آگاہ ہو کہ اللہ علم کے چاہنے والوں کو دوست رکھتا ہے (کافی)

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی جعلنی من المتمسکین بولاء محمد وآل محمد والمنسلکین فی

سلسلۃ رواۃ احادیثهم صلی اللہ علیهم

علاوہ ازیں جن علماء سے اجازت برائے روایات حاصل کئے گئے ہیں ان کو کتاب "امامت و ملوکیت" کے اواخر میں مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔ اس جگہ تبرک کے لئے صرف ایک سلسلہ سند کو ذکر کیا گیا ہے۔

ضرورتِ علم

اس میں شک نہیں کہ بینائی نابینائی سے نور ظلمت سے اور علم جہل سے بہتر ہے لیکن کیا ہر جہالت گردن زدنی اور ہر علم واجب التحصیل ہے ؟

تو ہر ذی شعور کی طرف سے اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ ہر علم کی تحصیل امکانِ بشری سے بالاتر ہے۔ بلکہ ہر جہل سے تنزہ اور ہر علم سے اتصاف صرف ذاتِ علیم وعلیم ہی کا خاصہ ہے۔

انسان پر تو صرف ایسے علوم کی تحصیل حتی الامکان واجب ہے جو انسان کو تمام ایسے نقائص وعیوب سے بچنے کی دعوت دیں جو وقارِ انسانیت کے لئے باعثِ عار اور ناموسِ انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہوں اور ایسے علوم کی دریافت ضروری ہے۔ جو اوجِ کمالِ انسانیت کے آخری زینہ تک پہنچا دینے والے اسرار ورموز کا پتہ دیں ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ انسانی وجود دو اہم جزوں کا مجموعہ ہے یعنی بدن اور رُوح۔

بدن جزوِ کثیف مادی ہے جو عناصرِ اربعہ (مٹی، پانی، آگ، ہوا) سے مرکب ہے اور اس کا تعلق عالمِ سفلی سے ہے۔ روح جزوِ لطیف مجرد ہے اور بسیط ہے۔ یعنی مرکب نہیں اور بدن کا مدبّر ہے اور یہ عالمِ علوی سے تعلق رکھتا ہے۔ بنا بریں جزو اوّل بدن ظلمانی اور محکوم ہے اور دوسری جزو (روح) نورانی اور مدبّر ہونے کی حیثیت سے حاکم ہے بدن اور رُوح ہر دو کے بقاء اور ارتقاء کے لئے حفاظت اور تربیت ضروری ہے۔ پس بدنی نشوونما یا اصلاح کے لئے ایسے علوم کے حاصل کرنے کی سعی لازم ہے جو صرف کسبِ معاش میں سہولت کے موجب ہوں تاکہ جسمانی صلاحیتوں سے بود وباش کی فطری ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل ہو سکے اور بقاءِ نسلِ انسانی کے اہم فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ منازلِ روحانیت کی طرف قدم بڑھانے کے لئے کوئی ظاہری رکاوٹ سدِّراہ نہ ہو۔ کیونکہ جب تک انسان تندرست نہ ہو یا فکرِ معاش سے پوری طرح سکون واطمینان حاصل نہ کرلے باطنی اصلاح کی طرف قدم اٹھانا نہایت مشکل ودشوار ہے۔

لیکن یہ علوم چونکہ صرف بقاء وارتقاءِ جسمانیت کے لئے ہیں لہٰذا اتنی ہی مقدار پر اکتفاء کر لینا ضروری ہے۔ جس سے یہ مقصد پورا ہو سکے۔ حدِ ضرورت سے تجاوز صرف وبالِ جان ہی نہیں بلکہ وبالِ اخروی کا پیش خیمہ بھی ہے۔ گویا جسمانی ترقیاں روح کی تربیت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ہیں خود مقصود بالذات نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انسان عامۃ المخلوق کے مقابلہ میں اشرف المخلوقات کے زریں لقب سے ملقب ہے۔

رُوح کی تربیت اور فلاح وبہبود کے لئے ایسے علوم حاصل کرنے کی ضرورت ہے جن کی بدولت انسان

اپنی اس حقیقی منزل تک رسائی حاصل کر سکے۔ جس کا وہ اہل قرار دیا گیا ہے اور وہ صرف علوم شرعیہ ہی ہیں۔ جن کی اصل واساس قرآن مجید ہے انہی علوم کی بدولت انسان اپنے خالق سے قرب حاصل کر کے حیات جاودانی اور عیش سرمدی کے بلند ترین مقصد پر فائز ہو سکتا ہے اور اوج شرافت کے آخری کنارہ تک رسائی حاصل کر کے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ کا حقیقی مصداق بن سکتا ہے۔

لہذا وہ علوم جو نہ صرف مادہ پرستی کی دعوت دیتے ہیں بلکہ روح انسانیت کے لئے پیغام موت بھی ہیں۔

وہ علوم جو نہ صرف شکم پری کا ذریعہ ہیں بلکہ ظلم وتشدد کا آلہ کار بھی ہیں۔

وہ علوم جو صرف ظاہری وجاہت واقتدار کا سبب ہیں۔

اور وہ علوم جو خودستائی یا خودنمائی کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔

صرف جسد عنصری کے لئے چند روزہ بہار تو ضرور ہیں لیکن ان کا انجام روح انسانیت کی تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس قسم کی زندگی حیوانی زندگی یا اس سے بھی بدتر اور موت حیوانی موت یا اس سے بھی پست تر ہے

پس انسان کی زندگی صرف روح کی بقاء وارتقاء سے وابستہ ہے اور ایسے علوم کی تحصیل جو اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوں، انسانیت کے فرائض میں سے اہم ترین فریضہ ہے۔ لہذا زندگی کا اہم ترین حصہ اسی مقصد عظیم کی تحصیل کے لئے وقف کر دینا انسان کی عین سعادت اور اس سے پہلو تہی کرنا یا جی چرانا عین شقاوت اور کمال بدبختی ہے

اصول کافی میں منقول ہے۔ ایک روز حضرت رسالتمآبؐ وارد مسجد ہوئے۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم دیکھ کر سبب دریافت فرمایا۔ کسی نے عرض کیا حضور! یہاں ایک علامہ موجود ہے۔ جس کے اردگرد لوگ جمع ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ علامہ کا کیا مطلب ہے؟ لوگوں نے عرض کی حضور! ایک شخص ہے جو قدیم تاریخ عرب اور علم الانساب کا ماہر ہے۔ لوگ اس سے اس قسم کی باتیں دریافت کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ ایک ایسا علم ہے جس کے عالم کو اس سے کچھ فائدہ نہیں اور اس کے جاہل کو اس کا کچھ ضرر نہیں بلکہ علم تو صرف تین قسموں میں ہی منحصر ہے۔

(۱) آیات محکمہ کا علم (۲) فرائض کا علم

(۳) سنت کا علم (قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ تمام علوم بے فائدہ اور لغو ہیں)

گویا یہی علوم وہ ہیں جن کا عالم ان سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور ان کا جاہل ان کی جہالت سے نقصان اٹھاتا ہے اور یہی علوم انسان کو مادیت کے پست ترین گڑھے سے نکال کر اوج انسانیت کے بلند ترین زینہ پر فائز کرتے ہیں اگر ان علوم کے حاصل کرنے والا ظاہری دنیا سے انتقال بھی کر جائے تاہم اس کے روحانی فیوض و برکات کبھی مردہ نہیں ہو سکتے۔

بلکہ جس طرح ان علوم کا جاہل باوجود زندہ ہونے کے مردہ ہونے کے مترادف ہے۔

- اسی طرح ان کا عالم بعد موت کے بھی زندہ جاوید ہے۔
- اوّل الذکر کی زندگی ناموس انسانیت کے لئے عار ہے۔
- اور موخر الذکر کی زندگی وقار انسانیت کی بہار ہے۔
- وہ ننگ انسانیت مرنے کے بعد ذکر خیر سے قطعاً محروم ہوتا ہے۔

اور یہ محسن انسانیت صحیفۂ انسانیت کے مقدس اوراق پر اپنی علمی و عملی وجاہت اور حسن سیرت و بلند کردار کے وہ انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے جو انسانیت نواز افراد سے رہتی دنیا تک خراج تحسین حاصل کرتے رہیں گے۔ پس انسانیت کی ممتاز زندگی اور اس کی لازوال درخشندگی کے لئے علوم دینیہ کی تحصیل میں انتھک کوشش غیر متزلزل ارادہ اور بے پناہ جدوجہد از بس ضروری ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ جسمانی تربیت کے لئے اسی قدر کسب معاش ضروری ہے جس سے بقاء نوع انسانی کی عائد شدہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا سہل ہو اور روحانی تربیت کے لئے اس کے اسباب و ذرائع کی تلاش اس قدر ضروری ہے کہ اس سے اس کی بعد میں حاصل ہونے والی غیر فانی زندگی نہایت پرسکون اور خوشگوار بن سکے کس قدر افسوس و حیرت کا مقام ہے کہ جزو فانی (جسم) کے چند روزہ آرام و آسائش کے لئے انتہائی تگ و دو اور غیر معمولی جدوجہد سے کام لیا جائے لیکن جزو باقی (روح) کی ابدی زندگی کی فلاح و بہبود کو سراسر نظر انداز کر کے پس پشت ڈال دیا جائے اس سے بڑھ کر ناعاقبت اندیشی اور کیا ہو سکتی ہے؟ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار۔

قرآن مجید میں علم کی عظمت

اس میں کوئی شک نہیں کہ نعمت وجود کے بعد خزانۂ وحدت میں علم سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں جبھی تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اس نعمت سے نواز کر مبعوث فرمایا حضرت آدمؑ کو خلعت علم سے آراستہ فرما کر ملائکہ کی گردنیں جھکا دیں جس سے انہیں آدمؑ کی افضلیت کے اعتراف پر مجبور ہونا پڑا۔ طالوت اور جالوت کے قصہ میں معیار خلافت الٰہیہ علم ہی کو قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ حضرت رسالتمآبؐ کو باوجودیکہ تمام کمالات الٰہیہ کے جامع تھے بلکہ تمام کائنات کے لئے ان کا مقدس وجود سرچشمۂ نعمات تھا۔ تاہم ذات احدیت نے ان کو بھی اپنی بارگاہ سے طلب علم پر مامور فرمایا چنانچہ ارشاد ہوا۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔

حضرت امیر المومنینؑ علی بن ابی طالب علیہما السلام مقامِ افتخار میں نعمتِ علم ہی کو پیش فرمایا کرتے تھے چنانچہ آپ کی طرف نسبت شدہ اشعار میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

رَضِیْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِیْنَا لَنَا عِلْمٌ وَلِلْاَعْدَاءِ مَالٌ

ہم اللہ کی تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمیں علم اور دشمنوں کو مال ملا۔

فَاِنَّ الْمَالَ یَفْنٰی عَنْ قَرِیْبٍ وَاِنَّ الْعِلْمَ یَبْقٰی لَا یَزَالُ

کیونکہ مال عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم باقی اور غیر فانی ہے۔

علامہ زین الدین عاملی (شہید ثانی) قدس سرہ، منیۃ المرید میں قرآنی اقتباسات سے فضیلت علم کو ثابت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے۔

کہ خداوند عالم نے علماء کو تمام ماسوا پر فوقیت مرحمت فرمائی ہے چنانچہ فرماتا ہے هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ ترجمہ:۔ کیا برابر ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں ساتھ ان لوگوں کے جو علم نہیں رکھتے؟ یہ استفہام انکاری ہے یعنی برابر نہیں بلکہ عالم جاہل سے افضل ہے۔)

اس کے علاوہ خداوند کریم نے اپنی پاک کتاب میں کئی چیزوں کے تقابل کا ذکر فرمایا۔ مثلاً خبیث، وطیب نابینا وبینا ظلمت ونور۔ جنت ونار اور سایہ اور دھوپ لیکن اگر نظرِ غائر سے ان کی تفسیر کا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ علم وجہل ہی نکلتا ہے۔ یعنی عالم کو طیب، بینا، نور وجنت اور ظل کی لفظوں سے یاد کیا گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں جاہل کو خبیث ونابینا ظلمت ونار اور حرور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض آیات میں خداوند کریم نے صاحبانِ علم کو اپنے اور ملائکہ کے ذکر کے ساتھ یاد فرمایا۔ چنانچہ فرماتا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ۔ ترجمہ:۔ اللہ شاہد ہے کہ تحقیق اس کے علاوہ اور کوئی بھی لائق عبادت نہیں اور ملائکہ اور صاحبانِ علم (یہ بھی شاہد ہیں)

نیز قرآن مجید میں چار قسموں کے لئے درجات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ۱۔ اہل بدر ۲۔ مجاہدین ۳۔ صالحین۔ ۴۔ علماء۔ اہل بدر کے متعلق فرمایا:۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الی قولہ) لَهُمْ دَرَجَاتٌ۔ سوائے اس کے نہیں کہ مومن وہی لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل تڑپ جائیں (یہاں تک کہ فرمایا) ان ہی کے لئے درجات ہیں۔

مجاہدین کے لئے فرمایا:۔ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِیْنَ الآیۃ یعنی اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بدرجہا فضیلت کرامت فرمائی۔

صالحین کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحَاتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ

الدَّرَجَاتُ الْعُلٰی ۔ جو اللہ کے پاس مومن صالح ہو کر آئے گا پس ان کے لئے ہی بلند درجات ہوں گے۔
علماء کے حق میں خطاب فرمایا ۔ یَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۔
یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور وہ لوگ جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجات کو بلند فرماتا ہے
نیز خداوندِ کریم نے علماء کو پانچ اوصافِ حمیدہ سے ملقب فرمایا ہے ۔

۱۔ ایمان :۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا یعنی راسخ فی العلم کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ۔

۲۔ توحید ۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ ۔ یعنی اللہ اپنی توحید کا شاہد ہے اور فرشتے اور علماء ۔

۳۔ بکاء و حزن :۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (الیٰ قولہ) یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ الآیۃ ۔ یعنی تحقیق وہ لوگ جو علم دیئے گئے ہیں وہ خدا کے سامنے سجدہ میں جھک جاتے ہیں ۔

۴۔ خشوع :۔ چنانچہ آیتِ گذشتہ اس پر دلالت کرتی ہے ۔

۵۔ خشیہ :۔ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ یعنی خدا سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں ۔

شہید ثانی کے بیان کو میں نے اختصار سے ذکر کیا اگر فضیلتِ علم پر دلالت کرنے والی تمام آیات کو جمع کیا جائے تو طول ہو جائے گا ۔ اس مقام پر تبرکاً و تیمناً جو کچھ ذکر کر دیا گیا ہے کافی ہے ۔

جب آیاتِ متذکرہ سے علم کے فضل و کمال کو واضح کر دیا تو علم کی تحصیل کا وجوب از روئے عقل و نقل ثابت ہے ۔ عقلاً اس لئے کہ ہر کمال کا حاصل کرنا ۔ یا اس کے حصول کی کوشش کرنا انسان کا عقلی فریضہ ہے ۔ اور علم بھی چونکہ کمال ہے لہذا اس کا طلب کرنا بھی عقلی فریضہ ہے ۔ قرآن مجید اس کا صریح طور پر یوں تذکرہ فرماتا ہے ۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ الآیۃ پ۱۱ رکوع ۴ جس کا مرادی معنی یہ ہے کہ علومِ فقہیہ دینیہ کے حاصل کرنے کے لئے ہر قوم سے ایک ایک گروہ کیوں نہیں سفر کرتا ۔

گویا پورے ملک میں صرف ایک آدمی کے فقیہ ہونے پر کفایت کرنا تو بجائے ایک قوم کے لئے بھی ایک فقیہ کو کافی نہیں قرار دیا گیا ۔ بلکہ ہر قوم میں متعدد فقہاء کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے جو قوم کے دینی مسائل حل کریں اور فرائض تبلیغ انجام دیں اور ہر قوم پر واجب ہے کہ ان سے مسائل دینیہ کا حل طلب کریں اور انہیں فرائض تبلیغ کے انجام دینے کا موقعہ دیں ۔

یہ عمومی حکم صرف اس لئے دیا گیا ہے ۔ تاکہ عوام کو مسائل دینیہ کے حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ رہے اگر ایک ملک میں صرف ایک ہی فقیہ ہو تو ظاہر ہے کہ تمام ملکی عوام اس سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کر سکتے بعض ضروری

مسائل بعض اوقات اس قسم کے درپیش ہو جاتے ہیں جو مطبوعہ رسائل وعملیات میں نہیں ملتے۔ تو دریں صورت بجز رجوع فقیہ کے ان کا حل مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر صرف ایک ہی فقیہ پورے ملک میں ہو تو نہ سب عوام مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اور نہ فقیہ خود اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر ہر قوم میں ایک ایک فقیہ ہو تو پہلی صورت سے اس میں کافی آسانی ہے لیکن اگر ہر قوم میں متعدد فقہاء موجود ہوں تو کسی وقت بھی کسی دشواری کا پیش آنا ناممکن ہے
اسی نکتہ کے پیشِ نظر خداوند علیم وحکیم نے شریعت کو سہلہ قرار دیتے ہوئے ہر قوم میں متعدد فقہاء پیدا کرنے کا حکم دیا تاکہ احکام شرعیہ کے سیکھنے میں کوئی فرد بشر نارسائی کا شکوہ نہ کر سکے۔
اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مجتہد اعلم کی تقلید واجب نہیں بلکہ ہر مجتہد جامع الشرائط کی تقلید ہو سکتی ہے اس مسئلہ کو ہم تفصیل کے ساتھ زیرِ عنوان "قرآن اور تقلید" بیان کریں گے ص۲۰۷ پر ملاحظہ ہو۔

احادیث کی روشنی میں علم کی اہمیت

علم اور اہلِ علم کے فضائل میں کتب عامہ وخاصہ سے احادیث بکثرت موجود ہیں۔ شہید ثانی قدہ نے کتب فریقین سے کافی احادیث کو یکجا کیا ہے۔ یہاں چند ایک کا ذکر کافی ہے۔

احادیث نبویہ

قَالَ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی عُتَقَاءِ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ فَلْيَنْظُرْ اِلَى الْمُتَعَلِّمِيْنَ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا مِنْ مُتَعَلِّمٍ يَخْتَلِفُ اِلٰى بَابِ الْعَالِمِ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ قَدَمٍ عِبَادَةَ سَنَةٍ وَبَنَى اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ قَدَمٍ مَدِيْنَةً فِي الْجَنَّةِ وَيَمْشِيْ عَلَى الْاَرْضِ وَهِيَ تَسْتَغْفِرُ لَهٗ وَيُمْسِيْ وَيُصْبِحُ مَغْفُوْرًا لَهٗ وَشَهِدَتِ الْمَلَائِكَةُ اَنَّهُمْ عُتَقَاءُ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ۔

حضور نے فرمایا جو شخص چاہے کہ میں ایسے لوگوں کی زیارت کروں جن کو اللہ نے جہنم سے آزاد کیا ہے پس وہ طلبہ علم کی زیارت کرے مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ جب کوئی متعلم عالم کے دروازہ پر جاتا ہے تو اس کیلئے ایک سال کی عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے اور ہر قدم کے بدلے اس کا جنت میں شہر بنتا ہے جب چلتا ہے تو زمین اس کے لئے استغفار کرتی ہے اور صبح وشام اس کے لئے بخشش کے دروازے کھلے رہتے ہیں اور فرشتے گواہ ہیں کہ وہ جہنم سے خدا کے آزاد کردہ ہیں۔

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْاِسْلَامَ كَانَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ

جو شخص احیائے اسلام کیلئے علم سیکھتے ہوئے مر جائے تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک

دَرَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ

درجہ کا فاصلہ ہوگا۔

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ سَبْعِيْنَ دَرَجَةً بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ حَضْرُ الْفَرَسِ سَبْعِيْنَ عَامًا وَ ذٰلِكَ لِاَنَّ الشَّيْطٰنَ يَضَعُ الْبِدْعَةَ لِلنَّاسِ فَيُبْصِرُهَا الْعَالِمُ فَيُزِيْلُهَا وَالْعَابِدُ يَقْبَلُ عَلٰى عِبَادَتِهٖ۔

عالم عابد سے ایسے ستر درجات بلند ہے کہ ہر دو درجہ کے درمیان کا فاصلہ تیز رو گھوڑے کے ستر سال کا سفر ہو اور یہ اسلئے کہ شیطان لوگوں میں بدعات پھیلاتا ہے تو عالم ان بدعات کو دیکھکر مٹاتا ہے اور عابد تو صرف عبادت ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے (یعنی عالم اپنے نفس کے علاوہ عامۃ الناس کے نفوس کی اصلاح کرتا ہے اور عابد صرف اپنے نفس کو ہی فائدہ پہنچا سکتا ہے)

وقال اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ

تحقیق علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

یہ پانچ حدیثیں جناب رسالتمآبؐ کی زبان وحی ترجمان سے منقول ہیں اور بطریق اہلبیتؑ جو احادیث اس ضمن میں وارد ہیں ان کا احصا ایک ضخیم کتاب میں ہو سکتا ہے۔ یہاں تبرکاً بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) شہید ثانی نے باسناد صحیح حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے نقل کیا ہے جس کی سند جناب رسالتمآبؐ تک پہنچتی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا (ترجمہ حدیث) علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ پس علم کو اپنے محل سے طلب کرو اور اس کے اہل سے حاصل کرو۔ کیونکہ اللہ (کی خوشنودی) کے لئے علم کا سیکھنا اور حاصل کرنا عبادت ہے اور اس کا مذاکرہ تسبیح اور اس پر عمل کرنا جہاد ہے اس کا ان پڑھ کو پڑھانا صدقہ اور اس کے اہل تک پہنچانا قرب خدا کا ذریعہ ہے کیونکہ اسی سے حلال و حرام کا پتہ چلتا ہے اور یہی سبیل جنت کا مینار و مونس وحشت و غربت و تنہائی کا ساتھی و علیحدگی میں ہمکلام و خوشی و غمی میں سہارا و ہمدم و دشمنوں کے مقابلہ میں ہتھیار اور دوستوں میں زینت ہے۔ اسی کی بدولت خدا اقوام کو بلند کرتا ہے اور ان کو امور خیر میں قیادت بخشتا ہے تاکہ ان کے اقوال اخذ کئے جائیں اور ان کے افعال کی اقتداء کی جائے اور ان کی بات آخری اور قطعی فیصلہ ہو۔ فرشتے ان کی دوستی میں رغبت رکھتے ہیں اور ان سے اپنے پروں کو مس کرتے ہیں اور ان کی نمازوں میں برکت کا موجب ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ہر خشکی و تری حتیٰ کہ دریائی مخلوق اور صحرائی جانور بھی استغفار کرتے ہیں تحقیق علم قلوب کی زندگی ہے۔ جہالت کے مقابلہ میں اور آنکھوں کی روشنی ہے تاریکی جہل سے اور قوت جسم ہے بمقابلہ ضعف و ناتوانی کے۔ یہ (علم) انسان کو اخیار کی منازل ابرار کی مجالس اور دنیا و آخرت کے بلند درجات پر فائز کرتا ہے۔ اس کا مذاکرہ روزوں کے برابر اور اس کا درس عبادت کے برابر ہے۔ اسی کی بدولت اللہ کی اطاعت و عبادت و صلہ رحمی اور معرفت حلال و حرام ہوتی ہے۔

علم عمل کا مقتدا ہے اور عمل اس کا مقتدی نیکوں کو نصیب ہوتا ہے اور بدبخت اس سے محروم رہتے ہیں پس طوبیٰ ہے اس کے لئے جو اس (نعمت) سے محروم نہ رہے۔

(۲) تفسیر برہان میں امالی صدوقؒ سے منقول ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی مومن مر جائے اور کوئی ایک ورقہ کاغذ ایسا چھوڑ جائے جس پہ علمی مطالب مکتوب ہوں تو وہی کاغذ بروز محشر اس کے اور جہنم کے درمیان حائل ہوگا اور اس کے ہر ہر حرف کے بدلہ میں خدا اسے ایک ملک عطا کرے گا جو پوری دنیا سے سات گنا بڑا ہوگا۔

(۳) کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ عالم جس کے علم سے فائدہ اٹھایا جائے ستر ہزار عابد سے افضل ہے۔

(۴) تفسیر برہان میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ تمام خلق سے آئمہ ہدیٰؑ کے بعد کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ علمائے صالحین۔ پھر پوچھا گیا کہ تمام خلق خدا سے ابلیس۔ فرعون اور تمہارے اعداء کے بعد کون بدترین مخلوق ہے تو فرمایا کہ وہ علمائے فاسدین ہیں۔ جو باطل کو ظاہر کرتے ہیں اور حق پر پردہ ڈالتے ہیں۔

توضیح جس طرح مادی دنیا میں خلق خدا کے درمیان ظاہری اصلاحات کے ذمہ دار افراد کو سلاطین یعنی بادشاہ کہا جاتا ہے اسی طرح روحانی دنیا میں خلق خدا کے نفوس کی اصلاح کے ذمہ دار افراد روحانی حکمران و بادشاہ ہوتے ہیں۔ ان کی بادشاہت و سلطنت ظاہری طاقت و اقتدار کے بل بوتے پر نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ دولتِ علم و معرفت سے سرفراز فرما کر خدا خود انہیں اس عہدہ کے لئے نامزد فرماتا ہے اور حضرت آدمؑ ابوالبشر سے لے کر حضرت خاتم الانبیاءؐ جناب محمدؐ مصطفےٰ تک کل ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و مرسلین اور ان کے بعد ان کے اوصیاء طاہرین علیہم السلام سب کے سب خدا کی جانب سے روحانی حکمران ہیں۔

چونکہ جناب رسالتمآبؐ اس سلسلہ میں سلطان السلاطین کی حیثیت رکھتے ہیں اور سید الانبیاء والمرسلین کے مقدس لقب سے ملقب ہیں۔ لہٰذا ان کے اوصیاء طاہرینؑ ان کے قائمقام ہونے کی حیثیت سے صرف گذشتہ اوصیاء سے افضل نہیں۔ بلکہ تمام انبیائے سابقین سے بدرجہا افضل و اشرف ہیں۔

کیونکہ بادشاہ کے وزراء یا قائمقام صرف اپنے بادشاہ ہی کے ماتحت ہوا کرتے ہیں اور باقی تمام رعایا کے حاکم ہوا کرتے ہیں اور رعایا سب اُن کی محکوم ہوتی ہے۔ خواہ عام انسان ہوں یا ان میں افسر وغیرہ ہوں۔ اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ تمام انبیاء سابقینؑ حضورؐ سرور کائنات کے سامنے رعایا کی حیثیت سے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے اوصیاءؑ کی بھی رعایا ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت قائم عجل اللہ فرجہ علیہ السلام کے انتظار میں موجود ہیں اور ان کی اقتدار میں نماز ادا کر کے دنیا والوں کو اپنے عمل سے بتائیں گے کہ حاکم کون ہے اور محکوم کون؟ جب حضرت خاتم الانبیاءؐ کے آخری جانشین گذشتہ انبیاء کے سردار اور حاکم ہیں تو ان کے پہلے جانشین کیونکر نہ ہوں گے؟

پس جس طرح مادی حکمرانوں کی دفتری ملازمتیں اور عہدہ جات ظاہری عزت و وقار اور چند روزہ وجاہت کی خاطر

مرغوب طبع ہوا کرتی ہیں ۔ چونکہ روحانی سلاطین کے مشن کی ترویج کے لئے ملازمت یا عہدہ داری عین سعادت اور کمال روح ہونے کے علاوہ محبوب خدا بھی ہے ۔ لہٰذا اس کو پہلی قسم کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دینا اور محبوب طبع بنانا انتہائی دانشمندانہ فیصلہ ہے ۔

علمائے دین کو حکومت دنیہ کا عہدۂ نیابت سپرد کیا گیا ہے ۔ جو ظاہری حکومتوں کی وزارت سفارت یا قائمقام ہونے کے مقابلہ میں ہے ۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ۔

فی روایۃ عمرو بن حنظلہ عن الصادقؑ فی الکافی مَنْ کَانَ مِنْکُمْ مِمَّنْ قَدْ رَوٰی حَدِیْثَنَا وَنَظَرَ فِی حَلَالِنَا وَحَرَامِنَا وَعَرَفَ اَحْکَامَنَا فَلْیَرْضَوْا بِهٖ حَکَمًا فَاِنِّیْ قَدْ جَعَلْتُهٗ عَلَیْکُمْ حَاکِمًا فَاِذَا حَکَمَ بِحُکْمِنَا فَلَمْ یَقْبَلْهُ مِنْهُ فَاِنَّمَا اسْتَخَفَّ بِحُکْمِ اللّٰهِ وَعَلَیْنَا رَدَّ وَالرَّادُّ عَلَیْنَا الرَّادُّ عَلَی اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰی حَدِّ الشِّرْکِ بِاللّٰهِ وَفِیْ حَدِیْثٍ مَنْ کَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِنًا لِنَفْسِهٖ حَافِظًا لِدِیْنِهٖ مُخَالِفًا عَلٰی هَوَاهُ مُطِیْعًا لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ یُّقَلِّدُوْهُ ۔

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں جو شخص تم میں سے ہماری احادیث کو بیان کرے اور حلال و حرام و دیگر احکام کو جانتا ہو پس مومنین کو اس کی حکومت پر راضی ہونا چاہیئے ۔ میں نے اس کو تمہارے اوپر حق حکومت دیا ہے پس جب وہ ہمارا حکم بیان کرے اور اس کو قبول نہ کیا جائے تو اللہ کے حکم کی توہین اور ہماری تردید ہوئی اور ہماری تردید اللہ کی تردید ہے اور وہ شرک کی حد ہے ۔ فقہاء میں سے ہر وہ شخص جو اپنے نفس کا (گناہوں سے) بچانے والا اور دین کا نگہبان خواہش نفسانی کا مخالف اور اللہ کا فرمانبردار ہو ۔ عوام کو چاہیئے کہ اس کی تقلید کریں ۔

(ان ہر دو حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلم کی تقلید ضروری نہیں ۔ بلکہ ہر مجتہد جامع الشرائط کی تقلید کی جا سکتی ہے)

پس جو فرق حکومت ظاہریہ کے عام وفادار رعایا اور عہدہ داروں میں ہے ۔ وہی فرق حکومت باطنیہ شرعیہ کے اطاعت گزار (عابد) اور عہدہ دار (عالم) کے درمیان ہے ۔

جس طرح ظاہری حکومت میں عام افراد رعایا کے جرم اور عہدہ دار کے جرم میں نوعیت کا فرق ہے ۔ اسی طرح قانون شریعت کی رو سے عام لوگوں کے گناہ اور عالم کے گناہ میں نوعیت جدا جدا ہے ۔

کیونکہ عام انسانوں کی اطاعت یا مخالفت کا نفع یا نقصان ان کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے ۔ بخلاف اس کے عہدہ دار حکومت کی فرمانبرداری یا نافرمانی نیکی یا بدی اس کے تمام حلقۂ اثر و رسوخ میں مبلغانہ حیثیت سے بہت سوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی ہے کیونکہ گفتار سے کردار زیادہ مؤثر ہوا کرتا ہے ۔

پس جس طرح اس کی اطاعت عام لوگوں کی اطاعت سے زیادہ وزنی اور قابل قدر ہوتی ہے اسی طرح اس کی مخالفت اور نافرمانی عام نافرمانیوں اور مخالفتوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک اور قابل نفرت ہوتی ہے ۔

لہٰذا مقتضائے عقل یہی ہے کہ اس کی اطاعت کا صلہ عوام کی اطاعت کی جزا سے زیادہ ہو۔ اور اس کی مخالفت کی سزا عام لوگوں کی مخالفت کی سزاؤں سے زیادہ سخت اور عبرتناک ہو۔

اس وضاحت سے صاف معلوم ہوگیا کہ احادیثِ سابقہ میں جو معصوم نے عالم اور عابد کے درمیان فرق بیان فرمایا ہے اور عالم کو ستر ہزار عابد سے افضل قرار دیا ہے یا عالم باعمل کا مرتبہ آئمہ کے بعد تمام خلق سے افضل ہونا اور عالم بے عمل کا درجہ ابلیس و فرعون و دشمنانِ اہلِ بیت کے بعد سب مخلوق سے پست ترین ہونا بیان فرمایا ہے قرینِ عقل ہے اور قانونِ عدل و انصاف کے عین موافق ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِمَّنْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعُہُ الذِّکْرٰی

علمِ تفسیر

اس میں کسی کو شک و شبہ کرنے کی گنجائش نہیں کہ دینِ اسلام کی اصل و اساس قرآن مجید ہی ہے اور جناب رسالتمآب اور آئمہ طاہرین علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام کی احادیث شریفہ بھی گو شریعتِ اسلامی میں بنیادی حیثیت کی حامل ہیں لیکن وہ اس لئے کہ ان کی زبانِ حق ترجمانِ قرآن کریم ہی کا بیان تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب کسی معصوم سے اپنے بیان کی صداقت پیش کرنے کے لئے دلیل طلب کر لی جاتی تھی تو آپ بلا تأمل و تاخیر قرآن مجید کی آیات متعلقہ[1] کو بطور استشہاد پڑھ دیا کرتے تھے اور جس مقام پر سامعین کو معصوم کے کسی بیان کے مطابقِ قرآن ہونا معلوم ہوتا تھا تو خاموشی سے ارشاداتِ معصوم کی سماعت کرتے تھے

اسی بناء پر تو معصوم نے خود بارہا ارشاد فرمایا کہ ہماری احادیث میں سے جو مطابقِ قرآن نہ ہو۔ اسے دیوار پر مار دو۔ وہ ہماری نہیں بلکہ ہماری طرف منسوب کر دی گئی ہے اور جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ لے لو۔ کیونکہ ہماری ہے گویا اہلبیتؑ عصمت سے وارد شدہ احادیث میں سے کوئی حدیث بھی ایسی نہیں جو مضمونِ قرآن کے خلاف ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مقام پر حدیثِ معصوم کے مطابق شاہد قرآنی پیش کرنے سے ہم قاصر ہو جائیں کیونکہ یہ ہماری کوتاہ علمی اور نافہمی کی دلیل ہے اس سے اہلِ بیت کے کلام کا خلافِ قرآن ہونا لازم نہیں آتا۔ چنانچہ ان کا قرآن کے ساتھ ہونا اور قرآن کا ان کے ساتھ ہونا حدیثِ ثقلین اور دیگر احادیثِ نبویہ سے ظاہر اور واضح ہے۔

بہرکیف مطالب دینیہ اور علوم اسلامیہ کا مدار اور اصل و اساس قرآن مجید ہی ہے۔

تو نہایت حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ دورِ حاضر میں علوم قرآنیہ سے دلچسپی ختم ہوگئی ہے حتیٰ کہ اس دور کے

---

[1] جن کا تعلق معصوم کے بیان سے ہوتا تھا۔ منہ

مدارس دینیہ بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے جن علوم کو مقدمہ قرار دیا گیا ہے۔ مدارسِ دینیہ میں وہی مقصود بالذات قرار دیئے گئے ہیں زندگی کا قیمتی اور اہم ترین حصہ مقدمات کی تحصیل میں خرچ کر دیا جاتا ہے اور علومِ قرآنیہ کو مطالعہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جس پر کوئی صاحب ہمت بمشکل ہی موفق ہو سکتا ہے اور سلسلۂ تصنیف و تالیف بھی اس گوہرِ مراد سے خالی و یکسر بیگانہ ہی ہے۔

حالانکہ خداوندکریم نے اپنی مقدس کتاب میں متعدد مقامات پر انسان کو آیاتِ قرآنیہ میں تدبّر و تفکّر کی دعوت دی ہے اور حضرت رسالتمآبؐ نے کئی مرتبہ صحابہ کرام کو اہلبیت اور قرآن ہر دو کے دامن سے وابستگی کا تاکیدی حکم فرما کر ان دونوں کی اہمیت کو اور زیادہ اجاگر کیا ہے۔ آئمہ طاہرینؑ سے بکثرت احادیث وارد ہیں جن میں قرآن میں غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے لیکن موجودہ دَور کی اُفتادِ طبع اس سے یکسو ہے۔ تمام اقوال و فرامین طاقِ نسیان کی زینت ہیں۔ اتنی غفلت شعاری اور پہلو تہی کہ توجہ و التفات تک نہیں اور یہی وجہ ہے کہ مدارس دینیہ کے اکثر فارغ التحصیل فضلاءُ بعض آیاتِ قرآنیہ کا صحیح لفظی ترجمہ بھی نہیں کر سکتے۔

ہمارے کچھ عربی دان حضرات اس بات پر بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہمیں مولوی یا عالم کہا جائے اور انتہائی خوشی ہوتی ہے جب اُن کو نائب امام کی مقدس لفظ سے نسبت دی جائے اور اگر کوئی اس قسم کے خطابات کو مجلس مکالمہ میں ترک کر دے تو دل میں خفگی اور کڑھن سی پیدا ہوتی ہے لیکن اپنے گریبان میں قطعاً دھیان نہیں کیا جاتا کہ آیا میں ان خطابات کے اہل بھی ہوں یا نہیں؟

ہمارے عوام کا نظریہ تو اس قدر پست ہے کہ معمولی سے معمولی تعلیم یافتہ کو وہ عالم کہہ دیا کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کی معرفت ہی اسی قدر ہے لیکن جس کو عالم کہا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ خجالت محسوس کرتا اور آئندہ کے لئے لوگوں کو اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے منع کرتا۔ وہ اُلٹا خوشی محسوس کرتا اور فخر سمجھتا ہے دل میں پھولا نہیں سماتا اور اسی مقدس خطاب کی آڑ لے کر لوگوں سے روپیہ وصول کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی بیماری کو رفع کرتا۔ اُلٹا باقی لوگوں کے بیمار کرنے کے درپے ہو جاتا ہے اور اس سے اس کی شکم پُری بھی خوب ہوتی ہے۔

ہمارے سامنے کا واقعہ ہے۔ ایک بزرگ اچھے خاصے سمجھ دار و تعلیم یافتہ ہمارے ایک طالب علم سے دریافت کرنے لگے کہ تو نے صرف پڑھی ہے؟ اس نے جواب دیا جی ہاں۔ بزرگ نے سوال کیا نحو پڑھی ہے۔ جواب دیا جی ہاں۔ پھر پوچھا کچھ منطق بھی پڑھی ہے؟ کہا جی ہاں! بزرگ یہ جوابات سُن کر آخر میں فرمانے لگے کہ پھر تو آپ بڑے ہی عالم ہوئے انہی باتوں میں ہمارے علم جو حضرات فریب خوردہ ہو کر علم کو ترک کر بیٹھتے ہیں اور چند مقدمات کی تحصیل کے بعد اپنے تئیں عالم خیال کرتے ہیں اور علوم قرآنیہ کے قریب تک نہیں آتے۔ حالانکہ عالم کہلانے کا اسے حق حاصل ہے جو قرآنی مطالب پر سیر حاصل نظر رکھتا ہو۔ چنانچہ اصولِ کافی میں ایک حدیث وارد ہے۔ مولائے کائنات حضرت امیرالمومنین علیہ السلام

ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِالْفَقِيْهِ مَنْ لَمْ يُقَنِّطِ النَّاسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ وَلَمْ يُؤْمِنْهُمْ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ وَلَمْ يُرَخِّصْ لَهُمْ فِيْ مَعَاصِي اللّٰهِ وَلَمْ يَتْرُكِ الْقُرْاٰنَ رَغْبَةً عَنْهُ اِلٰى غَيْرِهٖ اَلَا لَاخَيْرَ فِيْ عِلْمٍ لَيْسَ فِيْهِ تَفَهُّمٌ اَلَا لَا خَيْرَ فِيْ قِرَاْءَةٍ لَيْسَ فِيْهَا تَدَبُّرٌ اَلَا لَاخَيْرَ فِيْ عِبَادَةٍ لَيْسَ فِيْهَا تَفَكُّرٌ۔

آگاہ ہو میں تمہیں ایسے فقیہ کا پتہ دوں جو کماحقہ فقیہہ ہے وہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرے۔ اور عذاب خدا سے نڈر نہ کرے اور اللہ کی نافرمانی میں ڈھیل نہ دے اور قرآن سے دوسری طرف اعراضاً منہ نہ پھیرے آگاہ ہو کہ اس علم میں کوئی خوبی نہیں جس میں سمجھ نہ ہو۔ وہ قرآن خوانی بے فائدہ ہے جس میں تدبّر نہ ہو (اور اس عبادت میں بھی" کوئی اچھائی نہیں۔ جس میں تفکّر نہ ہو۔

وفی البرھان عن النبیؐ لَا يُعَذِّبُ اللّٰهُ قَلْبًا وَعٰى الْقُرْاٰنَ۔

تفسیر برہان میں جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا اس دل کو عذاب نہ کرے گا۔ جس میں قرآن محفوظ ہے۔

وایضًا فِيْهِ عَنْهُ خِيَارُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ وَفِيْهِ عَنْ عَلِيٍّ وَعَلَيْكَ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاِنَّهُ الْحَبْلُ الْمَتِيْنُ وَالنُّوْرُ الْمُبِيْنُ وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ وَالْعِصْمَةُ لِلْمُتَمَسِّكِ وَالنَّجَاةُ لِلْمُتَعَلِّقِ لَا يَعْوَجُّ فَيُقَوَّمُ وَلَا يَزِيْغُ فَيُسْتَعْتَبُ وَلَا يَخْلُقُهٗ كَثْرَةُ الرَّدِّ وَوُلُوْجُ السَّمْعِ مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ سَبَقَ۔

تم میں سے نیک ترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے حضرت امیرؑ فرماتے ہیں۔ کتاب اللہ کو لازم پکڑو کیونکہ یہی مضبوط رسی وواضح روشنی و نفع بخش تندرستی اور تمسک پکڑنے والے کے لئے بچاؤ (کا ذریعہ) اور تعلق رکھنے والے کے لئے نجات (کا رستہ) ہے یہ کج نہیں کہ محتاج اصلاح ہو۔ اس میں ٹیڑھا پن نہیں کہ حرف گیری ہو سکے زیادہ پڑھنے سننے سے پرانا نہیں ہوتا۔ جس کا قول قرآن کے مطابق وہ سچا اور جس کا عمل قرآن کے مطابق وہ سابق ہے۔

وَايضًا فِيْهِ عن علیؑ۔ اَلْقُرْاٰنُ ظَاهِرُهٗ اَنِيْقٌ وَبَاطِنُهٗ عَمِيْقٌ لَا يَفْنٰى عَجَائِبُهٗ وَلَا يَنْقَضِيْ غَرَائِبُهٗ وَلَا يُكْشَفُ الظُّلُمَاتُ اِلَّا بِهٖ۔

نیز آپ نے فرمایا۔ قرآن کا ظاہر دلکش اور باطن دور رس ہے اور اس کے عجائب و غرائب غیر فانی اور بے حد و پایاں ہیں (جہالت کی) تاریکیاں صرف اسی سے دُور ہو سکتی ہیں۔

گویا علم قرآن ہی ایک ایسا علم ہے جس میں دنیا و آخرت کی خیر و برکت کے راز و رموز پنہاں ہیں۔ لہٰذا تمام علوم کے مقابلہ میں علم قرآن کا حاصل کرنا زیادہ اہم اور ضروری ہے اور اس علم کا ترک کرنا دنیوی و اخروی (ہر دو جہاں کی) برکات سے محرومی کا موجب ہے جو صرف شقاوت ہی کا نتیجہ ہے۔ خداوند کریم تمام مومنین کو توفیق عطا فرمائے کہ اپنے بچوں کو علوم قرآنیہ کی تعلیم دلوائیں۔ آمین

ترتیبِ علوم

شہید ثانی قدہ نے جو ترتیب بیان فرمائی ہے ہم اسی کا ترجمہ ذکر کرتے ہیں۔

متعلم کو سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کر لینا چاہیے اور علم تجوید کو بھی ضبط کر لینا چاہیئے۔ تاکہ قرآن مجید سے دل نورانی ہو کر باقی علوم کی تحصیل کا موجب ہو۔ پھر علوم عربیہ میں سے پہلے پہل علم صرف میں اچھی مہارت حاصل کر کے علم نحو میں پوری دسترس پیدا کرے۔ کیونکہ قرآن فہمی اور حدیث دانی میں اس کو بڑا دخل ہے پھر باقی علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد بقدر ضرورت منطق و علم کلام حاصل کرے اس کے بعد علم اصول فقہ پڑھے اور اس میں مہارت کاملہ حاصل کرلے۔ کیونکہ مباحثِ فقیہہ کی تحقیق اسی علم پر موقوف ہے پھر علم درایۃ الحدیث کا ضبط کرلے اور وہ آیات قرآنیہ جو احکام فرعیہ سے متعلق ہیں۔ ان کو تحقیقی بحث کے ساتھ پڑھے۔ ان سب کے بعد ان کتب فقیہہ کو پڑھے جن میں مسائل فرعیہ اور اصطلاحاتِ نقیہیہ درج ہوں۔ جن کے استدلالات تفصیلی طور پر مفصل فقہی کتب میں مذکور ہیں۔ ان تمام علوم میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد قرآن مجید کی تفسیر کی طرف اقدام کرے کیونکہ باقی تمام علوم اسی کا مقدمہ ہیں۔ اگر اس پر موفق ہو جائے تو صرف مفسرین کے نتائج افکار پر اکتفا نہ کرے۔ بلکہ اس کے معانی پر خود غور و فکر کرے اور اس کے رموز مخفیہ پر اطلاع حاصل کرنے کے لئے تصفیہ نفس کرے اور اللہ سے کمال عجز و انکساری سے دعا مانگے کہ اسے قرآن فہمی اور اس کے رموز و اسرار کا علم عطا ہو۔ پس قرآن کے حقائق میں سے اس کو ایسے مطالب تک دسترس نصیب ہوگی۔ کہ دوسرے مفسرین کی رسائی وہاں تک نہ ہوئی ہوگی۔ کیونکہ قرآن مجید وہ بحر بیکراں ہے جس کی تہہ موتیوں سے پُر ہے اور سطح خیر سے لبریز ہے اور لوگوں کی صلاحیتیں اس کے جواہر آبدار اور حقائق پر اسرار کے حاصل کرنے میں اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے مختلف ہیں کیونکہ یہ چیز ان کے ذہن رسا اور قوتِ مفکرہ ہی کا نتیجہ ہے اور عموماً تفاسیر میں مطالب کا اختلاف انہی ذہنی صلاحیتوں اور علمی استعدادات میں اختلافِ مراتب کی بدولت ہے۔

بعض تفاسیر میں علوم عربیہ پر زیادہ زور ہے۔ جیسے کشاف زمخشری اور بعض تفاسیر پر حکمت و فلسفہ کا رنگ غالب ہے۔ جیسے مفتاح الغیب بعض میں قصص کی بھرمار ہے۔ جیسے تفسیر ثعلبی اور بعض میں صرف تاویلِ حقائق ہے۔ اور ظاہری تفسیر سے پہلو تہی ہے۔ جیسے تفسیر کاشی وعلیٰ ہذا القیاس۔

ایک روایت مشہورہ میں ہے کہ قرآن کے لئے تفسیر بھی ہے اور تاویل بھی۔ اس میں حقائق بھی ہیں اور دقائق بھی۔ ظاہر بھی ہے۔ باطن بھی۔ اور اس کی حد بھی ہے اور مطلع بھی۔ اللہ اپنے فضل سے جسے چاہے عطا کرتا ہے۔ اور وہ صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔

فضائلِ قرآن

قرآن مجید کے فضائل کی حد معین کرنا انسان کی کوتاہ نظری اور نافہمی ہے کیونکہ اس مقدس کلام کو عام کلاموں سے وہی نسبت ہے جو خالق کو مخلوق سے ہے جب افکار انسانی خداوند عالم کے احسانات و نعمات میں سے ایک ادنیٰ نعمت کی جملہ خوبیوں کا احصا نہیں کر پاتے تو کلام مقدس (جو اعلیٰ و اشرف نعمات الٰہیہ ہے) کے جملہ حقائق و دقائق کا ادراک اس فہم قاصر سے کیسے ہو سکتا ہے؟ اس مقام پر بعض فضائل قرآن مجید معصومین علیہم السلام کی زبان معجز بیان سے نقل کرتا ہوں تاکہ علوم قرآنیہ کی عظمت زیادہ واضح ہو جائے۔

عن امیرالمومنین قال فی خطبته إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ هُوَ النَّاصِحُ الَّذِیْ لَا یَغُشُّ وَالْهَادِیْ الَّذِیْ لَا یُضِلُّ وَالْمُحَدِّثُ الَّذِیْ لَا یَکْذِبُ وَمَا جَالَسَ هٰذَا الْقُرْآنَ اَحَدٌ إِلَّا قَامَ مِنْهُ وَبِهٖ زِیَادَةٌ اَوْ نُقْصَانٌ زِیَادَةٌ فِیْ هُدًی اَوْ نُقْصَانٌ مِنْ عَمًی وَاعْلَمُوْا اِنَّهٗ لَیْسَ عَلٰی اَحَدٍ بَعْدَ الْقُرْاٰنِ مِنْ فَاقَةٍ وَلَا لِاَحَدٍ قَبْلَ الْقُرْاٰنِ مِنْ غِنًی فَاسْتَشْفُوْهُ مِنْ اَدْوَائِکُمْ وَاسْتَعِیْنُوْا بِهٖ عَلٰی لَاْوَائِکُمْ فَاِنَّ فِیْهِ شِفَاءً مِنْ اَکْبَرِ الدَّاءِ وَهُوَ الْکُفْرُ وَالنِّفَاقُ وَالْغَیُّ وَالضَّلَالُ فَاسْئَلُوا اللّٰهَ بِهٖ وَتَوَجَّهُوْا اِلَیْهِ بِحُبِّهٖ وَلَا تَسْئَلُوْا بِهٖ خَلْقَهٗ اِنَّهٗ مَا تَوَجَّهَ الْعِبَادُ بِمِثْلِهٖ وَاعْلَمُوْا اَنَّهٗ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ وَقَائِلٌ وَمُصَدَّقٌ وَاَنَّهٗ مَنْ شَفَعَ لَهُ الْقُرْاٰنُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شُفِّعَ فِیْهِ

نہج البلاغۃ خطبہ ۱۷۱

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ تحقیق یہ قرآن وہ خیرخواہ ہے جو کبھی دھوکا نہیں کرتا ایسا ہادی ہے جو کبھی راہ گم نہیں کرتا اور ایسا بیان کنندہ ہے جو جھوٹ نہیں کہتا جو قرآن سے ہم مجلس ہوا۔ وہ زیادتی یا کمی لے کر اٹھا یعنی ہدایت میں زیادتی اور گمراہی میں کمی اور یقین جانیئے کہ قرآن حاصل کر لینے کے بعد کوئی فقر نہیں اور قرآن حاصل کر لینے سے پہلے کوئی دولت مندی نہیں۔ اس سے اپنی بیماریوں کی شفا حاصل کرو اور دفع مصائب کے لئے اس سے مدد طلب کرو تحقیق یہ سخت ترین کفر نفاق غیّ اور ضلال کا واحد علاج ہے۔ اللہ سے اسی کے ذریعے دعا مانگو اور اسی کی محبت لے کر بڑھو اور اس کے ذریعے اس کی مخلوق سے گدا نہ کرو کیونکہ بندوں کی (خالق کی طرف) توجہ کے لئے اس جیسا اور کوئی ذریعہ نہیں یقین رکھو یہ وہ شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت مقبول ہے اور یہ وہ بولنے والا ہے جس کی بات تصدیق شدہ ہے بروز محشر جسکی قرآن نے شفاعت کر دی اس کی شفاعت مقبول ہوگی۔

قال فی خُطْبَتِهٖ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْهِ الْکِتَابَ نُوْرًا

جناب رسالتمآب کے فضائل بیان کرتے ہوئے آپ نے ارشاد

لَا تُطْفَأُ مَصَابِيحُهُ وَ سِرَاجًا لَا يَخْبُو تَوَقُّدُهُ وَ بَحْرًا لَا يُدْرَكُ قَعْرُهُ وَ مِنْهَاجًا لَا يَضِلُّ نَهْجُهُ وَ شُعَاعًا لَا يُظْلِمُ ضَوْءُهُ وَ فُرْقَانًا لَا يُخْمَدُ بُرْهَانُهُ وَ تِبْيَانًا لَا تُهْدَمُ أَرْكَانُهُ وَ شِفَاءً لَا تُخْشَى أَسْقَامُهُ وَ عِزًّا لَا تُهْزَمُ أَنْصَارُهُ وَ حَقًّا لَا تُخْذَلُ أَعْوَانُهُ فَهُوَ مَعْدِنُ الْإِيمَانِ وَ بُحْبُوحَتُهُ وَ يَنَابِيعُ الْعِلْمِ وَ بُحُورُهُ وَ رِيَاضُ الْعَدْلِ وَ غُدْرَانُهُ وَ أَثَافِيُّ الْإِسْلَامِ وَ بُنْيَانُهُ وَ أَوْدِيَةُ الْحَقِّ وَ غِيطَانُهُ وَ بَحْرٌ لَا يَنْزِفُهُ الْمُنْتَزِفُونَ وَ عُيُونٌ لَا يُنْضِبُهَا الْمَاتِحُونَ وَ مَنَاهِلُ لَا يَغِيضُهَا الْوَارِدُونَ وَ مَنَازِلُ لَا يَضِلُّ نَهْجَهَا الْمُسَافِرُونَ وَ أَعْلَامٌ لَا يَعْمَى عَنْهَا السَّائِرُونَ وَ آكَامٌ لَا يَجُوزُ عَنْهَا الْقَاصِدُونَ جَعَلَهُ اللَّهُ رِيًّا لِعَطَشِ الْعُلَمَاءِ وَ رَبِيعًا لِقُلُوبِ الْفُقَهَاءِ وَ مَحَاجَّ لِطُرُقِ الصُّلَحَاءِ وَ دَوَاءً لَيْسَ بَعْدَهُ دَاءٌ وَ نُورًا لَيْسَ مَعَهُ ظُلْمَةٌ وَ حَبْلًا وَثِيقًا عُرْوَتُهُ وَ مَعْقِلًا مَنِيعًا ذِرْوَتُهُ وَ عِزًّا لِمَنْ تَوَلَّاهُ وَ سِلْمًا لِمَنْ دَخَلَهُ وَ هُدًى لِمَنِ ائْتَمَّ بِهِ وَ عُذْرًا لِمَنِ انْتَحَلَهُ وَ بُرْهَانًا لِمَنْ تَكَلَّمَ بِهِ وَ شَاهِدًا لِمَنْ خَاصَمَ بِهِ وَ فَلْجًا لِمَنْ حَاجَّ بِهِ ۔

نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۸

فرمایا کہ پھر اللہ نے ان پر وہ کتاب اُتاری جو ایک نور ہے جس کی قندیلیں خاموش نہیں ہوتیں اور جس کے چراغوں کی روشنی مدھم نہیں ہوتی اور ایسا بحر ہے جس کی تہہ ناقابل رسا ہے اور ایسا رستہ ہے جس کے چلنے والا بھٹکتا نہیں۔ وہ ایسی شعاع ہے جس کی روشنی پر تاریکی کا غلبہ نہیں ہو سکتا ایسا فرقان ہے جس کی دلیل مغلوب نہیں ایسا بیان ہے جس کی طاقت کمزور نہیں ایسی شفا ہے جس کے بعد بیماری کا خطرہ نہیں۔ ایسا غلبہ ہے جس کے انصار ہارتے نہیں۔ ایسا حق ہے جس کے معاون چھوڑ نہیں جاتے وہ ایمان کا منبع وجگر علم کے چشمے اور سمندر عدل کے باغات، و آبشاریں، اسلام کی اساس و بنیادیں اور حق کی وادیاں اور قرار گاہیں ہیں ایسا بحر ہے جس کو استفادہ کرنے والے ختم نہیں کر سکتے ایسا چشمہ ہے جسے فائدہ پانیوالے خشک نہیں کر سکتے ایسا گھاٹ ہے جو پینے والوں سے کم نہیں ہوتا۔ ایسی منازل ہیں کہ مسافران کا رستہ بھولتے نہیں ایسے نشان ہیں جن کو رہگذر گم نہیں کرتا اور ایسی بلندیاں ہیں جن سے قصد کرنے والے تجاوز نہیں کر سکتے خدا نے اس کو علماء کی پیاس کی سیرابی فقہاء کے دلوں کی بہار اور نیکوں کے چلنے کا رستہ قرار دیا۔ وہ دوا ہے جس کے ساتھ بیماری نہیں رہتی وہ نور ہے جس کے ساتھ ظلمت نہیں رہتی یہ مضبوط جوڑ والی رسی اور محفوظ چار دیواری والا قلعہ ہے اور محب کے لئے عزت آنے والے کے لئے امن۔ مقتدی کے لئے ہدایت اور نسبت حاصل کرنے والے کے لئے عذر ہے اور جو اس کے ساتھ لڑے اس کے لئے برہان اور جو اس کے بل بوتے پر کسی سے مقابلہ کرے اس کے لئے شاہد اور جو اس کے ذریعہ سے مناظرہ کرے اس کے لئے باعث کامیابی ہے۔

عن ابی عبد اللہ یَنْبَغِی لِلْمُؤْمِنِ اَنْ لَّا یَمُوْتَ حَتّٰی یَتَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اَوْ اَنْ یَکُوْنَ فِیْ تَعْلِیْمِہٖ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ مومن کو چاہیے کہ اگر اس پر موت آئے تو وہ قرآن پڑھا ہوا ہو یا پڑھنے میں مشغول ہو۔

عن النبیؐ مُعَلِّمُ الْقُرْاٰنِ وَمُتَعَلِّمُہٗ یَسْتَغْفِرُ لَہٗ کُلُّ شَیْءٍ حَتَّی الْحُوْتُ فِی الْبَحْرِ

جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے اور پڑھانے والے ہر دو کے لئے ہر چیز حتیٰ کہ دریائی مچھلیاں بھی استغفار کرتی ہیں۔

عَنْہُ الْقُرْاٰنُ اَفْضَلُ کُلِّ شَیْءٍ دُوْنَ اللّٰہِ فَمَنْ وَقَّرَ الْقُرْاٰنَ فَقَدْ وَقَّرَ اللّٰہَ وَمَنِ اسْتَخَفَّ بِالْقُرْاٰنِ فَقَدِ اسْتَخَفَّ بِحُرْمَۃِ اللّٰہِ

نیز آپ نے فرمایا کہ قرآن اللہ کے بعد ہر شے سے افضل ہے جس نے قرآن کی عزت کی گویا اس نے اللہ کی عزت کی اور جس نے قرآن کی عزت نہ کی گویا اس نے اللہ کی توہین کی۔

یَضِیْئُ نُوْرُہٗ مِنْ مَسِیْرَۃِ عَشْرَۃِ اٰلَافِ سَنَۃٍ وَیُکْسَیَانِ حُلَّۃً لَا یَقُوْمُ لِاَقَلِّ سِلْکٍ مِنْھَا مِأَۃُ اَلْفِ ضِعْفٍ مَا فِی الدُّنْیَا بِمَا یَشْتَمِلُ عَلَیْھَا مِنْ خَیْرَاتِھَا د الی ان قال فاذا نَظَرَ وَالِدَاہُ اِلٰی حُلَّتِیْھِمَا وَتَاجَیْھِمَا قَالَا رَبَّنَا اَنّٰی لَنَا ھٰذَا الشَّرَفُ وَلَمْ تَبْلُغْہُ اَعْمَالُنَا فَیَقُوْلُ لَھُمَا کِرَامُ مَلَائِکَۃِ اللّٰہِ عَنِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ ھٰذَا لَکُمَا بِتَعْلِیْمِکُمَا وَلَدَکُمَا الْقُرْاٰنَ۔

نیز آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والے کے والدین کو تاج کرامت عطا ہوگا۔ جس کا نور دس ہزار سال کی راہ سے ظاہر ہوگا اور ان کو ایسے حلہ ہائے بہشت عطا ہوں گے کہ تمام دنیا اور اس کی جملہ خوبیوں کا لاکھ گنا اس کی ادنیٰ تار کے برابر نہ ہو سکے گا۔

یہاں تک کہ آپ نے فرمایا جب اس کے والدین یہ حلے اور تاج دیکھیں گے تو عرض کریں گے اے اللہ ہمیں یہ شرف کیسے ملا حالانکہ ہمارے اپنے اعمال تو اس قابل نہ تھے تو خداوند کریم کی طرف سے فرشتے جواب دیں گے کہ یہ شرف تم کو اس لئے ملا ہے کہ تم نے اپنے بچے کو قرآن مجید پڑھایا تھا۔

عَنْہُ الْقُرْاٰنُ غِنًی لَا غِنٰی دُوْنَہٗ وَلَا فَقْرَ بَعْدَہٗ

نیز فرمایا کہ قرآن کے بغیر کوئی دولتمندی نہیں اور قرآن کے ساتھ کوئی فقر نہیں

عَنْہُ اَفْضَلُ الْعِبَادَۃِ قِرَاءَۃُ الْقُرْاٰنِ

قرآن کا پڑھنا بہترین عبادت ہے۔

عَنْہُ اَشْرَافُ اُمَّتِیْ حَمَلَۃُ الْقُرْاٰنِ وَاَصْحَابُ اللَّیْلِ۔

فرمایا میری امت کے شرفاء قرآن خوان اور شب خیز لوگ ہیں۔

آپ نے فرمایا جو شخص اپنے لڑکے کو قرآن کی تعلیم دلوائے تو اس کے والدین کو تاج اور حلہ ہائے بیش بہا عطا ہوں گے۔ نیز فرمایا کہ معلم بچے کو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھاتا ہے تو بچے اور اس کے والدین اور استاد کے لئے خدا آتش جہنم سے آزادی فرض کر دیتا ہے۔

نیز جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے کو قرآن پڑھائے تو گویا اس نے دس ہزار حج اور دس ہزار

عمرے ادا کئے اور اولادِ حضرت اسماعیلؑ سے دس ہزار غلام آزاد کئے اور دس ہزار جہاد کئے اور دس ہزار بھوکے مسکینوں کو کھانا کھلایا اور گویا اس نے دس ہزار برہنہ مسلمانوں کو لباس دیا اور ہر ہر حرف کے بدلہ میں اس کے نامۂ اعمال میں دس دس نیکیاں درج ہوں گی اور دس دس گناہ معاف ہوں گے۔ قبر سے حشر تک قرآن اس کے ہمراہ ہوگا اور اس کو پل صراط سے مثل بجلی کے پار کرے گا اور قرآن اس سے جُدا نہ ہوگا جب تک کہ اس کو منازلِ کرامت میں ایسی منزل پر نہ لے جائے جسے وہ چاہتا ہوگا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ حاملین قرآن اللہ کی رحمت سے مخصوص اللہ کے نور سے ملبوس۔ اللہ کے کلام کے معلم اور اللہ کے مقرب ہیں۔ ان کا دوست اللہ کا دوست اور ان کا دشمن اللہ کا دشمن ہے۔ خداوند کریم قرآن سننے والے سے دنیا کی بلائیں اور پڑھنے والے سے آخرت کی بلائیں دُور کرتا ہے (یہاں تک کہ فرمایا) جس نے سچے دل سے قرآن کی ایک آیت سُن لی مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ سونے کا پہاڑ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے اس کا ثواب زیادہ ہے اور جس نے خلوصِ اعتقاد سے ایک آیت قرآن کی تلاوت کی اس کے ثواب کی عظمت کے مقابلہ میں زمین سے لے کر عرش علا تک کی بلندیاں ہیچ ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا کہ خدا اس دل کو عذاب نہ کرے گا جو قرآن کا مسکن ہے۔

یہ چودہ حدیثیں (بعض اصل عبارت کے ساتھ و بعض کا صرف ترجمہ) ذکر کر دی گئی ہیں۔ انہی کو پڑھ لینے سے قرآن مجید کے پڑھنے اور پڑھانے کی عظمت معلوم ہو جائے گی۔ احادیث نبویہ مجمع البیان وسائل اور مستدرک سے نقل کی گئی ہیں۔ خداوند کریم تمام مومنین کو اس خیر کثیر میں حصہ لینے کی توفیق اور جرأت عطا فرمائے۔ تاکہ بچوں کو قرآنی علوم سے آراستہ کر سکیں۔ (آمین)

اوصاف حاملین قرآن

حضرت امیر المومنین علیہ السلام متقین کی اوصاف کو بیان فرماتے ہوئے حاملین قرآن کے لئے یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ رات کے وقت ان کے قدم (مقام عبادت) میں صف بستہ رہتے ہیں۔ ترتیل کے ساتھ قرآن کے پاروں کی تلاوت کرتے ہیں۔ اپنے نفوس کو قرآن کے ذریعہ سے خوف زدہ کرتے ہیں۔ گناہوں کو یاد کرکے اپنے غموں کو تازہ کرتے اور روتے ہیں۔ جب کسی خوف کی آیت سے گذریں تو ان کے دلوں کی آنکھیں اور کان اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ان کے جسموں پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جگر ان کے کانپتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کی آواز اور اس کے شعلوں

کی بھڑک اور گرمی ان کے کانوں تک پہنچ رہی ہے اور جب کسی ایسی آیت سے گذریں جس میں شوقِ جنت ہو تو از روئے طمع اس طرف جھکتے ہیں اور ان کے نفوس اس کے منتظر ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کا نصب العین ہے

جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ ظاہر و باطن میں خشوع کا زیادہ سزاوار حاملِ قرآن ہے۔ اے حاملِ قرآن! عاجزی کر خدا تجھے بلند کرے گا تکبر نہ کر ورنہ خدا تجھے ذلیل کرے گا۔ اے حاملِ قرآن! اللہ کے لئے ہی قرآن کو اپنی زینت بنا۔ خدا تجھے زینت دے گا لوگوں کے لئے قرآن کو اپنی زینت نہ بنا ورنہ خدا تجھے رسوا و خراب کر دے گا۔ (یاد رکھو) جو شخص پورے قرآن کو ختم کرے گویا اس کے پہلو میں نبوت آگئی جس کے پہلو میں قرآن ہو وہ جاہلوں کے ساتھ جہالت کا سا سلوک نہیں کرتا بلکہ وہ توعفو۔ درگذر۔ چشم پوشی اور علم کو پیش پیش رکھتا ہے۔ کیونکہ قرآن کی عظمت اس کے اندر ہے جس کو قرآن عطا ہو اور پھر کسی دوسرے کی نعمات کو اہمیت دے۔ گویا اس نے اللہ کے عظیم کو حقیر اور اللہ کے حقیر کو عظیم سمجھا۔

حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا کہ اس امت کا قاریٔ قرآن اگر جہنم میں داخل ہو تو سمجھ لو کہ وہ آیاتِ قرآنیہ سے مسخری کیا کرتا تھا۔ حفص سے روایت ہے کہ مقامِ رجا اور خوف میں میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے زیادہ کسی کو نہیں پایا۔ جب وہ تلاوتِ قرآن کرتے تھے تو ایسا روتے تھے جیسے کسی کے روبرو باتیں کر رہے ہوں۔

جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ اللہ کی عظمت و جلال سے ہے کہ تین قسموں کے لوگ اس کی بارگاہ میں نہایت مکرم ہیں۔ ۱۔ مسلم سفید ریش ۲۔ امام عادل ۳۔ حاملِ قرآن جو معانی قرآن میں ردّ و بدل نہ کرے اور اس سے تجاوز بھی نہ کرے۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ يُوضَعُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَنَابِرُ مِنْ نُورٍ وَعِنْدَ كُلِّ مِنْبَرٍ نَجِيبٌ مِنْ نُجُبِ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُنَادِي مُنَادٍ مِنْ قِبَلِ رَبِّ الْعِزَّةِ أَيْنَ حَمَلَةُ كِتَابِ اللّٰهِ؟ اِجْلِسُوا عَلٰى هٰذِهِ الْمَنَابِرِ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُونَ حَتّٰى يَفْرَغَ اللّٰهُ مِنْ حِسَابِ الْخَلَائِقِ ثُمَّ ارْكَبُوا عَلٰى هٰذِهِ النُّجُبِ وَاذْهَبُوا اِلَى الْجَنَّةِ

جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ قیامت کے روز نور کے منبر نصب کئے جائیں گے اور ہر منبر کے پاس ایک نور کی سواری ہوگی۔ پھر اللہ کی طرف سے منادی ندا کرے گا۔ کہاں ہیں کتاب اللہ کے حامل۔ (کہا جائے گا) کہ جب تک خدا خلائق کے حساب سے فارغ نہ ہو تم بلاخوف و حزن ان منبروں پر بیٹھو اس کے بعد انہی سواریوں پہ سوار ہو کر جنت کی طرف چلے جاؤ۔

سُبْحَانَ اللّٰه! اللہ کے نزدیک حاملینِ قرآن کی کیا قدر و منزلت ہے؟

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاحْشُرْنَا فِي زُمْرَتِهِمْ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ عَلَيْهِمُ السَّلَام

آدابِ قاری (عالم و متعلم قرآن)

قرآن پڑھنے اور پڑھانے کے متعلق جو کچھ کتب احادیث میں موجود ہے اگر یکجا کیا جائے تو شاید ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے اس جگہ جو کچھ میں ذکر کر چکا ہوں وہ حضرات اہلبیتؑ کے جملہ اقوال کے مقابلہ میں قطرہ از دریا یا ذرہ از ریگ صحراء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والا باطنی طور پر ذاتِ اقدس الہٰی سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ لہذا یہ خیال کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ جس ذات سے وہ ہم کلام ہے۔ اس کے مناسب آداب بھی ملحوظ رکھے کیونکہ قرآن کا پڑھنا صرف تلفظ لسانی کا نام نہیں بلکہ ساتھ ساتھ تعلق روحانی کے وابستہ رہنے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ یہود کی مثال صادق نہ آئے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا — جن لوگوں کو تورات دی گئی پھر وہ لوگ اس کے حامل نہ بنے (عامل نہ بنے)

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا — ان کا تورات اٹھانا مثل کتابوں سے بار شدہ گدھے کے ہے۔

خدا علم ایسی نعمت کو ذلیل نہیں کرتا۔ لوگ رزق کی تلاش کرتے ہیں اور رزق عالم کو تلاش کرتا ہے ہاں عالم کو بھی چاہیئے کہ خدا کے بھیجے ہوئے رزق پر صبر و قناعت کرے۔

وہ بدترین علماء ہیں جو رزق کی خاطر رؤسا کے دروازوں کا چکر لگا کر نعمتِ علم کی توہین کریں اور نیک ترین امراء ہیں وہ جو دین کی خاطر علماء کے دروازوں کا طواف کر کے وقار علم کو دوبالا کریں۔ روایت میں ہے ایک زمانہ ہوگا کہ علماء کی زبان پر قرآن ہوگا لیکن حنجرہ سے نیچے نہیں اترے گا

ایک اور روایت میں ہے کہ بعض قاریٔ قرآن ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں قرآن لعنت کرتا ہے۔

لہذا علمِ قرآن حاصل کرنے کے لئے نیت قربت ہو اور رضائے خالق مطلوب ہو مخلوق کی دادِ تحسین مطمحِ نظر نہ ہو۔ ریاکاری دکھاوا نہ ہو اور مال و دولت کمانا بھی مطلوب نہ ہو۔

شہید ثانی نے منیۃ المرید میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام سے ایک شخص نے علم سیکھا اور کچھ مدت حضرت موسٰیؑ کی صحبت میں رہنے کے بعد اجازت چاہی تو حضرت موسٰیؑ نے اس کو دنیاداروں کے دروازوں پر جا کر نعمت علم کی توہین سے باز رہنے نصیحت فرمائی۔ اس شخص نے ظاہراً حضرت موسٰیؑ کی نصیحت کو قبول کر کے اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا تو آپ نے اس کو رخصت دے دی لیکن بہت جلد واپس آنے کی فرمائش بھی کی۔ وُہ چلا گیا اور واپس نہ آیا جب کافی دن گذر گئے تو حضرت جبریل امین سے اس کے متعلق دریافت کیا تو جبریل نے بتلایا کہ وہ بصورت بندر مسخ ہو کر دربدر پھر رہا ہے۔ آپ نے بارگاہِ قاضی الحاجات میں اس کی اس مصیبت کے دفع

ہو جانے کی دُعا مانگی اور اس کے گناہوں کی بخشش کے لئے عرض کی تو ذاتِ احدیت کی طرف سے خطاب ہوا اے موسیٰ : میں نے علم جیسی گراں بہا نعمت اس کو مرحمت کی تھی لیکن اس نے جہلاء کے دروازوں کا طواف کر کے میری نعمت کی بے قدری کی ہے (لہٰذا اب وہ اسی سزا کا مستوجب و حقدار ہے اب اس کی کوئی سفارش نہ کرو) نیز قاری قرآن کو چاہیئے کہ قرآن صرف دوسروں کے سنانے کے لئے نہ پڑھے بلکہ اپنے کانوں کو سنا کر دل کو اس کی طرف متوجہ کرے ۔ بہرکیف علماء و متعلمین کو اس قسم کے واقعات سے درسِ عبرت حاصل کرنا چاہیئے ۔ عالم بے عمل مثلِ شجرِ بے ثمر کے ہے اور جو شخص لوگوں کو نصیحت کرے اور خود نصیحت پذیر نہ ہو وہ قرآن کی ان آیات کا مصداق ہے ۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ۔ ترجمہ :کیا لوگوں کو نیکی کا امر دیتے ہو اور خود اپنے نفسوں کو بھلا دیتے ہو؟

قیامت کے دن بہت حسرت اس عالم کے لئے ہوگی جس کی نصیحت سے دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور جنت میں چلے گئے اور وہ خود اپنی بداعمالیوں کی بدولت جہنم کا مستحق ہوا ۔

اور جب تک کوئی عالم اپنے وعظ سے خود متاثر نہ ہو اس کے وعظ سے دوسرا کوئی نصیحت ہی قبول نہیں کرتا (جو بات کہ دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے)

اور یہ بھی یقینی امر ہے کہ جب تک انسان امراضِ باطنیہ روحانیہ سے نجات حاصل نہ کرلے فیوض و برکات علمیہ قرآنیہ اس کے دل و دماغ پر قطعاً باعثِ نورانیت نہیں ہو سکتے اور نہ وہ لذاتِ قرآنیہ سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے ۔

نیز وارد ہے کہ عالم کی دنیا میں ادنیٰ سزا یہ ہے کہ وہ لذتِ عبادت سے محروم کر دیا جاتا ہے ۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ یذکر فتنفعه الذکری

عملِ تسخیر اور قرآن

عملیات کے دلدادہ افراد آیاتِ قرآنیہ کو تسخیرات کا آلہ قرار دے کر اس کو مشغلہ عملیہ قرار دیتے ہیں ۔ جنات ملائکہ اور ارواح کی تسخیر کے لئے عجیب و غریب طرزِ عمل ان لوگوں نے ایجاد کئے ہوئے ہیں ۔ بعض عمل قبرستان میں بعض جنگل میں بعض تاریک مکان میں و علیٰ ہذا القیاس پابندیٔ وقت و مقام و لباس و طعام وغیرہ کے ساتھ بجالائے جاتے ہیں اور شاذ و نادر بعض افراد سے یہ عمل پایۂ تکمیل کو بھی پہنچ جاتا ہے اس تسخیر کے عمل کرنے والوں کے اغراض و مقاصد

جُدا جُدا ہوا کرتے ہیں۔

بعض لوگ مال و دولت جمع کرنے کے لئے یہ عمل کرتے ہیں۔

بعض تسخیرات کی مدد سے اپنا ولی ہونا ظاہر کر کے اپنی پیری کی دکان کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

بعض لوگوں کا مطمحِ نظر صرف عزّ و جاہ و وقار ظاہری ہوتا ہے۔

بعض لوگ دشمن کو گزند پہنچانے یا اُسے زیر کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

بعض مادہ شہویہ سے مغلوب ہو کر اس مشغلہ کو خواہشاتِ جنسیہ کی تکمیل کا آلہ کار بناتے ہیں۔ اور بعض لوگ صرف شوقیہ بھی کرتے ہیں۔

بہر کیف اغراض جو بھی ہوں، عموماً تسخیر میں آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت کو دخلِ عظیم حاصل ہے۔ ان کے بغیر غالباً کوئی عمل کامل نہیں ہوتا۔ خواہ تسخیر جن ہو یا ملائکہ و ارواح و ہمزاد کی تسخیر ہو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ عملیات بے اثر نہیں ہوا کرتے۔ بعض لوگوں کی ناکامی بعض قیود کی پابندی چھوڑ دینے سے عموماً ہوتی ہے نیز اس قسم کے عملیات میں دل کی طاقت کو بڑا دخل ہے۔ کیونکہ تمام شب قبرستان یا جنگل میں یا تاریک مکان میں تنہا وقت گذارنا صبر و حوصلہ کے علاوہ بڑے قلب و جگر کا کام ہے اور اگر دورانِ عمل میں ذرا سا خوف و ہراس پیدا ہُوا تو عمل ضائع اور نتیجہ برعکس ہو جاتا ہے۔

قرآن میں طاقت ہے کہ اس کے ذریعہ سے پہاڑ ہل جائیں، مردے بول اُٹھیں، زمین کے سفر طے ہو جائیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اگر مُردہ پر ستر مرتبہ سورۂ فاتحہ دم کی جائے تو عجب نہیں کہ اس میں رُوح واپس آجائے۔ نیز اکثر آیاتِ قرآنیہ کا دم کرنا یا بطور تعویذ پاس رکھنا اکثر امراض سے موجب شفا ہوتا ہے۔ تو عملیات کی محنت شاقہ و کد و کاوش یعنی چالیس روز یا کم و بیش ایام مقررہ تک ایک ہی مقام پر ایک ہی آیت کا لاکھوں مرتبہ روزمرہ ورد کرنا اگر تسخیر کے نتیجہ پر پہنچ جائے تو اس میں کیا تعجب ہے؟ لیکن کیا ہمارے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہ؟ قرآن کے نزول اور ہماری پیدائش کا مقصد یہی ہے؟

اس سلسلہ میں قرآن مجید کی فرمائشات جو تمام انسانوں سے متعلق ہیں پر غور فرمائیے۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ — اے لوگو! اس اللہ کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ — لوگو! اللہ سے ڈرو۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ — میں نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ — ہر نفس اپنے کئے ہوئے کے ساتھ مرہون ہے۔

مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ — جو ذرہ بھر نیکی کرے گا وہ اس کی جزا پائے گا۔ اور جو ذرہ برابر

يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَه ۔ برائی کرے گا اس کی سزا پائے گا۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں۔ جن کا مقصد انسان کو خالق سے تعلقاتِ عبدیت قائم رکھنے کا حکم ہے گروہ جنات ان احکام میں ہمارے ساتھ شریک ہے (ویسے تکوینی طور پر تو تمام مخلوق ارضی وسماوی فرشی وعرشی اور بحری وبری مصروفِ عبادت ہیں۔

انسان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ صرف جذبۂ نفسانی وشہوانی کے پیشِ نظر آیاتِ قرآنیہ سے تسخیرِ خلائق کرتا پھرے اور نہ قرآن اس لئے اترا ہے کہ اس سے تسخیرِ خلائق کرتے رہو۔ بلکہ وہ خلق کے لئے ہدایت ہے اور اس کے لانے والا رسولِ عالمین کے لئے رحمت اور تمام جن وانس کے لئے بشیر ونذیر ہے۔

انسان کا آخری کمال یہ ہے کہ اپنے قوائے نفسیہ شہویہ اور غضبیہ وغیرہ کو قوتِ عاقلہ کی مدد سے قرآن مجید کی روشنی میں اللہ کے لئے مسخر کر دے اور قرآن پاک خود بھی تمام انسانوں کو خالق کے لئے مسخر ہونے کی دعوت دیتا ہے بس انسان کا انسانی فریضہ یہی ہے کہ اللہ کے لئے اپنے نفس کو تسخیر کرے اور اپنی تمام نفسانی قوتوں کو اس کے اوامر ونواہی کا پابند رکھے اور یہ امر یقینی ہے کہ اگر انسان اپنے نفس کو اللہ کے لئے مسخر کرنے پر کامیاب ہوجائے۔ تو یہی انسان روحانی ارتقائی منازل طے کر کے بلند مرتبہ پر فائز ہوسکتا ہے کہ باقی مخلوق خود بخود اس کی مطیع وزیر فرمان ہو جائے گی۔ اس کے تصرفات عامہ مخلوقات میں نافذ اور اس کا ارادہ حاوی اور اس کا وقار مسلم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حدیثِ قدسی جو زبان زد خواص وعوام ہے کا مطلب یہی ہے۔

عَبْدِیْ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْکَ مِثْلِیْ میرا بندہ میری اطاعت کر۔ تاکہ تجھے اپنے جیسا بنا دوں۔

کُنْ لِیْ اَکُنْ لَکَ تو میرا ہو جا میں تیرا ہو جاؤں۔

یاد رہے کہ خدا جیسا کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ خود فرماتا ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ

پس فرمانِ ایزدی کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان پورے طور پر خدا کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے تو خدا اپنی مخلوق کی توجہ اس کی طرف پھیر دیتا ہے گویا جب وہ خدا کا ہوجاتا ہے تو خدائی اس کی ہوجاتی ہے اگر یہ اللہ کا فرمانبردار ہوجائے تو مخلوقات اس کی فرمانبردار ہوجاتی ہے۔ یعنی جو اللہ کا پورے طور پر فرمانبردار ہو۔ وہ کائنات کا پورے طور پر فرمانروا ہوتا ہے۔ وہ کائنات میں جو چاہے کرسکتا ہے۔

بحار الانوار دہم باب معجزات۔ امام حسن علیہ السلام میں ہے۔ ایک مرتبہ امام حسنؑ نے ایک مقام پر فرمایا۔ اگر میں خدا سے دعا کروں تو وہ شام کو عراق کر دے اور عراق کو شام بنا دے۔ مرد کو عورت اور عورت کو مرد بنا دے یہ کہنا تھا کہ ایک منافق دشمنِ خدا کے سینے میں آتشِ حسد بھڑک اٹھی۔ گستاخانہ لہجہ میں آپ پر طعنہ زن ہو کر کہنے لگا۔ یہ کس کی طاقت ہے۔ (اگر اتنی طاقت ہوتی تو معاویہ سے صلح کیوں کی جاتی؟ آپ نے بخاموشی اس کے بکواس سنے۔ جب

وہ خاموش ہوا آپ نے فرمایا ۔ اے عورت تو ان نامحرموں کے مجمع سے نکل جا ۔ خدا نے تجھے عورت کر دیا ہے اور تیری عورت کو اب مرد بنا دیا ہے ۔ تو گھر پہنچ کر اس سے ہمبستر ہوگی اور تیرے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو خنثیٰ ہوگا امام کا کلام سُن کر وہ شخص اپنے جسم کی طرف متوجہ ہوا ۔ تو اپنے آپ کو عورت پایا اور گھر آیا تو اپنی سابقہ بیوی کو مرد پایا اور بمطابق فرمانِ امامؑ مقاربت کے بعد اس کے پیٹ سے خنثیٰ پیدا ہوا ۔ اس کے بعد وُہ دونوں میاں بیوی تائب ہوئے اور خدمتِ امام علیہ السلام میں حاضر ہو کر معافی کے خواستگار ہوئے پس امام عالی مقام نے معافی دی اور خدا نے اُن کی توبہ قبول فرمائی ۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اس کے بعد وہ دونوں اپنی اصلی حالت پر آ گئے اور ایک وقت تک زندہ رہے ۔ یہ ایک واقعہ تبرکاً پیش کر دیا ہے ۔ ورنہ جناب رسالتمآبؐ سے لے کر حضرت حجتؑ تک ہر معصوم کی زندگی میں اس قسم کے تصرفات عام موجود ہیں ۔ جنہیں معجزات و کرامات سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اہلبیت عصمت تو بجائے خود ان کے در کے غلام اور کنیزیں بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں ۔ تفصیل کے لئے کتبِ سیر کا مطالعہ فرمائیں ۔ اگر میں واقعات کو جمع کرنے لگ جاؤں ۔ تو کتاب موضوع سے خارج ہو جائے گی ۔ میرا مقصد عرض کرنے کا یہ تھا کہ اگر انسان اپنے خالق کے لئے اپنے نفس کی تسخیر کرے تو کائنات کی تسخیر اس کے لئے خود بخود ہو جائے گی ۔ قرآنی آیات کو باقی مخلوق جن و ملائکہ وغیرہ کی تسخیر کے لئے استعمال کرنا غلط ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر غلط ہے تو خدا نے قرآنی آیات میں یہ اثر کیوں رکھ دیا ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو خیر و شر کی دونوں طاقتیں مرحمت فرما کر اس کا امتحان لیا ہے ۔ اگر صرف اطاعت یا صرف معصیت کا جذبہ ہوتا یعنی دونوں میں سے ایک چیز کی طاقت دیتا تو پھر جزا و سزا کا قصہ لغو ہو جاتا اسی طریقہ پر تمام موجودات کو نفع و نقصان کا حامل بنایا ۔ تاکہ انسان اپنے اختیار سے عقل کی روشنی میں شریعت کی ہدایات کے ماتحت منافع حاصل کرے اور مفاسد سے گریز کرے ۔ پس ان جسمانی قوتوں کو جو اللہ نے بطور نعمت عطا کی ہیں ۔ اگر انسان غلط استعمال کرے یا بالکل معطل چھوڑ دے تو یہ انسان کی اپنی غلطی ہے اسی طرح نعماتِ الٰہیہ جو موجوداتِ عالم میں ہیں ۔ اگر انسان ان سے ناجائز فائدہ اٹھائے تو اس کی نا اندیشی یا بد باطنی ہے ۔ اس میں نعماتِ الٰہیہ کا کوئی قصور نہیں ۔ اسی طرح قرآن مجید نعماتِ الٰہیہ میں سے بزرگ ترین نعمت ہے ۔ اگر انسان چاہے تو اس کی ہدایت پر عمل کر کے اخروی فوائد حاصل کرے اور چاہے تو اس کو کسب مال و دولت کا ذریعہ بنائے اور اگر چاہے تو جھوٹی سچی قسموں کے لئے استعمال کرے اور اگر چاہے تو تسخیرات پر استعمال کر کے اغراض دنیاویہ مطالب شہویہ اور وقار و عزت ظاہریہ کا اس کو وسیلہ قرار دے ۔ انسان اپنے ان افعال میں خود مختار ہے ۔

لوہے سے نفع بھی حاصل ہو سکتا ہے اور نقصان بھی ۔ اگر لوہے کے کسی تیز دھار آلہ سے کسی نفسِ محترمہ کو قتل کر دے تو یہ عذر غیر معقول ہے کہ کہے ۔ اگر قتل گناہ ہوتا ۔ تو خدا لوہا کیوں پیدا کرتا ؟ یا انسان کو اس قسم کے مہلک آلات

کے بنانے یا استعمال کرنے کی طاقت کیوں دیتا؟ اسی طرح چور یہ عذر کرے کہ اگر چوری گناہ ہوتی۔ تو مجھے خدا ہاتھ نہ دیتا۔ یا مدعی کو اپنے مال سے غافل نہ کرتا۔ زانی یہ کہہ دے کہ اگر زنا ناجائز ہوتا تو مجھے قوتِ شہویہ یا قوتِ فعلِ زنا نہ دی جاتی۔ یا عورت کو اس کے قابل نہ بنایا ہوتا۔ علیٰ ھٰذا القیاس۔ ہر فعل بد کرنے والا اسی قسم کے عذر پیش کر سکتا ہے تو پھر اس قسم کے عذر درست مان لئے جائیں تو جملہ عقلا کے وضع کردہ اصول برائے نظامِ مملکت یا خالق کی طرف سے عائد شدہ احکام شریعت سب لغویت کی نذر ہو جائیں گے اور دریں صورت بنی نوعِ انسان کی تمدنی زندگی شکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی

پس اگر عاملِ تسخیرات یہ عذر پیش کرے کہ اگر غلط و ناجائز ہوتا۔ تو آیاتِ قرآنیہ اس امر کا فائدہ نہ دے سکتیں محض لغو اور بے جا ہے اور مقولہ (عذر گناہ بدتر از گناہ) کا مصداق ہے۔

ہمارے علمائے اعلام قدس اللہ اسرارہم نے عمل تسخیر کو جادو کی اقسام سے قرار دیا ہے اور اس کی حرمت کا قطعی فیصلہ فرمایا ہے۔ بعض اکابر علماء نے اس کی حرمت کو ضروریاتِ دین سے شمار کیا ہے اور اس حکم کے منکر کو خارج از اسلام قرار دیکر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ چنانچہ حجۃ الاسلام الاستاد العلام شیخ محمد باقر زنجانی نجفی مدظلہ نے درس خارج میں مکاسب محرمہ کی ابحاثِ تحقیقیہ کے بیان کے دوران میں اس مسئلہ کے متعلق یوں ارشاد فرمایا تھا کہ **اولاً** تو یہ یعنی تسخیر جنات و ملائکہ وارواح وغیرہ سحر کے عنوان میں داخل ہیں۔ لہٰذا جن دلیلوں سے سحر (جادو) باطل ہے۔ انہی دلائل سے تسخیر بھی باطل ہے۔ **ثانیاً** تمام علمائے شیعہ امامیہ کا اس چیز (تسخیر) کی حرمت پر اتفاق ثابت ہے۔ **ثالثاً** فخر المحققین اور شہیدین رحمہم اللہ کی تصریحات موجود ہیں کہ اس کی حرمت ضروریاتِ مذہب سے ہے۔ یہاں تک کہ اس کو جائز کہنے والا کافر ہے۔ لہٰذا بالفرض اگر اجماع ثابت نہ بھی ہو تو ان بزرگواروں کا فرمان اس امر کی واضح دلیل ہے کہ تسخیر کی حرمت میں علمائے شیعہ کو کوئی اختلاف نہیں۔ انتہیٰ ما افاد۔

۲۔ عن الدروس للشہید الاول قال وَمِنَ السِّحْرِ الْاِسْتِخْدَامُ لِلْمَلٰئِکَۃِ وَالْجِنِّ (الی ان قال) نَعْمَلُ ھٰذَا کُلِّہٖ حَرَامٌ وَالتَّکَسُّبُ بِہٖ حَرَامٌ ثُمَّ قَالَ وَیُقْتَلُ مُسْتَحِلُّہٗ

شہید اول نے دروس میں فرمایا ہے کہ جادو کی اقسام سے ملائکہ و جنات کا تابع کرنا بھی ہے (یہاں تک کہ فرمایا) پس یہ سب حرام ہے۔ ان کے ساتھ کمانا بھی حرام ہے۔ پھر فرمایا اس کو جائز جاننے والا واجب القتل ہے۔

۳۔ عن ایضاح فخر المحققین فی عداد اقسام السحر ما لفظہ اَوْعَلٰی سَبِیْلِ الْاِسْتِعَانَۃِ بِالْاَرْوَاحِ السَّاذِجَۃِ (الی ان قال) وَالْکُلُّ حَرَامٌ فِیْ شَرِیْعَۃِ الْاِسْلَامِ وَمُسْتَحِلُّہٗ کَافِرٌ

فخر المحققین نے سحر کی قسموں میں شمار کیا ہے ارواح سے مدد حاصل کرنا (یہاں تک کہ فرمایا) یہ سب شریعت میں حرام اور اس کا حلال کہنے والا کافر ہے۔

۴۔ قال فی ہدایۃ الطالب یعنی بہا الارواح

ہدایت الطالب میں ہے کہ ارواح ساذجہ سے مراد ارواح مجردہ

الْمُجَرَّدَةَ عَنِ العناصِرِ كَالْمَلَكِ وَالجِنِّ وَالشَّيَاطِيْنِ

ہیں۔ جیسے فرشتے۔ جن اور شیاطین۔

فی شرح اللمعۃ للشہید الثانی رح فی عداد اقسام السِّحْرِ۔ وَاسْتِخْدَامُ الْجِنِّ وَ الْمَلَائِكَةِ وَ اسْتِنْزَالُ الشَّيَاطِيْنِ فِي كَشْفِ الْغَائِبَاتِ الی ان قال۔ فَتَعَلُّمُ ذٰلِكَ كُلِّهٖ وَتَعْلِيْمُهٗ حَرَامٌ وَالتَّكَسُّبُ بِهٖ سُحْتٌ وَيُقْتَلُ مُسْتَحِلُّهٗ

شرح لمعہ میں شہید ثانیؒ جادو کے اقسام میں فرماتے ہیں کہ اور تسخیر کرنا جن و ملائکہ کا اور حاضر کرنا شیاطین کا غائب باتوں کے معلوم کرنے کے لئے (درمیان تک کہ فرمایا) پس ان سب باتوں کا سیکھنا سکھانا حرام ہے اور اس کے ذریعہ روزی کمانا بھی حرام ہے اور جو شخص اس کو حلال جانے وہ واجب القتل ہے۔

ان علماء متقدمین قدس اسرارہم کی تصریحات سے صاف معلوم ہوا کہ تسخیر جنات و ملائکہ وارواح و ہمزاد وغیرہ سب سحر (جادو) کی قسمیں ہیں ان کا سیکھنا اور سکھانا سب حرام ہے۔ اس کو کمائی کا ذریعہ بنانا بھی حرام ہے حتیٰ کہ جو شخص اس کو حلال جانے وہ کافر اور واجب القتل ہے۔

خداوند کریم تمام مومنین کو خواہش نفسانی کے پھندوں سے محفوظ رکھے اور اعمال صالحہ کی زیادہ سے زیادہ توفیق عنایت فرمائے اور قرآن مجید سے صحیح فائدہ اٹھانے کی جرأت عطا کرے۔

تلاوتِ قرآن مجید اور اس کے فضائل

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید خالق و مخلوق کے درمیان ایک ایسا گہرا رشتہ اور ناقابلِ اضمحلال تعلق ہے۔ جو رہتی دنیا تک برقرار رہے گا اور یہ ایک ایسا محبت نامہ ہے۔ جس کی دید تجدید محبت بلکہ تمہید معرفت ہے۔ جس طرح محب اور محبوب کے درمیان راز و نیاز کے مکتوبات سوزشِ فراق کے ازالہ کا موجب ہو کر روح پرور اور مسرت افزا ہوا کرتے ہیں۔ ان مکتوبات کی دید لذتِ وصال کی آئینہ دار جس کی بدولت شوق دیدار میں مزید تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کا مطالعہ باہمی مکالمہ کا لطف پہنچاتا ہے۔ بار بار دیکھنا اور پڑھنا بجائے طول کے روحانی کیف میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح ذاتِ احدیت واجب الوجود کی صحیح معرفت اور اس کی محبت راسخہ کی حقیقی جاذبیت اہلِ عرفان کو تلاوت کلام اللہ میں وہی لطف بخشتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت سے گویا ہم اپنے خالق سے ہمکلام ہیں۔ اور بالمشافہ سوال و جواب کے ذریعے پیار و محبت کا نہایت پُرکیف اور سرور بخش مکالمہ جاری ہے۔ جس سے طبیعت

کی سیری ہوتی ہی نہیں۔ پھر فہم معانی اور ادراک مطالب میں جس قدر ذہن کو رسائی حاصل ہوگی۔ اتنا ہی روح ایمان میں انبساط
اور قلب ایقان میں سکون و اطمینان ہوگا۔ کہیں نعمات کا ذکر۔ کہیں اطاعت وعبادت۔ کہیں پر از اخلاص محبت بھرے
لہجہ میں ناز و ادا کی پیاری باتیں۔ مثلاً تو مجھے یاد کر۔ میں تجھے یاد کروں۔ تو میرے فرائض کو نہ بھول میں تجھے بھلاؤں میں تیرے دشمنوں سے
بیزار۔ تو میرے دشمنوں سے بیزار۔ تو میرے محبوب کی اطاعت کر۔ میں تجھے محبوب بناؤں۔ تو میری نعمت پر شاکر۔ میں
تیری اطاعت پر شاکر۔ تو میرے قریب۔ میں تیرے قریب۔ جنت تیرے لئے۔ حور و قصور تیرے واسطے۔ غلمان و حوریں
تیری خاطر۔ کوثر و سلسبیل کی نہریں تیرے لئے صرف یہی نہیں۔ بلکہ تو جو چاہے گا۔ سب کچھ تیرے لئے حاضر ہوگا۔
بس میرے مہمانخانہ جنت میں تیرے پہنچنے کی دیر ہے۔ میرے اور تیرے دشمنوں کے لئے جہنم کا گھر ہے۔ وہ اس میں
ہمیشہ جلتے رہیں گے۔

جب خالق و مخلوق کے درمیان اس قسم کے پر لطف مذاکرے اور راز و نیاز کی روح پرور باتیں ہو رہی ہوں۔ تو کون
صاحب عقل طبیعت میں ملول کا احساس کر سکتا ہے۔ بلکہ بمقتضائے فطرت اس کا جی اور بڑھنا چاہیئے۔ اور انسان کی ذہنی
صلاحیتوں میں کمزوری اور مادی الجھنوں میں گرفتاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکیم مطلق نے انداز کلام میں ایک ہی قسم کی بات
اور یک رنگی گفتگو کو روانہ رکھا۔ تاکہ ملول آور نہ ہو۔ پس تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مضامین میں تبدیلی کر دی۔ عنوان کلام
کو کبھی سابقہ نبیوں اور ان کی امتوں کے حالات و قصص کی طرف کبھی امثال۔ کبھی معقولات۔ و بعض اوقات محسوسات
وغیرہ مختلف موضوعات کی جانب منتقل فرماتا رہا۔ یہ سب کچھ اس حکیم مطلق کی کمال رافت وعطوفت کے مظاہر ہیں

اگر ایک رعایا کے فرد کو بادشاہ وقت سے گفتگو کا شرف ملے۔ یا اس کی جانب سے اس کے پاس کوئی خط یا
پیغام آ جائے تو ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے تئیں بہت بڑا آدمی خیال کرتے ہوئے اپنے دل میں پھولا نہ سمائے گا۔ اسی طرح
اگر کسی آدمی کو قرب بادشاہ کا لالچ دیا جائے تو نہ معلوم اس کی تحصیل کے لئے وہ کیا کیا قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

لیکن "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" دنیاوی سلاطین کو خالق کائنات سے نسبت ہی کیا ہے؟ وہ مہربان امیر و غریب
شاہ و گدا سب کو اپنی بارگاہ میں حضوری اور فیضیابی کی خود دعوت دیتا ہے۔ گو بندہ اس کے حکم کو ٹھکرا دے۔ تاہم وہ بار بار
بلانے سے گریز نہیں فرماتا اور نہ کسی دیر میں آنے والے سے روٹھتا ہے۔ اپنی جانب قدس سے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر
اسی غرض کے لئے بھیجے کہ تمام انسانوں سے اس کا تعارف کرائیں اور پھر اس کی بارگاہ میں شرف یابی کی دعوت دیں۔ جن خطابات
سے بذریعہ وحی و الہام انبیاء کو نوازا۔ ان ہی خطابات سے بذریعہ انبیاء عام انسانوں کو سرفراز فرمایا۔ ہمارے علائق مادیہ
اور عوائق نفسیہ گو ہم کو اس کی بارگاہ سے گریز کراتے رہے۔ لیکن پھر بھی اس کا فیض عام کبھی ہم سے منقطع نہ ہوا۔ اب
غور فرمائیے کہ اگر ایسے مہربان بادشاہ سے باہمی مکالمہ کا شرف دستیاب ہو جائے۔ تو پھر اس سے بڑھ کر اور کونسی نعمت
عظمیٰ ہو سکتی ہے؟

عن ابی عبداللہ قال القرآن عھد اللہ الی خلقہ فقد ینبغی للمرء المسلم ان ینظر فی عھدہ وان یقرأ منہ فی کل یوم خمسین آیۃ

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا، کہ قرآن مخلوق کی طرف اللہ کا عہد ہے مسلمان کو چاہیئے کہ اپنے عہد میں نظر کرے اور ہر روز اس کی پچاس آیات کی تلاوت کرے۔

۲۔ روی اسحٰق بن عمار عن الصادقؑ قال قلت جعلت فداک انی احفظ القرآن عن ظھر قلبی فاقرأہ عن ظھر قلبی او انظر فی المصحف قال لا بل اقرأ وانظر فی المصحف وھو افضل اما علمت ان النظر فی المصحف عبادۃ

اسحاق بن عمار کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے عرض کی قربان جاؤں۔ میں قرآن کا حافظ ہوں۔ کیا تلاوت یاد کرتا رہوں۔ یا قرآن میں دیکھ کر پڑھوں؟ تو آپ نے فرمایا، نہیں بلکہ قرآن میں دیکھ کر تلاوت کرو، کیا تم نہیں جانتے کہ قرآن میں نظر کرنا بھی عبادت ہے۔

۳۔ قال النبیؐ نوروا بیوتکم بتلاوۃ القرآن ولا تتخذوھا قبورا کما فعلت الیھود والنصاری صلوا فی الکنائس والبیع وعطلوا بیوتھم فان البیت اذا کثر فیہ تلاوۃ القرآن کثر خیرہ واتسع اھلہ واضاء لاھل السماء کما تضیٔ نجوم السماء لاھل الدنیا

جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے گھروں کو قرآن کی تلاوت سے منور کرو اور یہود اور انصاری کی طرح ان کو قبریں نہ بناؤ کہ انہوں نے بھی اپنے گرجوں میں نمازیں پڑھیں اور گھروں کو محروم چھوڑ دیا۔ پس جب گھر میں تلاوت قرآن زیادہ ہو۔ تو اس میں برکت زیادہ اور رزق وسیع ہو جاتا ہے اور وہ گھر اہل آسمان کے لئے ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔

۴۔ عنہ قال اھل القرآن ھم اھل اللہ وخاصتہ

نیز آپ نے فرمایا کہ قرآن والے۔ اللہ والے ہیں اور اس کے خاص بندے ہیں۔

۵۔ عن ابی عبداللہؑ من قرأ القرآن فی المصحف متع ببصرہ وخفف علی والدیہ وان کانا کافرین

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ جو شخص قرآن سے دیکھ کر تلاوت کرے۔ اس کی بصارت دیرپا ہوگی۔ اور اس کے والدین سے تخفیف عذاب ہوگی۔ اگرچہ وہ کافر ہوں۔

۶۔ عن امیرالمومنینؑ قال فی حدیث طویل سمعت رسول اللہ یقول انھا ستکون فتن قلت فما المخرج منھا یا رسول اللہ قال کتاب اللہ فیہ خبر ما قبلکم ونبأ ما بعدکم وحکم ما بینکم ھو الفصل لیس بالھزل ھو الذی لا تزیغ بہ الاھواء ولا یشبع منہ العلماء ولا یخلق عن کثرۃ رد ولا تنقضی

حضرت امیرالمومنینؑ سے ایک حدیث طویل میں مروی ہے کہ میں نے جناب رسالتمآبؐ سے سُنا وہ فرماتے تھے کہ ضرور فتنے واقع ہوں گے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ پھر بچاؤ کیسے ہوگا۔ فرمایا کتاب اللہ (کے ذریعے) اس میں گذشتہ اور آئندہ کی خبریں۔ اور دورِ حاضر کے احکام موجود ہیں۔ یہ وہ فیصل ہے جس میں تمسخر پن نہیں۔ اس کو خواہشات کج نہیں کرسکتیں۔ اس سے علماء سیر نہیں ہوتے۔ کثرتِ تلاوت سے پرانا نہیں ہوتا۔ اس کے عجائبات ختم

عَجَائِبُهٗ وَهُوَ الَّذِیْ مَنْ تَرَکَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَی الْهُدٰی فِیْ غَیْرِہٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ هُوَ الَّذِیْ مَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ وَمَنْ حَکَمَ بِهٖ عَدَلَ وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ دَعَا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

نہیں ہوتے اگر اسے کوئی سرکش چھوڑے گا۔ تو خدا اس کو پست کر دے گا جو ہدایت کو اس کے غیر میں طلب کرے گا۔ وہ گمراہ ہوگا۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی اور صراط مستقیم ہے جو اس پر عمل کرے گا۔ ثواب پائے گا جو اس کے ساتھ حکم کرے گا۔ وہ عادل ہے جس نے اس کی طرف دعوت دی۔ گویا اس نے سیدھے رستے کی طرف بلایا۔

۷۔ عن ابی عبداللّٰه قال ثَلٰثَةٌ یَّشْکُوْنَ اِلَی اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مَسْجِدٌ خَرَابٌ لَا یُصَلِّیْ فِیْهِ اَهْلُهٗ وَعَالِمٌ بَیْنَ جُهَّالٍ وَمُصْحَفٌ مُعَلَّقٌ قَدْ وَقَعَ عَلَیْهِ الْغُبَارُ لَا یُقْرَءُ فِیْهِ

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ (قیامت کے روز) تین چیزیں اپنا اپنا شکوہ اللہ تعالیٰ کو پیش کریں گی۔ (۱) وہ مسجد غیر آباد جس میں نماز کوئی نہ پڑھتا ہو۔ (۲) وہ عالم جو جاہلوں کے درمیان ہو اور وہ اس سے مسائل دینیہ نہ پوچھیں۔ (۳) وہ لٹکایا ہوا قرآن جس پر غبار پڑتا رہے اور اس میں کوئی تلاوت نہ کرے

۸۔ عن الباقرؑ من قَرَأَ الْقُرْاٰنَ قَائِمًا فِیْ صَلٰوتِهٖ کَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِکُلِّ حَرْفٍ مِاۃَ حَسَنَةٍ وَمَنْ قَرَأَ فِیْ صَلٰوتِهٖ جَالِسًا کَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِکُلِّ حَرْفٍ خَمْسِیْنَ حَسَنَةً وَمَنْ قَرَأَ فِیْ غَیْرِ صَلٰوۃٍ کَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِکُلِّ حَرْفٍ عَشْرَ حَسَنَاتٍ

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو بحالت قیام نماز میں قرآن پڑھے۔ اس کے لئے ہر حرف کے بدلہ میں ایک سو نیکی کا ثواب ہے اور جو بیٹھنے کی حالت میں پڑھے۔ تو اس کے لئے ہر حرف کے بدلہ میں پچاس نیکیوں کا ثواب ہے اور جو شخص بغیر نماز کے قرآن پڑھے تو اس کے لئے ہر حرف کے بدلہ میں دس نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

۹۔ عن الصادقؑ مَا یَمْنَعُ التَّاجِرَ مِنْکُمُ الْمَشْغُوْلَ فِیْ سُوْقِهٖ اِذَا رَجَعَ اِلٰی مَنْزِلِهٖ اَنْ لَّا یَنَامَ حَتّٰی یَقْرَأَ سُوْرَۃً مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَیُکْتَبُ لَهٗ مَکَانَ کُلِّ اٰیَةٍ یَقْرَأُهَا عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَیُمْحٰی عَنْهُ عَشْرُ سَیِّئَاتٍ

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ کیا حرج ہے۔ بازاری کاروبار میں مصروف رہنے والے تاجر کو کہ گھر آکر سونے سے پہلے قرآن کی کوئی سورت پڑھ لیا کرے تاکہ اس کے نامۂ اعمال میں ہر ہر آیت کے بدلہ میں دس دس نیکیاں درج ہوں اور دس دس برائیاں کٹ جائیں۔

۱۰۔ عن النبیؐ اَلنَّظَرُ اِلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عِبَادَۃٌ۔ وَالنَّظَرُ اِلَی الْوَالِدَیْنِ بِرَأْفَةٍ وَرَحْمَةٍ عِبَادَۃٌ وَالنَّظَرُ فِی الصَّحِیْفَةِ یعنی

جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا (۱) علیؑ بن ابی طالب کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔ (۲) نرمی و مہربانی سے ماں باپ کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔ (۳) قرآن کے صحیفہ میں نظر کرنا عبادت ہے

صَحِیفَۃِ الْقُرْاٰنِ عِبَادَۃٌ وَالنَّظَرُ اِلَی الْکَعْبَۃِ عِبَادَۃٌ

۴۔ اور کعبہ کی طرف نظر کرنا عبادت ہے۔

۱۱۔ عن ابی جعفر عن ابیہ قال انّہٗ لَیُعْجِبُنِیْ اَنْ یَکُوْنَ فِی الْبَیْتِ مُصْحَفٌ یَطْرُدُ اللّٰہُ عزّ وجلّ بِہِ الشَّیَاطِیْنَ

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اپنے والد بزرگوار سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن کا گھر میں رکھنا محبوب ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے خدا شیاطین کو دُور کرتا ہے۔

۱۲۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے حضرت رسالتمآبؐ سے نقل فرمایا ہے۔

- ★ جو شخص ہر شب قرآن مجید کی دس آیات کی تلاوت کرے اس کا شمار غافلین سے نہ ہوگا۔
- ★ اور جو شخص ہر رات قرآن مجید کی پچاس آیتیں پڑھتا ہو وہ ذاکرین میں شمار ہوگا۔
- ★ اور جو شخص ہر رات ایک سو آیات کی تلاوت کرے وہ قنوت کرنے والوں میں لکھا جائے گا۔
- ★ اور جو شخص ہر شب دو سو آیات پڑھے خشوع کرنے والوں میں شمار ہوگا۔
- ★ اور جو شخص ہر شب تین سو آیات پڑھے وہ کامیاب ہونے والوں میں شمار ہوگا۔
- ★ اور جو شخص ہر رات پانچ سو آیات پڑھے وہ مجتہدین یعنی کوشش کرنے والوں میں شمار ہوگا۔
- ★ اور جو ایک ہزار آیت ہر رات پڑھے۔ اس کے نامۂ اعمال میں ایک قنطار سونے کا درج ہوگا (جو راہِ خدا میں خرچ کیا گیا ہو) ایک قنطار ہزار مثقال کے برابر اور ہر مثقال چوبیس قیراط کے برابر کہ ہر قیراط کم از کم کوہ احد اور زیادہ سے زیادہ زمین و آسمان کے مابین فاصلہ کے برابر ہوگا۔

۱۳۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہر انسان کو تعقیبات نماز صبح کے بعد پچاس آیت تلاوت کرنی چاہیئے

۱۴۔ ایک مرتبہ امام حسین علیہ السلام نے قرآن کی تلاوت کرنے والے اور اس کے سننے والے کا بے حد ثواب بیان فرمایا۔ تو ایک شخص قبیلۂ اسد میں سے عرض گذار ہُوا کہ حضور! یہ ثواب تو اس کا ہے جو پڑھا لکھا ہو اور جو ان پڑھ ہو وہ کیا کرے۔ آپ نے فرمایا۔ اے اسدی خدا جواد و کریم ہے جیسا پڑھنا آتا ہے ویسا ہی پڑھے۔ اس کو بھی ویسا ہی ثواب مل جائیگا

۱۵۔ جامع الاخبار میں وارد ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے سلمان پاک سے ارشاد فرمایا۔ اے سلمان قرآن کی تلاوت ضرور کیا کرو۔ کیونکہ یہ گناہوں کا کفارہ، جہنم کی ڈھال اور عذاب کی امان ہے۔ پڑھنے والے کے لئے ہر آیت کے بدلہ میں سو شہید کا ثواب ہے۔ ہر سورت کے بدلہ میں اسے نبی مرسل کا ثواب ملتا ہے۔ پڑھنے والے پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ جنت اس کی مشتاق اور خدا اس سے خوشنود ہوتا ہے۔ مومن جب قرآن پڑھتا ہے تو خدا اس پر نظرِ رحمت فرماتا ہے اور ہر آیت کے بدلہ میں اس کو ایک ہزار حور عنایت فرماتا ہے اور ہر حرف کے بدلہ میں اس کے لئے صراط پر نور ہوتا ہے۔ جب قرآن ختم کرلے تو اس کو تین سو تیرہ ایسے نبیوں کا ثواب ملے گا۔

جنہوں نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کی۔ اور گویا اس نے تمام گذشتہ انبیاء کی کتابوں کی تلاوت کی اور خدا اس کے جسم پر آتشِ جہنم کو حرام کرتا ہے اور اپنی جگہ سے ابھی حرکت نہیں کرتا۔ کہ خدا اس کے اور اس کے والدین کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور قرآن کے ہر سورہ کے مقابلہ میں جنت الفردوس میں اس کو ایک شہر عطا ہوتا ہے جس کی بناء سبز مروارید سے ہے اور ہر شہر میں ایک ایک ہزار محل جو ایک ایک لاکھ کمروں پر مشتمل ہیں۔ اور ہر کمرہ ایک لاکھ بیت پر مشتمل ہے۔ ہر بیت کا ایک لاکھ دروازہ رحمت کا ہے۔ ہر دروازہ پر ایک لاکھ دربان اور ہر دربان کے ہاتھ میں مختلف قسم کے ہدیے ہیں اور ہر دربان کے سر پر استبرق کا رومال ہے جو دنیا اور اس کی تمام نعمات سے افضل ہے۔ اور ہر بیت کے اندر ایک ایک لاکھ مسند عنبر کی ہے کہ ہر مسند پر ایک لاکھ تخت اور ہر تخت پہ ایک لاکھ بستر کہ ہر دو کے درمیان ایک ہزار گز کا فاصلہ ہے اور ہر بستره پر ایک ہزار حور موجود ہے (یہاں تک کہ آپ نے فرمایا) کہ خداوند عالم قرآن مجید کے پڑھنے والے کے منہ سے نکلے ہوئے ہر ہر حرف کے بدلہ میں ایک ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو قیامت تک اس کے لئے تسبیح کرتا ہے (الخبر)

تنبیہ:- اعمال کے ثواب کے متعلق جو احادیث اہل بیت عصمتؑ سے مروی ہیں۔ ان کی صحیح تاویل اور حقیقی مفہوم وُہ خود ہی جانتے ہیں۔ ہم اپنے فہم قاصر اور عقل نارسا سے ان کے متعلق کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خداوند کریم کے فیض عمیم اور اس کی وسعت رحمت (جس کا کوئی کنارہ ہی نہیں) کے پیش نظر اتنا انعام تو درکنار اس سے کروڑ در کروڑ بھی بعید از عقل نہیں۔ اپنی دماغی وسعت کے ساتھ اس کی وسعتِ رحمت کا قیاس کرنا انتہائی نادانی اور بے عقلی ہے۔ معصوم کے فرمان کو از راہ تسلیم مان لینا اور اس کے حکم کے آگے سر جھکا دینا عین مقتضائے اسلام و ایمان ہے جو لوگ ایسی باتوں کو خلاف عقل کہتے ہیں۔ وُہ خود خلافِ عقل کہتے ہیں۔ وہ عقل کے اندھے معرفتِ خدا سے کورے ہیں۔ ہم قدرت خدا اور خالق علیم و حکیم کی عظمت کو سمجھ ہی کیا سکتے ہیں؟ محدود قطعۂ ارضیہ کے محدود ماحول میں بیٹھ کر اپنی محدود عقلوں سے خلاق عالم کی لامحدود قدرت و حکمت کی حد بندی کرتے ہیں اور جس چیز کو ماوراء عقل پاتے ہیں اس کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔

تخلیق آسمان پر غور کیجئے اور پھر ہر ہر سیارہ اور ستارہ کی خلقت کا ملاحظہ کیجئے اور سائنس دانوں سے ہر ایک کی عظمتِ وجود کے متعلق معلومات حاصل کیجئے۔ بلکہ آسمانی مخلوق کے دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا مصالح ارضیہ پر ایک نظر دوڑا ؤ اور اس کے اندر ایٹمی طاقتیں اور برقی قوتیں ملاحظہ فرمائیے وعلیٰ ہذا القیاس۔

آج سے ایک سو سال پیشتر ان باتوں کا تصور تک نہ تھا اور آج ناقابلِ انکار حقیقت بن کر سامنے موجود ہیں۔ اگر گذشتہ لوگوں سے ان چیزوں کے متعلق تبادلہ خیالات ہوتا تو وُہ یقیناً دورِ حاضر کی محیر العقول ایجادات سے ذراتِ ارضیہ میں قدرت و حکمتِ خالق کے ودیعت کردہ کمالات کے منصۂ شہود میں آسکنے کا انکار کرتے۔ کیونکہ انسان فطرتاً

اپنی ناقص عقل میں ہر نہ آنے والی چیز کے انکار کا خوگر چلا آیا ہے۔

اگر مادیات سے گزر کر مجردات کی طرف دھیان کر لیا جائے۔ نفوس ارضیہ و فلکیہ اور ملائکہ و ارواح اور ان کی تفصیل خلقت اور کثرت وجود و عظمت کا جائزہ لیا جائے۔ تو ہماری عقول ورطۂ حیرت و استعجاب میں پڑ جاتی ہیں۔ خطبات نہج البلاغہ میں ابتدائے خلقت کائنات اور ایجاد آدم اور تخلیق ملائکہ کے متعلق مولائے کائنات امیر موجودات حلال مشکلات حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جس قدر تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ ہمارے دماغ و عقول صحیح معنوں میں ان کے بھی حامل نہیں ہو سکتے۔ ورنہ ان کے سینۂ خزینۂ علوم الٰہیہ سے بے حد و بے پایاں معلوماتی ذخائر برآمد ہو سکتے تھے۔ بعض اوقات ارشاد فرماتے تھے کہ اس سینہ میں علم کے خزائن موجود ہیں۔ کاش ان کے حاملین ہوتے۔

روایات معراج پر اگر سرسری نظر دوڑائی جائے کہ شب معراج حضور رسالتمآبؐ نے کیا کیا دیکھا (اور اس میں سے بھی جس قدر ہم تک پہنچایا)؟ آسمانوں کی وسعت کرسی کی عظمت عرش کی رفعت پھر ستونہائے عرش کی کثرت قندیل ہائے نور کی بہجت اور کنگرہ ہائے عرش کی شوکت و اہمیت پھر ان کے آگے دریا ہائے نور کی ہیبت و حشمت پھر حجاب ہائے قدرت و سرادقات عظمت کی جلالت حتیٰ کہ جبریل کے قدم رک گئے اور عرض کی کہ اگر آگے بڑھوں تو پر جل جائیں اور عرض کی کہ میرے مقام سے آپ کے محل رسائی تک نوّے ہزار ۹۰۰۰۰ حجابات نور ہیں کہ دو حجابوں کے درمیان پانچ سو سال کی راہ ہے۔

بہرکیف ان چیزوں کی تفصیل تو کسی اور مقام پر آئے گی۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ خدا اپنے خاص بندوں کے لئے بطور انعام جو کچھ پیدا کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے نہ اس کی قدرت سے بعید ہے اور نہ اس کی رحمت بے پایاں سے خلاف متوقع ہے۔ ہمارا دماغ نارسا اگر نہ پہنچ سکے تو اس سے اس کی قدرت و رحمت کی نفی لازم نہیں آتی اور نہ ہمارے انکار سے اس میں کچھ کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اسی بناء پر معصوم فرماتے ہیں کہ ہماری احادیث صعب و مستصعب ہیں۔ اس کی تاب برداشت کسی کو نہیں۔ سوائے ملک مقرب کے یا نبی مرسل کے یا اس مومن کے جس کا ایمان امتحان کی کسوٹی پر پورا اترا ہوا ہو۔

نیز احادیث میں ثواب کی تعبیر کے الفاظ بھی جدا جدا ہیں مثلاً کسی میں ہے کہ ایک حرف کے بدلہ میں دس نیکیوں کا ثواب ملے گا کسی میں ہے ایک آیت کے بدلہ میں دس نیکیاں اور کسی میں ایک حرف کے بدلہ میں ایک سو نیکیاں بیان کی گئی ہیں تو اس اختلاف کو دیکھ کر جلد باز طبائع کو حرف گیری کی ہی سوجھتی ہے۔ حالانکہ ان میں کوئی منافات نہیں۔ پڑھنے والے جس طرح اپنے مدارج میں فرق رکھتے ہیں۔ ان کے اذہان جدا جدا۔ ایقان جدا، صلاحیتیں جدا جدا، خشوع و خضوع میں منازل الگ الگ اور معرفت و بصیرت میں مراتب کا معتد بہ فرق تو اسی طرح اعمال کے ثواب میں بھی مدارج و مراتب کا فرق ضروری و لازم ہے۔ لہذا بعید نہیں کہ معصومین علیہم السّلام کے کلام پاک میں ثواب کی تعبیر کے لئے اختلاف

الفاظ اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ ہر معصوم کا کلام حاضرینِ مجلس کی ذہنی و عقلی و ایمانی و عرفانی صلاحیتوں کے مطابق ہوا کرتا تھا۔

آدابِ تلاوت

قرآن مجید کی تلاوت کے وقت ایسے آداب ملحوظِ خاطر ہوں۔ جو خشوع و خضوع کو ظاہر کریں۔ عام قصہ خوانی یا ناول کی کتابوں کے مطالعہ کی طرح بے توجہی اور لاپرواہی برتنا گناہ ہے۔ بنا بریں بستر یا دیوار یا کسی اور چیز پر تکیہ لگائے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر یا ویسے لیٹ کر یا ہر وہ وضع جس سے بے اعتنائی کا مظاہرہ ہو یا اس میں قرآن کی توہین و تحقیر لازم آئے وغیرہ ان سب چیزوں سے گریز کرنا چاہیئے۔

باوضو ہو کر قبلہ رُخ شائستہ انداز میں پاک مقام پر پوری توجہ اور دل لگی کے ساتھ تلاوت کرنا نہایت موزوں و مناسب ہے۔ چنانچہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے متعلق ایک روایت گزر چکی ہے کہ آپ جب تلاوت فرماتے تھے تو بہت رویا کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی سے روبرو گفتگو فرما رہے ہیں۔ صرف ایک نہیں بلکہ ہر معصوم کی تلاوت کا یہی دستور تھا اگر قرآن کے معانی کو جانتا ہو تو بوقتِ تلاوت ان پر غور کرے۔ جب رحمت و بشارت کی آیت سامنے آئے تو اللہ سے اس کے حصول کا سوال کرے اور جب عذاب کی آیت پر نظر پڑے تو اللہ سے امان طلب کرے۔

بے وضو کے اگرچہ قرآن مجید پڑھا جا سکتا ہے لیکن ثواب کم ہے اور نیز بے وضو قرآن مجید کے لفظوں کو ہاتھ لگانا حرام ہے۔ جُنبی انسان اور حیض و نفاس والی عورت کے لئے قرآن کا اٹھانا مکروہ ہے اور اس کے لفظوں بلکہ حروف و حرکات کا چھونا بھی حرام ہے اور قرآن مجید کی وہ سورتیں جن میں واجب سجدہ آتا ہے۔ جنب۔ حیض۔ نفاس کی حالتوں میں پڑھنا حرام ہے۔ حتیٰ کہ ایک آیت بھی اور بسم اللہ شریف بھی اگر ان (سجدے والی) سورتوں کی نیت سے پڑھے تو حرام ہے۔ اور وہ سورتیں جن میں سجدہ واجب ہے چار ہیں۔ الم سجدہ پ۲۱ حٰم سجدہ پ۲۴ والنجم پ۲۷۔ العلق پ۳۰

ان چار سورتوں میں ایک ایک واجب سجدہ ہے ان کے علاوہ قرآن مجید کے جس قدر سجدے ہیں مستحب ہیں۔

تلاوت کرتے وقت جب آیتِ سجدہ کو پڑھے تو فوراً سجدہ میں چلا جائے۔ اس سجدہ میں نماز کے سجدہ کے شرائط نہیں ہیں اور نہ اس میں کوئی ذکر مخصوص طور پر واجب ہے واجب سجدہ وجوب کی نیت سے اور مستحب سجدہ استحباب کی نیت سے کرے۔ واجب سجدہ میں اگر بلا وجہ تاخیر کرے تو گنہگار ہوگا۔

جنب کی حالت میں چار مذکورہ بالا سورتوں کے علاوہ باقی قرآن مجید کی سات سے زیادہ آیات کا تلاوت کرنا مکروہ ہے اور ستر آیات سے تجاوز کرنا کراہت شدیدہ ہے۔ اور حیض و نفاس کی حالت میں مطلقاً تلاوت مکروہ ہے

جن حالات میں تیمم غسل کے قائمقام ہو سکتا ہے تو تیمم کر لینے کے بعد جس طرح نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید بھی پڑھا جا سکتا ہے اور اس کے حروف کو مس بھی کیا جا سکتا ہے۔

طہارت کے بغیر جس طرح قرآن مجید کے حروف و حرکات کو مس کرنا حرام ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کے اسماء طاہرہ کو مس کرنا بھی حرام ہے۔ بشرطیکہ انہیں کی نیت سے لکھے گئے ہوں۔ اگر کسی اور شخص کا نام انبیاء یا آئمہ کے ناموں میں سے ہو۔ تو اس کا مس کرنا حرام نہیں ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت سے پیشتر استعاذہ یعنی (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ) کا پڑھنا مستحب ہے اس کے بعد بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھ کر تلاوت شروع کرے۔

قرآن کی تلاوت کرتے وقت یہ خیال رہے کہ جس طرح ایک عبد ذلیل اپنے مولائے جلیل کے سامنے عاجزی وانکساری سے بیٹھ کر نہایت توجہ اور کمال التفات سے اس کے خطابات کو سنتا ہے اور ان سے اثر قبول کرتا ہے یہی حالت قرآن مجید کے پڑھنے والے کی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ سعد بن ابی وقاص کہتا ہے کہ میں نے جناب رسالتمآبؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قرآن حزن کے ساتھ اترا ہے۔ پس اس کی تلاوت کرو تو رویا کرو اور اگر رونا نہ آئے۔ تو رونے کی سی شکل بنا لیا کرو۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعُہُ الذِّکْرٰی

رسمِ قرآن خوانی و قُل خوانی

گذشتہ عنوانات کے ذیل میں قرآن مجید کے دیکھنے، پڑھنے اور سننے کے متعلق احادیث سے روشنی ڈالی جا چکی ہے اس مقام پر رسم قرآن خوانی جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

قرآن کا پڑھنا روحانی برکات اور اخروی نجات کے علاوہ خانگی حالات بلکہ جملہ ظاہری معاملات میں بھی آفات و بلیات کی دوری کا موجب ہے۔ اس سے دل کی کدورتیں رفع ہوتی ہیں اور رجحانات میں اچھائی پیدا ہوتی ہے۔ چہرہ پر بشاشت و بشاشت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نئے مکان کو پہلے پہلے قرآن خوانی کر کے مسکن بنانا خیر و برکت کا موجب ہے۔ ہر مصیبت و رنج کے وقت قرآن خوانی موجب دفعیہ ہوتی ہے۔ نیز قرآن خوانی کے بعد دعا مورد استجابت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ بعض احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

بوقت نزع قرآن خوانی مستحب ہے۔ خصوصاً بعض سورتوں کے متعلق زیادہ تاکید وارد ہے ایک روایت میں ہے

کہ جس مرنے والے کے پاس بوقت موت سورہ صٓ اور سورۂ یٰسٓ کی تلاوت کی جائے تو رضوانِ خازنِ جنت اس کے پاس پہنچ کر اس کو شرابِ جنت سے سیراب کرتا ہے۔ پس وہ سیراب ہوکر مرے گا اور سیراب ہوکر اُٹھے گا دوسری روایت میں ہے کہ جس مسلمان کے پاس بوقت نزع سورہ یٰس کی تلاوت کی جائے تو ہر ہر حرف کے بدلہ میں دس دس فرشتے اس کے پاس اُترتے ہیں۔ جو اس کے سامنے کھڑے ہوکر اس کے لئے طلب رحمت و دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اس کے غسل دینے میں ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر اس کے جنازہ کی تشییع کرتے ہیں اور اس کے نمازِ جنازہ اور دفن میں شریک رہتے ہیں۔

ایک اور روایت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے جس میں سورہ صافات کے پڑھنے کا حکم ہے آپ سے سوال کیا گیا کہ ہم تو پہلے سورہ یٰس پڑھتے تھے۔ آپ نے فرمایا جس کے سرہانے یہ سورہ پڑھا جائے اس کی روح آسانی سے قبض ہوجاتی ہے (گویا سورتوں کے خاصے جُدا جُدا ہیں) ان کا وہ خاصہ تھا جو بیان ہو چکا اور اس کا یہ خاصہ ہے دونوں کا پڑھنا زیادہ اچھا ہے۔ ایک روایت میں جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ قبرستان میں سورۂ یٰس کی تلاوت سے قبرستان والوں کے عذاب میں تخفیف ہوجاتی ہے۔ نیز بعض روایات میں آیۃ الکرسی ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ تک پڑھنے کا حکم بھی وارد ہے۔

بہرکیف بوقتِ نزع قرآن خوانی اور بالخصوص مذکورہ سورتیں پڑھنا آسانئ موت، تخفیفِ عذاب اور برکت کا باعث ہے لیکن روضہ خوان حضرات (یعنی ذاکرین و واعظین) عوام کو ہنسانے اور دادِ تحسین حاصل کرنے کے لئے اپنے قلبی جذبات کو یوں تسکین دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کے ذریعے سے مردوں کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مولوی صاحبان کی قرآن خوانی اُلٹا اثر رکھتی ہے۔ کیونکہ بوقتِ نزع ملّا صاحب کو بُلایا جائے کہ قرآن پڑھو تو جونہی انہوں نے قرآن کھولا اور سورۂ یٰس کو شروع کیا تو ابھی دوسری یا تیسری مبین تک نہیں پہنچنے پاتے کہ حضرت ملک الموت پہنچ کر رُوح قبض کر لیتا ہے۔ اُدھر خدا فرماتا ہے کہ قرآن سے مردوں کو زندہ کیا جاتا ہے اور یہ ملّا لوگ قرآن سے زندوں کو مار بیٹھتے ہیں۔ اس بیان کے نتیجہ میں حاضرینِ مجلس میں بے تحاشا قہقہہ اور واہ وا۔ واہ وا۔ ہا ہا ہا کی بے تکی صداؤں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ مقرر نے سمجھا کہ میں نے اچھا نکتہ بیان کر دیا اور مجلس خوب بن گئی۔ حالانکہ وہ جاہل یہ نہیں خیال کرتا کہ میرے اس بے ہودہ بیان سے معصومینؑ کے کلام کے ساتھ کیا برتاؤ ہُوا۔ ان کے اقوال و فرمائشات کی کس قدر توہین ہوئی اور قرآن مجید کے وقار کا عوام کے دلوں میں کیا حشر ہُوا؟ اپنا ایمان ضائع عوام کے عقائد و رجحانات تباہ۔ صرف اختتامِ مجلس پر چار دام لے کر رخصت ہوئے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا پس ان کی یہ تجارت قطعاً نفع بخش نہیں۔

بعض رسوم نیم خوان ملاؤں نے اپنی طرف سے شکم پُری کی خاطر ایجاد ہوئی ہیں ۔ مثلاً نماز جنازہ پڑھ چکنے کے بعد کچھ دیر میت کی چارپائی کے آس پاس بیٹھ رہتے ہیں اور کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں ۔ کچھ دیر بعد حاضرین کہتے ہیں ۔ ملا صاحب جو کچھ ہم نے پڑھا ہے تیرے ملک میں دیا ہے ۔ اس کے بعد قرآن خوان لوگ ایک ایک یا دو دو ختم قرآن یا اس سے کم و بیش ملا صاحب کی ملک میں دیتے ہیں اور ملا صاحب ان سب کو قبول کرتا جاتا ہے جب تملیک کا ایجاب و قبول ختم ہوتا ہے تو ملا صاحب اپنی پڑھی ہوئی کوئی چیز اور حاضرین سے وصول شدہ املاک سب میت کو تملیک کر دیتا ہے ۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے اور جس حد تک مجھے معلوم ہے نہ خدا اور رسول کا حکم ہے اور نہ آئمہ طاہرین کی طرف سے اس کے متعلق کچھ وارد ہوا ہے ۔ غالباً ہندوؤں ، برہمنوں کی اس موقعہ کی رسوم کو ملا لوگوں نے اپنے رنگ میں ڈھال کر ایک اسلامی عمل کی شکل دے دی ہے جس سے سوائے شکم پرستی کے اور کوئی مقصد نہیں ۔ اور یہ معلوم رہے کہ صاحب شریعت کے فرمان کے بغیر کسی رسم کو شرعی عنوان سے ادا کرنا بدعت کہلاتا ہے اور وہ حرام ہے ۔ ویسے میت کے لئے جس قدر اعمال کئے جائیں ۔ اس کے لئے نوافل پڑھی جائیں ۔ قرآن خوانی کی جائے ۔ صدقہ یا خیرات کی جائے یا کوئی اور عمل صالح کیا جائے اور اس کا ثواب میت کی روح کو ہدیہ کیا جائے تو ثواب ہے اور میت کے لئے نفع بخش ہے اور بجائے اس کے کہ ملا صاحب کی وساطت سے یہ ثواب میت تک پہنچایا جائے ۔ اگر محمدؐ و آل محمدؐ کو درمیانی وسیلہ یا واسطہ قرار دیا جائے تو بدرجہا بہتر ہوگا

مرنے کے دوسرے یا تیسرے روز مولوی صاحبان نے ایک اور رسم ایجاد کی ہوئی ہے جسے عام زبان میں قل خوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کو ملا لوگ ایک خاص طریقہ سے ادا کرتے ہیں ۔ قرآن مجید کی خاص سورتیں اور خاص آیتیں پڑھی جاتی ہیں مولوی صاحب کے سامنے پہلے کچھ سامان رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد مولوی صاحب پڑھنا شروع کر دیتا ہے ۔ عراق سے واپسی کے بعد ایک عزیزہ کی موت کے دوسرے روز مجھے اس کی قل خوانی کی دعوت دی گئی ۔ میں نے ہرچند آثار آئمہ اور مذہب امامیہ سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن کہیں اس کا سراغ نہ مل سکا ۔ تو پھر میں نے خود جانے سے انکار کر دیا اور ان کو اس رسم کی ادائیگی سے باز آنے کی دعوت بھی دی ۔ لیکن چونکہ مولوی صاحبان نے مدت مدید سے اس کو ایجاد کیا ہوا ہے ۔ لوگوں کے خیالات کا رُخ بدلنا کار دارد ۔ کہتے ہیں ہماری ناک کٹ جائے گی ۔ لوگ کہیں گے بڑا نااہل تھا کہ رسم قل خوانی تک ادا نہ کر سکا ۔ اسی قل خوانی پر بعض مقامات پر ملا لوگ بہت کچھ وصول کر لیا کرتے ہیں ۔ میت کے ورثاء میت کے اکثر مرغوب خاطر اشیاء کو ملا صاحب کی نذر کر دیتے ہیں چنانچہ بعض رؤساء و امراء کے مرنے پر ان لوگوں کے گھر عید ہوا کرتی ہے ۔ کیونکہ انہیں ہزاروں کا مال وصول ہو جاتا ہے ۔ شاید یہ لوگ سمجھتے ہوں کہ اس طرز عمل یا مولوی کی اس قدر تواضع سے مرنے والے کے لئے کچھ فائدہ ہوگا لیکن یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے ۔

ہاں اگر میت کے لئے صدقات و خیرات کا ارادہ ہو ۔ تو مذہب اہلبیت کے طریقہ سے مجتہدین عظام کے فتاوی

کے مطابق عمل کرے۔ تاکہ کرنے والے کو بھی فائدہ ہو۔ اور جس کے لئے کیا گیا۔ اس کے لئے بھی سودمند ہو نہ خرچ ضائع ہو نہ ثواب باطل ہو۔ اس قسم کے طریقے ہندوؤں کے رسوم کے مقابلہ میں غیر امامی ملّاؤں نے کسبِ معاش کے لئے ایجاد کئے تھے۔ شیعہ علماء کی چونکہ کمی تھی۔ لہٰذا دیکھا دیکھی سے شیعہ عوام بھی انہی رسوم کے پابند ہوگئے اور انہی غیر امامی ملّاؤں سے رسوم مذکورہ اداکرواتے چلے آئے ہیں۔ اب شیعہ نیم خوان ملّاؤں نے جب ان لوگوں کی آمدنی پر نظر کی تو طبیعت للچا گئی۔ اور اسی طرزِ عمل کو اپنا کر کسبِ معاش کا ذریعہ بنالیا۔ حالانکہ ایسی کمائی ناجائز اور ان رسوم کا شرعی عنوان سے ادا کرنا بدعت اور حرام ہے۔ البتہ کفن پر جس قدر ممکن ہو قرآن کا لکھنا مستحب ہے۔

ترتیلِ قرآن

فی الکافی عن محمد بن عبداللّٰہ قال قلت لابی عبداللّٰہ۔ اَقْرَأُ الْقُرْآنَ فِیْ لَیْلَۃٍ قَالَ لَایُعْجِبُنِیْ اَنْ تَقْرَأَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ شَہْرٍ وفیہ۔ عن ابی بصیر انہ قال لابی عبداللّٰہ جُعِلْتُ فِدَاکَ اَقْرَأُ الْقُرْآنَ فِیْ شَہْرِ رَمضان فِیْ لَیْلَۃٍ فَقَالَ لَا قَالَ فَفِیْ لَیْلَتَیْنِ؟ قَالَ لَا قَالَ فَفِیْ ثَلٰثٍ؟ قَالَ ھَاءِ وَاَشَارَ بِیَدِہٖ ثُمَّ قَالَ یَا اَبَا مُحَمَّدٍ اِنَّ لِرَمَضَانَ حَقًّا وَحُرْمَۃً وَلَا یُشْبِھُہٗ شَیْئٌ مِنَ الشُّھُوْرِ وَکَانَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ یَقْرَأُ اَحَدُھُمُ الْقُرْاٰنَ فِیْ شَھْرٍ اَوْ اَقَلَّ۔ اِنَّ الْقُرْاٰنَ لَا یُقْرَأُ ھَذْرَمَۃً وَلٰکِنْ یُرَتَّلُ تَرْتِیْلًا وَ اِذَا مَرَرْتَ بِاٰیَۃٍ فِیْھَا ذِکْرُ الْجَنَّۃِ فَقِفْ عِنْدَھَا وَاسْئَلِ اللّٰہَ الْجَنَّۃَ وَاِذَا مَرَرْتَ بِاٰیَۃٍ فِیْھَا ذِکْرُ النَّارِ فَقِفْ عِنْدَھَا وَتَعَوَّذْ

کافی میں محمد بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا میں ایک رات میں ختم قرآن کرلیا کروں؟ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کہ ایک ماہ سے کم عرصہ میں تو قرآن پڑھے۔ نیز کافی میں ابوبصیر سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں عرض کی کہ میں آپ پر فدا ہوں۔ کیا ماہِ رمضان کی ایک شب میں ختم قرآن کرلیا کروں؟ فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کی۔ کیا دو راتوں میں؟ فرمایا کہ نہیں! میں نے پوچھا کیا پس تین شب میں؟ فرمایا ہیں (درست ہے) اور ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ پھر فرمایا۔ اے ابومحمد تحقیق ماہ رمضان کے لئے حق و حرمت ہے۔ دوسرا کوئی مہینہ اس کی مثل نہیں۔ جناب رسالتمآب کے صحابہ ایک ماہ یا اس سے کم میں ختم قرآن کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید کو جلد بازی سے نہیں بلکہ ترتیل سے پڑھنا چاہیئے۔ جب ایسی آیت سے گذرو کہ اس میں جنت کا ذکر ہو۔ تو وہاں رُک جاؤ اور اللہ سے جنت طلب کرو اور جب ایسی آیت سے گذرو۔ کہ اس میں دوزخ کا ذکر ہو۔ تو وہاں

بِاللّٰہِ مِنَ النَّارِ۔ — تفسیر جاؤ اور اللہ سے پناہ مانگو۔

وفیہ عن عبداللہ بن سنان قال سألت ابا عبداللہ عن قول اللہ عز وجل وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا قال قال امیرالمومنین وبینہ تبیینا ولا تھذہ ھذ الشعر ولا تنثرہ نثر الرمل ولکن فزعوا قلوبکم القاسیہ ولا یکن ھم احدکم اٰخر السورہ

نیز کافی میں عبداللہ بن سنان سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اللہ کے فرمان وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا (جس کا مطلب یہ ہے) کہ الفاظ کو صحیح اور واضح کر کے پڑھو۔ اشعار کی طرح بہت تیزی سے بھی نہ پڑھو اور بہت آہستہ کر کے ذرات ریگ کی طرح منتشر بھی نہ کرو لیکن اپنے سخت دلوں کو اس سے خوفزدہ کرو اور سورہ کے آخر تک پہنچنا ہی ملحوظ نہ ہو۔ بلکہ استفادہ مطلوب ہو۔

قال رسول اللہ زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ یَزِیْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا

جناب رسالتمآب نے فرمایا کہ قرآن کو خوبصورت آواز سے مزین کرو کیونکہ اچھی آواز قرآن مجید کے حسن کو زیادہ کرتی ہے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام قرآن کی ایسی ترتیل سے تلاوت فرماتے تھے کہ رہگذر رستہ پر رک جاتے تھے۔

بالجملہ:۔ ان احادیث کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں اتنی سست رفتاری بھی نہ ہو کہ جس طرح ریگ صحرا کے بکھرے ہوئے ذرات جس سے معانی قرآنیہ کے سمجھنے میں دشواری پیدا ہو جائے اور الفاظ و آیات کا باہمی ربط ٹوٹ جائے اور نہ اس قدر تیزی سے پڑھے کہ کچھ سمجھ نہ آسکے بلکہ ایسے متوسط طریق سے اور شستہ اور پُر اخلاص طریق پر الفاظ کی ادائیگی ہو کہ سخت ترین دلوں کو جھکا دے۔

نیز چونکہ تلاوت قرآن باطنی طور پر ذات احدیت سے مکالمہ کی حیثیت رکھتی ہے اور نہایت تیز کلامی یا بالکل الفاظ کو چبا چبا کر نکالنا جب عام مصاحبین کی باہمی گفتگو میں ناقابل برداشت غلطی متصور ہوا کرتی ہے تو مالک الملک کے سامنے اس قدر لاابالیانہ مظاہرہ انتہائی گستاخی یا کمال جرأت و بے باکی بلکہ تمسخر و استہزاء نہیں تو اور کیا ہے؟ البتہ لسانی مجبوریاں یا عام ناظرے خوان حضرات کی صلاحیتی کمزوریاں قابل عفو ضرور ہوں گی۔ کیونکہ ہر شخص اپنی استعدادی و امکانی حیثیت سے احکام شریعت کا مکلف ہے۔ لیکن بہرکیف بہت تیز پڑھنا تو بے اعتنائی ہی کا مظاہرہ ہے اور عمدی غلطی ہے۔ بعض لوگ اس کو اپنا کمال قرار دے کر فخریہ ایسا کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنا حضرات معصومین کی فرمائشات کے پیش نظر قطعاً قابل تحسین نہیں۔ اسی بناء پر معصوم نے ایک یا دو دن میں قرآن ختم کرنے کی اجازت نہیں دی اور ماہ مبارک رمضان کی اہمیت کے پیش نظر تین روز میں ختم کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ساتھ صحابہ کرام کی سیرت سے استشہاد بھی فرمایا کہ وہ ایک ماہ یا کچھ کم عرصہ میں ختم کیا کرتے تھے تاکہ کوئی شخص اپنے غلط رویہ کو صحابہ رسولؐ کے کردار کی طرف نسبت دے کر عوام کو دھوکا نہ دے سکے۔

اس مقام پر پہنچ کر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ ذاکرین و واعظین بلکہ عوام شیعہ میں ایک مشہور سا جملہ ہے اور عوام کے پختہ اعتقادات اس پر جمے ہوئے ہیں کہ حضرت امیرالمومنینؑ ایک رکاب سے دوسری رکاب تک قرآن ختم کرتے تھے چنانچہ شواہد النبوۃ سے بھی منقول ہے کہ حضرت ایک رکاب میں پاؤں رکھتے تو دوسری رکاب تک قرآن ختم کر دیتے تھے مولانا امیرالدین مرحوم نے "فلک النجاۃ" میں علم عمر کے عنوان کے تحت میں اسی حوالہ کا ذکر فرمایا ہے۔ پس روایات گذشتہ کی بنا پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ حضرت امیرالمومنین کی اس قدر تیز خوانی آیا موجب فضیلت ہے۔ کیا یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت کے قول و فعل آپس میں متضاد تھے؟ لہذا یہ چیز بجائے فضیلت و کمال کے تنقیص کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ تو اس کا جواب دو طریق سے دیا جا سکتا ہے ایک عقلی اور دوسرا نقلی۔

جواب عقلی تو یہ ہے کہ متکلم کا ہر کلام نہ مبنی بر حقیقت ہوتا ہے اور نہ ہر کلام میں مجازیت کا رنگ ہوتا ہے اہل عرف کے استعمالات میں مقامی حالات یا ماحول و معاشرہ کے وقتی رجحانات یا ان کے باہمی مکالمات میں لحاظ کردہ اصطلاحات کی بنا پر اگر کوئی غیر اہل لسان اور ناواقف ان کے الفاظ کے لفظی ترجمہ کو سمجھ لے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بس وہ زبان کا عالم ہو گیا کیونکہ ہر کلام کے رموز و حقائق اور اسرار و دقائق [illegible] اطلاع اس کلام کے اہل محاورہ کو ہو سکتی ہے۔

مثلاً عام استعمالات میں نہر یا دریا کی طرف روانی کی نسبت ہوتی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں پانی رواں ہوتا ہے نہ کہ دریا یا نہر۔ اسی طرح چراغ کی طرف جلنا منسوب ہے۔ حالانکہ تیل جلتا ہے ایک آدمی شربت پی کر کہتا ہے کہ میں بوتل پی گیا۔ و علی ہذا القیاس۔ جو شخص محاورات کے طریقہ اور اصطلاحات مقامیہ سے نابلد ہو گا اس کے لئے اس قسم کے جملات ایک معمۂ لاینحل ہو جائیں گے۔ لیکن واقف کار کے لئے کوئی دقت نہیں ہوا کرتی۔

اگر کہا جائے کہ میدان کارزار میں ایک شیر آستین الٹ کر لڑ رہا تھا تو کوئی ہوشمند اس سے مراد جنگی شیر نہ لے گا۔ بلکہ ایک شجاع مرد میدان ہی سمجھے گا اور اس میں شک نہیں کہ کلام کی خصوصیات کلام کے وقار اور [illegible] کا موجب ہوا کرتی ہیں۔ بنا بریں حضرت علیؑ کے ایک رکاب سے دوسری رکاب تک ختم قرآن کو اگر صرف ظاہر پر چھوڑ دیا جائے اور کسی خصوصیت کو ملحوظ نہ قرار دیا جائے تو دانشمندی نہ ہو گی۔ کیونکہ ہر کلام کے لئے مناسب [illegible] ضروری ہوا کرتا ہے۔

پس جس طرح دریا کا رواں ہونا محال تھا۔ لہذا ہم نے مراد پانی لے لیا۔ چراغ کا جلنا محال تھا۔ لہذا تیل مراد لیا۔ اسی طرح بوتل کا پینا محال تھا۔ لہذا شربت سمجھا اور شیر کی طرف آستین کی نسبت دیکھ کر مرد میدان مراد لے لیا۔ تو یہاں بھی چونکہ ظاہری معنی محال ہے۔ لہذا ہم کہیں گے کہ مراد اس سے یہ ہے۔

چونکہ بارشاد باری وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ علیؑ علوم قرآنیہ کا جامع ہے اور اس کو قرآن سے [illegible]

جو روح کو بدن سے ہے۔ بلکہ اس سے بھی مضبوط تر۔ کیونکہ روح اور بدن میں جدائی ممکن ہے اور حضرت علیؑ اور قرآن میں جدائی ناممکن ہے خود حضرت رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ۔ علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے (یعنی ان دونوں میں سے ایک کا رُخ ہوا اُدھر دوسرے کا رُخ ہوگا) نیز حدیث ثقلین میں بھی صاف طور پر موجود ہے (لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا الْحَوْضَ) یہ دونوں ہرگز آپس سے جُدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر اکٹھے پہنچیں گے۔

اگر قرآن کو بدن قرار دیا جائے تو علیؑ اس کی رُوح ہے اور علیؑ کو بدن قرار دیا جائے تو قرآن اس کی رُوح ہے قرآن کی ہر ہر آیت میں علیؑ کے فضائل و کمالات کے جلوے ہیں اور علیؑ کی ہر گفتار و کردار میں قرآن کی آیات کا پرتو ہے قرآن کی ہر ہر آیت حضرت علیؑ کے خدوخال کی آئینہ دار ہے اور علیؑ کا ہر خدوخال آیاتِ قرآنیہ کا مظہر ہے۔

گویا قرآن کی ہر سورت کی ترجمان علیؑ کی سیرت ہے اور علیؑ کی سیرت کا بیان قرآن کی ہر ہر سورت ہے۔ لہذا علیؑ کی ہر نقل و حرکت ہر قول و فعل آیاتِ قرآنیہ کی نقل و حرکت کے مترادف ہے۔ اور علیؑ کا تصرف و تقلب قرآن کریم کا تقلب و تصرف ہے جس طرح روح کا تصرف بدن کے ذریعے سے اور بدن کا تصرف روح کی وساطت سے ہوتا ہے اور ہر دو کے تصرفات ایک دوسرے کی طرف منسوب بھی ہو سکتے ہیں تو بنا بریں علیؑ و قرآن کے جملہ حرکات و سکنات لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا حضرت علیؑ کی ایک قدم سے دوسرے قدم تک کی حرکت پورے کلام اللہ کی الحمد سے والناس تک کی حرکت ہوا کرتی تھی۔ پس علیؑ کا ایک رکاب میں قدم رکھ کر دوسری رکاب تک منتقل ہونا قرآن مجید کا مکمل انقلاب تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیان گزشتہ کی تطبیق سے علیؑ کا ہر اشارہ کلام اللہ کا اشارہ تھا وہ علیؑ کا ہر سانس قرآن مجید کا پورا دور تھا۔

دوسرا جواب از منقولات۔ وہ وہ ہے جو علامہ امینی نے الغدیر ج ۵ میں ذکر کیا ہے۔

اخرج البخاری فی صحیحه عن ابی هریرة یرفعه قال صلی الله علیه وسلم خُفِّفَ عَلٰی دَاوٗدَ القرآن فَکَانَ یَأْمُرُ بِدَابَّتِهٖ فَتُسْرَجُ فَیَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ اَنْ تُسْرَجَ

صحیح بخاری[1] میں ابوہریرہ سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ حضرت داؤد پر قرآن (زبور) کا پڑھنا آسان تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی سواری پر زین رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ پس زین رکھنے سے پہلے قرآن کو یعنی (زبور) کو ختم کر لیا کرتے تھے۔

وقال القسطلانی فی شرحه وفیه اِنَّ الْبَرَکَةَ تَقَعُ فِی الزَّمَنِ الْیَسِیْرِ حَتّٰی یَقَعَ فِیْهِ الْعَمَلُ الْکَثِیْرُ وَقَالَ قَدْ دَلَّ هٰذَا الْحَدِیْثُ عَلٰی اَنَّ اللّٰهَ یَطْوِی الزَّمَانَ

قسطلانی نے اس کی شرح[2] میں کہا ہے کہ تھوڑے زمانہ میں بعض اوقات برکت داخل ہو جاتی ہے۔ پس اس میں بڑا کام انجام پا سکتا ہے اور کہا کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے۔ کہ جس طرح خدا اپنے بندوں کے لئے زمین کو سمیٹ لیتا ہے۔

---

[1] بخاری ج ۱ باب قوله تعالیٰ واتینا داؤد زبورا و ج ۲ باب احادیث الانبیاء [2] ارشاد الساری شرح صحیح بخاری ج ۸

لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ كَمَا يَطْوِى الْمَكَانَ لَهُمْ۔ اسی طرح طی زمان[1] بھی کر دیتا ہے۔

باتفاق جمیع اہلِ اسلام جناب رسالتمآبؐ صرف حضرت داؤد ہی نہیں بلکہ تمام گذشتہ انبیاء سے افضل ہیں اور حضرت امیرالمومنینؑ بنص آیت مباہلہ نفسِ رسول ہیں تو ان کیلئے زمین کا لپیٹ جانا یا زمانہ کا سمٹ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

حضرت امیرالمومنینؑ کی ایک ہزار رکعت نماز پر اعتراض

اس باب میں علامہ عبدالحسین امینی مدظلہ کی عبارت کے اُردو ترجمہ پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ بعض مقامات پر حسب ضرورت اصل عبارت کو نقل کر دیا گیا ہے۔ بہرکیف ان کی تمام بیان کردہ تفصیلات کو من وعن نقل کرنے کی بجائے اختصار کے پیش نظر ضروری حصہ کو ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف نے "الغدیر جلد پنجم میں لکھا ہے کہ حضرت امیرالمومنینؑ اور حضرت امام حسینؑ اور ان کے شہزادے حضرت زین العابدینؑ میں سے ہر ایک کے متعلق نقل متضافر سے ثابت ہے۔ کہ وہ ہر شبانہ روز ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے اور اس پر تمام علمائے اسلام متفق رہے۔ یہاں تک کہ ابن تیمیہ کا دور آیا تو اس نے معصومینؑ کے اس عمل پر اعتراض کیا اور طعن آور ہوا اور اس کے اعتراض کے تین پہلو ہیں۔

(۱) جو شخص ایک ہزار رکعت کو ان کے لئے فضیلت قرار دے وہ جاہل ہے اس میں قطعاً کوئی فضیلت نہیں۔ کیونکہ جناب رسالتمآبؐ رات کو تیرہ رکعت سے زیادہ نماز نہیں پڑھتے تھے اور دن کو بھی چند رکعات مخصوصہ سے تجاوز نہیں فرماتے تھے نہ تمام شب مصروفِ عبادت رہتے تھے اور نہ دن کو ہمیشہ روزہ سے رہتے تھے تو دائمی طور پر ہمیشہ ہر رات کا عبادت میں بسر کرنا کیا فضیلت رکھتا ہے؟ یہ چیز مستحب تو درکنار مکروہ ہے۔ بلکہ خلاف سنّت رسولؐ ہے۔

(۲) دن اور رات میں دیگر واجبات کے ادا کرنے کے علاوہ خورد و نوش کے ضروریات سے فراغت پانے کے بعد ایک ہزار رکعت نماز کا وقت کہاں رہتا ہے؟ بہت تھوڑے وقت میں ایک ہزار رکعت کا سمانا محال ہے۔

(۳) اگر بالفرض جلد بازی کے ساتھ وقت کے اندر اتنی نماز کو پورا کر بھی لیا جائے تو وہ نماز صرف ٹھونگے مارنے کے برابر ہوگی۔ اس میں خشوع و خضوع کہاں ہوگا اور بغیر خشوع و خضوع کے کسی عبادت کی کوئی قیمت نہیں۔

اختتام کلام پر کہا۔ البتہ تہجد کے ساتھ شب بیداری اور ایک رکعت میں ختم قرآن حضرت عثمان کے متعلق ثابت ہے۔ لہٰذا ان کا تہجد اور تلاوتِ قرآن غیروں سے زیادہ وزنی ہے۔ (منہاج السنۃ لابن تیمیہ ج۲ ص۱۱۹)

---

[1] یعنی زمانے کو بھی سمیٹ لیتا ہے۔

علامہ موصوف نے متعدد جوابات پیش کئے ہیں۔

قولِ رسول[1] (۱) اَلصَّلٰوۃُ خَیْرُ مَوْضُوْعٍ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَسْتَکْثِرَ فَلْیَسْتَکْثِرْ — نماز اچھا موضوع ہے۔ جو جس قدر زیادہ پڑھ سکے پڑھے

(۲) اَلصَّلٰوۃُ خَیْرُ مَوْضُوْعٍ مَنْ شَاءَ اَقَلَّ وَمَنْ شَاءَ اَکْثَرَ — نماز اچھا موضوع ہے جو چاہے تھوڑی پڑھے جو چاہے زیادہ پڑھے۔

(۳) یا انس اَکْثِرِ الصَّلٰوۃَ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ — اے انس نماز شب و روز زیادہ پڑھی کرو۔

(۴) مَنْ اَکْثَرَ صَلٰوتَہٗ بِاللَّیْلِ حَسُنَ وَجْھُہٗ بِالنَّھَارِ — جو شخص رات کو زیادہ نماز پڑھے گا دن کو اس کا چہرہ زیادہ خوبصورت ہوگا۔

(۲) **فعلِ رسول** صح عن البخاری والمسلم اِنَّہٗ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ حَتّٰی تَنْفَطِرَ قَدَمَاہُ وفی روایۃ لھما والترمذی۔ اَنْ کَانَ النَّبِیُّ لَیَقُوْمُ اَوْ لِیُصَلِّیَ حَتّٰی تَرِمَ قَدَمَاہُ اَوْ سَاقَاہُ۔ — بخاری و مسلم سے صحیح میں منقول ہے کہ حضورؐ رات کو اس قدر نماز میں قیام فرماتے تھے کہ قدم مبارک پھول جاتے تھے نیز بخاری و مسلم و ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نماز میں اسقدر قیام فرماتے تھے یا (نماز پڑھتے تھے) کہ قدم (پنڈلیاں) ورم زدہ ہو جایا کرتی تھیں۔

فعلِ اکابر اہلِ سنّت اہل سنت کے امام اعظم کے متعلق شیخ عبدالحی حنفی نے کتاب اقامۃ الحجۃ صد۹ پر لکھا ہے۔ کہ وہ ہر رات میں تین سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ پس ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے کہ رستہ میں سُنا ایک عورت دوسری سے کہہ رہی تھی کہ یہ شخص ہر رات پانچسو رکعت نماز پڑھا کرتا ہے۔ امام صاحب نے سُن لیا اور اس کے بعد ہر رات پانچسو رکعت کا پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر ایک دفعہ لڑکوں سے ایک دوسرے کو کہتے سُنا۔ کہ یہ شخص ہر رات ایک ہزار رکعت پڑھتا ہے اور سوتا نہیں پس اس کے بعد انہوں نے ایک ہزار رکعت کا پڑھنا شروع کر دیا اور راتوں کو سونا چھوڑ دیا۔

اسی طرح روض الاخبار ج ا صد۹ میں رابعہ (بصریہ) کا ہر شب ایک ہزار رکعت پڑھنا مذکور ہے۔

روضۃ الناظرین صد۴ میں حسن بصری کے متعلق ہے کہ وہ چالیس برس برابر صبح کی نماز عشار کے وضو سے پڑھتے رہے۔

مناقب ابو حنیفہ للخوارزمی ج ا صد۲۳۲ میں ابو حنیفہ کا چالیس سال تک عشار کے وضو سے صبح کی نماز پڑھنا مذکور ہے۔

۳۔ معنیٔ سنّت مستدرک حاکم میں جناب رسالتمآبؐ کا فرمان موجود ہے۔

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین۔ تمہارے اوپر میری اور میرے خلفار کی سنّت پر چلنا ضروری ہے۔

نیز ماہ رمضان مبارک میں تراویح کی سنّت عمر نے جاری کی ۱۴ھ میں (اس سے پہلے ابوبکر اور جناب رسالتمآبؐ کے زمانہ میں نہیں تھیں) **خلاصۃ الکلام**۔ علامہ امینی نے پہلے اعتراض کا جواب پہلے قول رسولؐ سے دیا کہ حضورؐ کا فرمان بذریعہ تواتر منقول ہے کہ فرمایا کرتے تھے۔ نماز اچھا موضوع ہے۔ جو جس قدر چاہے پڑھ سکتا ہے۔

---

[1] حلیۃ الاولیاء ج ا [2] کشف الخفاج ۲ صد۳۰ [3] مستدرک حاکم جلد۲ [4] اہلسنت کی کتب صحاح میں یہ چیز مسلم ہے۔ سیوطی نے اسے اولیات عمر میں لکھا ہے ۱۲ منہ

پھر خود حضور کا عمل پیش کیا کہ وہ بنفسِ نفیس ہر شب میں اس قدر مصروفِ نماز رہتے تھے کہ پاؤں مبارک پر ورم آجایا کرتے تھے اس کے بعد اکابر اہلِ سنت مثلاً ابو حنیفہ وغیرہ کی لمبی لمبی نمازوں کو پیش کیا اور ان بزرگوں کی ایک لمبی فہرست قائم کردی میں نے اختصار کے پیشِ نظر ترک کردی ہے ان کے عمل کو کسی نے خلافِ سنت قرار نہیں دیا۔

آخر میں سنت کے معنی کی وضاحت کردی کہ خلفاء راشدین کی سنت بھی سنت ہے تو حضرت علیؑ کا فعل کیوں خلافِ سنت قرار پایا؟

اقول :- عام دستور ہے کہ جس سے رشتۂ محبت قائم ہوجاتا ہے اس کا ہر قول و فعل محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے چنانچہ مشہور مقولہ ہے حُبُّ الشَّیْءِ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ (کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا بہرہ کردیتی ہے) اور جس سے نفرت یا عداوت ہو اس کا ہر قول و فعل بھی نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے محبت کی صورت میں محبوب کے صاف و صریح طور پر غلط افعال تاویل کے قابل قرار دیئے جاتے ہیں اور ان کو بہر کیف اچھائی پر ہی محمول کیا جاتا ہے اور نفرت کی صورت میں جس سے نفرت ہو اس کے اچھے کردار میں جرح و قدح کے راستے تلاش کرکے ہر ممکن طریق سے اسے بدنما ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ اور ان کی اولاد طاہرینؑ کے ساتھ دشمنانِ اہلبیت کا بعینہٖ یہی رویّہ ابتداء سے آجتک چلا آیا ہے مقام زیرِ بحث میں نہ حضرت رسالتمآبؐ کے ارشاداتِ عالیہ کی پرواہ ہے اور نہ آنحضرتؐ کا ذاتی کردار پیشِ نظر ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ حضرت علیؑ کی یہ منقبت کسی طریقہ پر بدعت کے رنگ میں پیش ہو تاکہ ان کی فضیلت کا ڈنکا جو چہار دانگ عالم میں بج رہا ہے کسی طرح مدھم پڑجائے لیکن

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے ۔۔۔۔ وہ شمع کیوں بجھے جسے روشن خدا کرے

حیرت یہ کہ صرف حضرت علیؑ کی تنقیص شان کے لئے جناب رسالتمآبؐ کی عبادتِ شب کو صرف تیرہ رکعت میں منحصر کردیا حالانکہ کتبِ صحاح میں ان کا بکثرت عبادت کرنا موجود ہے حتیٰ کہ قدم مبارک ورم کرجاتے تھے اور خداوند کریم کی طرف سے بھی عبادت کے کم کرنے کا حکم آگیا۔ ارشاد ہوا کہ رات کو قیام تھوڑا کرو۔ میں نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم مشقت میں پڑجاؤ اور پھر اپنے اکابر کے متعلق جو کچھ کوئی نقل کرے اس پر کوئی اعتراض نہیں اور یہ صرف اس لئے کہ وہ اپنے ہیں اور ان سے رشتۂ محبت قائم ہے پس نہ ان کا فعل خلافِ سنت اور بدعت ہے نہ محال ہے اور نہ منافی خشوع و خضوع ہے بخلاف اس کے آلِ محمدؐ کی عبادت بدعت بھی ہے محال بھی اور منافی خضوع بھی، اگر وجۂ فرق پہ غور کیا جائے تو صرف یہی ہے کہ چونکہ ان سے محبت ہے لہٰذا ان کا کوئی فعل قابلِ جرح نہیں اور ان سے چونکہ عداوت ہے لہٰذا ان کا ہر عمل و فعل قابلِ جرح ہے علاوہ ازیں اہلسنت کے نزدیک تمام صحابہ کا قول و فعل سنت کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً خلفائے راشدین کا قول و فعل۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اپنے مقام پر تمام صحابہ کا کردار بطور حجیت کے پیش ہوا کرتا ہے لیکن حضرت علیؑ کے فعل کو بدعت کہتے ہوئے نہ ان کی صحابیت کا لحاظ ہے اور نہ خلافت کا خیال ہے یہ عداوت نہیں تو کیا ہے؟ ابنِ تیمیہ کے اعتراض کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ایک ہزار رکعت

شب و روز میں ناممکن ہے اس کے متعلق علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ عدم امکان کا دعویٰ نہ صرف طبیعت کی سستی اور عبادت کی طرف عدم رغبت کی وجہ سے ہے کیونکہ جس نے عمر بھر عبادت سے دلچسپی نہ لی ہو، عاملین کے عمل اور عابدین کی عبادت سے دُور تک کا واسطہ بھی نہ ہو وہ ایسی باتوں کو سُن کر ناممکن کہہ دیتا ہے لیکن جس نے اطاعتِ خُدا کی شیرینی کا ذائقہ چکھ لیا ہو اور عبادت کی لذات سے بہرہ اندوز ہو چکا ہو، اس کے لئے یہ باتیں عام عادی معلوم ہوتی ہیں، نہ ان کی طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے اور نہ انہیں مشکل محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد علامہ امینی نے اکابر اہلسنت کے اوراد وظائف کا شمار کرتے ہوئے ایک طویل فہرست قائم کر دی جنمیں سے ایک ایک کے متعینہ وظیفہ و ورد کا اگر جائزہ لیا جائے تو حضرت علیؑ اور ان کی اولادِ امجاد کی ایک ہزار رکعت کے اندازہ سے کہیں زیادہ پڑتا ہے اور بایں ہمہ ان کے اس فعل کو نہ کسی نے بدعت کہا اور نہ محال اور نہ منافی خشوع۔ مثلاً ابوحنیفہ کے متعلق مناقب خوارزمی سے نقل کیا کہ وہ جب نمازِ جمعہ کے لئے آتے تو قبل از نمازِ جمعہ بیس رکعت نماز پڑھتے تھے جن میں ختم قرآن کیا کرتے تھے۔ حلیۃ الاولیا رح سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رات کی نماز میں ایک رکعت کے اندر قرآن ختم کیا کرتے تھے۔

مناقب ابوحنیفہ القاری سے نقل کیا ہے کہ تیس سال متواتر ہر رات انہوں نے ایک رکعت میں قرآن ختم کیا۔

ان سے بھی بہت بلند پروازیاں کی گئیں ہیں حتّٰی کہ بعض کے متعلق لکھا ہے کہ ایک طواف بیت اللہ یا اس کے بھی ایک ہی چکّر میں پُورا قرآن ختم کیا کرتے تھے اور بعض کے متعلق شب و روز میں ستر ہزار ختم قرآن کرنا ذکر کیا گیا ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔ ان خرافات کے نقل کرنے والے ان کو فیضِ ربانی اور عنایت رحمانی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن آلِ محمدؐ کے لئے ان توجیہات کا دروازہ بالکل بند ہے۔ علامہ موصوف نے حضرت علیؑ کی نماز کا ان کے وظائف سے یوں موازنہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ ایک ہزار رکعت نماز کے کل کلمات تراسی ہزار بنتے ہیں کیونکہ پہلی رکعت میں بطریق نماز شیعہ تکبیرۃ الاحرام سے لے کر آخری سجدہ تک اٹھتر کلمات ہیں تو ہزار رکعت میں اٹھتر ہزار ہوئے لیکن ہر دوسری رکعت تکبیرۃ الاحرام سے خالی ہوا کرتی ہے۔ لہذا ایک ہزار کلمہ کم ہو گیا تو اٹھاٹھ ہزار کلمات ہو گئے اور ہر دوسری رکعت میں تیس کلمات تشہد و سلام کے ملانے سے پندرہ ہزار کلمات کا اضافہ ہو گیا تو کل تراسی ہزار کلمات ہو گئے۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کے کلمات کی تعداد ستتر ہزار نو سو تینتالیس ہے۔ لہذا ایک ہزار رکعت کے کل کلمات سے پانچ ہزار ستاون زیادہ ہوئے۔ اندازہ فرمائیے جن سے محبت ہے ان کی ایک رکعت میں جو بعض حصہ شب یا روز میں ادا ہو، دیگر اذکار واجبہ و مستحبہ کے علاوہ ۷۷۹۴۳ کلمات کی گنجائش ہے اور یہ نہ محال ہے نہ خلاف سنتِ رسولؐ ہے اور نہ منافی خشوع و خضوع ہے۔

اور جن سے عداوت ہے ان کے لئے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں ۸۳۰۰۰ کلمات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس سے زیادہ کج بحثی اور بے راہ روی اور کیا ہو سکتی ہے؟ پھر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے کہتے ہیں کہ ہمیں اہلبیت سے بڑی محبت ہے (وَاللّٰہُ خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ) نیز ابنِ تیمیہ نے اختتامِ کلام پر جو حضرت عثمان کا نمازِ تہجد کی ایک رکعت میں ختم قرآن کا دعویٰ کیا ہے اسے علیؑ کی دشمنی نے سوچنے ہی نہیں دیا کہ جو تیرِ اعتراضات حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کی عبادت پر وارد کئے تھے

وہی یہاں پر بھی وارد ہیں کیونکہ یہ عمل نہ تو سنتِ رسولؐ ہے کیونکہ انہوں نے کبھی ایک رکعت میں ختم قرآن نہیں کیا تھا اور نہ ممکن ہے کیونکہ یہ رکعت یا تو مغرب و عشاء کے درمیان ہوگی اور یا عشاء اور صبح کے درمیان ہوگی۔ ہر دو صورتمیں نطاقِ وقت سے عمل زیادہ ہے اور بفرضِ وقوع بحالت تیز رفتاری خشوع و خضوع نہوگا۔ لہٰذا پڑھنا بے فائدہ علاوہ ازیں غزالیؒ[1] اور نازلی[2] نے عثمان کا شمار ان صحابہ سے کیا ہے جو ہفتہ میں قرآن ختم کیا کرتے تھے نیز بروایت عبداللہ بن عمر[3] جناب رسالتمآبؐ نے ایک ہفتہ سے زیادہ جلدی قرآن ختم کرنے سے منع فرمایا[4] ہے۔ انتہیٰ ما افادہٗ

قرآن مجید کی سات قرائتیں

اکثر علماء کے نزدیک قاریٔ قرآن سات تھے اور ان میں سے ہر ایک کی قرأت بھی جُدا جُدا ہے اور وہ یہ ہیں ابو عمرو کسائی حمزہ ابن عامر نافع ابنِ کثیر اور عاصم۔ بعض علماء نے ابو یعقوب ابو جعفر طبری اور ابی بن کعب کا اضافہ کرکے کل قاریوں کی تعداد دس بتلائی ہے۔ ان کی ساتوں قرأتوں کے متعلق بعض علمائے اعلام فرماتے ہیں کہ یہ قرائتیں حضرت رسالتمآبؐ سے بالتواتر منقول ہیں چنانچہ علمائے محققین میں سے شہید ثانیؒ اور محققِ ثانی اور دیگر بعض اکابر امامیہ کی طرف یہی قول منسوب ہے اور اکثر علمائے امامیہ تواترِ قرأت کے انکاری ہیں۔ چنانچہ شیخ طوسی ابنِ طاؤس محدث بحرانی اور سید نعمت اللہ جزائری وغیرہ کی طرف یہی قول منسوب ہے اور ادلہ عقلیہ و نقلیہ دوسرے قول کی موید ہیں۔ پہلے قول کے لئے متعدد دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔

۱۔ دعویٰ اجماع (تمام امت کا اتفاق ہے) کہ قرائتیں سات ہیں۔

۲۔ عادت مقتضی ہے کہ یہ قرائتیں صحیح طور پر منقول ہوئی ہوں کیونکہ قرآن مجید کے حفظ اور ضبط کے متعلق ابتدائے اسلام سے آج تک جو اہتمام رہا ہے اگر یہ قرائتیں ابتداءً ثابت نہ ہوتیں تو بعد میں ان کے پیدا ہونے کا تو امکان ہی نہیں کیونکہ اگر بعد کی ایجاد ہوتی تو پہلے ہی سے تردید کردی گئی ہوتی اور ان کے خلاف ایک بڑا ہنگامہ اٹھا ہوتا۔

۳۔ حدیث میں ہے اِنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ كُلُّهَا شَافٍ كَافٍ یعنی قرآن سات حرفوں پر اترا ہے جن میں سے ہر ایک کافی و شافی ہے اور حرف سے مراد قرأت ہے۔

۴۔ بروایت خصال رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ اَتَانِیْ آتٍ مِنَ اللّٰهِ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكَ اَنْ تَقْرَاَ الْقُرْاٰنَ عَلٰی

---

[1] احیاء العلوم [2] تحفۂ بنیۃ الاسرار [3] صحیح بخاری و مسلم [4] جامع قرآن اور جمع قرآن میں اختلاف کی بحثوں میں تفصیلاً ثابت ہوگا کہ حضرت عثمان حافظِ قرآن نہیں تھے پھر جب وہ حافظ ہی نہیں تھے تو ایک رکعت میں ختم قرآن کا دعویٰ کیا معنی رکھتا ہے؟ مؤلف

حَرْفٍ وَاحِدٍ فَقُلْتُ يَا رَبِّ وَسِّعْ عَلٰى اُمَّتِیْ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَامُرُكَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ

ترجمہ میری طرف خدا کی جانب سے آنے والا (ملک) آیا اور کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ قرآن کو ایک حرف (قرأت) سے پڑھو میں نے عرض کی اے اللہ میری امت پر توسیع کر تو (ملک نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ قرآن کی سات قرائتیں ہیں۔

ان کے علاوہ اور دلیلیں بھی ذکر کی گئیں لیکن سب سے مضبوط اور محکم یہی ہیں۔ یہ سب دلیلیں قابل رد ہیں اور ان کے جوابات یہ ہیں۔ پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ دعویٰ اجماع ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ اگر اجماع ہوتا تو علمائے محققین کی ایک بڑی جماعت مخالف نہ ہوتی۔ دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ سب قرائتیں تواتر سے منقول ہوتیں تو ہر قاری دوسرے کی قرأت کی تردید نہ کرتا حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور ہر قاری اپنی مخصوص قرأت کے ماسوا دوسری قرأتوں کو غلط قرار دیتا ہے معلوم ہوا کہ یہ اختلاف قاریوں کی ذاتی رائے کے اختلاف کی وجہ سے ہی ہے۔ تیسری اور چوتھی دلیل کے کئی جوابات دیئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ سند کے اعتبار سے ان دونوں حدیثوں کی صحت ثابت نہیں۔

۲۔ اگر تسلیم کر لی جائیں تو حرف سے مراد قرأت نہیں بلکہ لغت ہے یعنی قرآن عرب کی سات لغتوں میں اُترا ہے اور ابنِ اثیر سے بھی یہی منقول ہے۔

۳۔ ممکن ہے حرف سے مراد قسم ہو۔ چنانچہ حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ قرآن سات قسموں پر اترا ہے جن میں سے ہر ایک کافی اور شافی ہے اور وہ سات یہ ہیں۔ امر نہی۔ زجر۔ ترغیب۔ ترہیب۔ مثل۔ قصص۔

۴۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سات حرفوں سے سات بطن مراد ہوں جیسا کہ روایاتِ کثیرہ میں وارد ہے۔

ان جوابات کے علاوہ حضرات معصومینؑ کی طرف سے سات قرأتوں کی صریح الفاظ میں نفی موجود ہے چنانچہ کافی میں ہے۔

عن الفضيل بن يسار قال قلت لابی عبد الله اِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ الْقُرْاٰنَ نَزَلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَقَالَ كَذَبُوْا اَعْدَاءُ اللّٰهِ لٰكِنَّهٗ نَزَلَ عَلٰى حَرْفٍ وَاحِدٍ مِنْ عِنْدِ الْوَاحِدِ

فضیل بن یسار سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سات قرأتوں پر اُترا ہے۔ آپ نے فرمایا دشمنانِ خدا جھوٹے ہیں بلکہ وہ تو ایک کی طرف سے اترا ہے۔ اور ایک ہی قرأت پر اُترا ہے۔

وفيه عن زرارة عن ابی جعفر قَالَ اِنَّ الْقُرْاٰنَ وَاحِدٌ نَزَلَ مِنْ عِنْدِ الْوَاحِدِ وَلٰكِنَّ الْاِخْتِلَافَ يَجِيْءُ مِنْ قِبَلِ الرُّوَاةِ

نیز بروایت زرارہ امام محمد باقرؑ سے منقول ہے آپ نے فرمایا تحقیق قرآن ایک ہے ایک کی طرف سے اترا ہے لیکن اختلاف راویوں کی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے۔

ان دونوں روایتوں میں سے پہلی حسن اور دوسری صحیح ہے۔ لہٰذا ان کو پہلی حدیثوں پر سنداً بھی ترجیح حاصل ہے اور توجیہات و قرائن بھی اس کی تائید کرتے ہیں پس یہی قول زیادہ قوی اور مضبوط ہے۔

آئمہ طاہرینؑ سے منقول ہے کہ ان قرأت مختلفہ میں سے ہر قرأت کے مطابق پڑھنا جائز ہے لیکن احتیاط اس میں ہے کہ عربی زبان کے

مسلمہ قواعد کے خلاف اگر کوئی قول ہو تو اس سے اجتناب کیا جائے اور نماز میں بھی اسی بات کو ملحوظ رکھئے۔ اسی طرح امالہ ادغام و اشمام اور وقف وغیرہ میں بھی متابعت ضروری نہیں بلکہ صرف قواعد عربیہ کی رعایت کافی ہے۔ البتہ سات قاریوں کے اقوال سے جدا قول پیدا کرنا بھی گو قواعد کے موافق ہو خلاف احتیاط ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

اِعجازِ قرآن

قبل اس کے کہ قرآن مجید کا معجزہ ہونا ثابت کیا جائے۔ معجزہ کی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے اور اس کے سمجھنے کیلئے محال کی اقسام میں فرق معلوم کرنا لازمی ہے محال کی چار قسمیں ہیں۔ محال ذاتی، محال عقلی، محال شرعی اور محال عادی۔

محال ذاتی وہ ہے جس کی ذات عدم کی مقتضی ہو جیسے شریک باری عز اسمہ (خدا کا شریک)

محال عقلی وہ ہے جس کے وجود سے اس کا عدم لازم آئے۔ مثلاً اجتماع ضدین یا دور وتسلسل وغیرہ

محال شرعی: کسی شے کا ایک شرعی خصوصیت سے الگ ہو کر بغیر تصرف شارع کے دوسری شرعی خصوصیت کا حامل ہو جانا۔ مثلاً آب مضاف کا مضاف ہوتے ہوئے مطہر ہونا۔

محال عادی: اشیاء موجودہ کا عام عادی دستور کو ترک کرکے ایک غیر متوقع شکل یا حالت میں منصۂ شہود پہ آنا۔

محال ذاتی اور محال عقلی قطعاً وقوع پذیر نہیں ہو سکتے بلکہ وہ حیطۂ مقدوریت سے باہر ہیں اور جو چیز مقدوریت کے دائرہ سے خارج ہو اس سے معجزہ وکرامت کا تعلق نہیں ہوا کرتا اور محال شرعی شارع مقدس کے تصرفات سے ممکن بن جاتا ہے لیکن اس کو نسخ کہا جاتا ہے پس معجزہ کا تعلق آخری قسم سے ہے یعنی ایک ممکن ذاتی کا (جو عادتاً محال ہو) غیر عادی صورتیں بحکم خدا کسی نبی ورسول یا اولی الامر کی دعا یا برکت سے ظہور پذیر ہونا معجزہ کہلاتا ہے اور معجزہ کے وقوع کی کئی صورتیں ہیں۔

۱۔ بغیر اسباب ظاہریہ اور بغیر مادہ معہودہ کے کسی چیز کا معرض وجود میں آنا۔ جیسے ناقہ حضرت صالح کا پہاڑ سے پیدا ہونا۔

۲۔ مادہ ظاہریہ سے باعتبار اسباب ظاہریہ کے استعداد حیات ختم ہونے کے بعد دوبارہ استعداد کا آجانا جیسے احیائے موتی

۳۔ موجودات عالم میں سے کسی موجود کے فعلی مزاج کو دوسرے موجود کے فعلی مزاج سے بدل دینا مثلاً مزاج جماد کو مزاج حیوان سے بدلنا۔ جیسے عصا سے سانپ یا مزاج حیوان کو مزاج جماد سے بدل دینا جیسے نگاہِ غضب سے کسی کافر کے اعضاء کو کسی لکڑی کی طرح خشک کر دینا یا مزاج جماد سے مزاج نبات بدلنا جیسے عصا کا درخت بن کر ثمر آور ہونا اور پھر اپنی حالت سابقہ پر عود کر آنا یا ایک نوع جماد کو دوسری نوع سے بدلنا جیسے سنگریزوں کا جواہر بن جانا یا جواہر کا ٹھیکریاں بن جانا۔

۴۔ موجودات عالم میں سے کسی شے سے تدریجیہ منازل طے کئے بغیر پہلی منزلوں میں آخری مراتب کے اثرات کا ظاہر ہونا جیسے

بچپنے میں حضرت عیسیٰؑ کا کلام کرنا یا لوہے کا حضرت داؤد کے لئے نرم ہونا۔

۵۔ کسی موجود کے نظامِ فعلی کو خلافِ توقع تبدیل کرنا۔ جیسے شق القمر۔ ردّ الشمس اور نزول النجم

۶۔ کسی موجود کے مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے مافوق موجود کے آثار کا ظاہر ہونا جیسے بساطِ سلیمانی کا پرواز۔

۷۔ شیئ کی موجودہ استعداد میں تغیر واقع کئے بغیر غیر معقول انداز میں اس کے اجزاء کو ترتیب دینا جیسے آیاتِ کلام اللہ

۸۔ موجودہ استعداد و قوت کے ماتحت کسی انسان سے مافوق العادۃ آثارِ غریبہ کا ظہور جیسے اخبار گذشتہ و آئندہ بلا تعلیم و تعلم اور بغیر حسابات متعینہ کے۔

۹۔ مدارجِ ارتقاء میں بغیر تدریج کے ادنیٰ سے اعلیٰ تک پہنچنا یا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف پلٹنا جیسے بچے کا جوان یا بڈھا ہو جانا یا جوان و بوڑھے کا بچہ ہونا یا بوڑھے کا جوان ہو جانا۔

۱۰۔ صنفی تبدیلی جیسے مرد کا عورت، یا عورت کا مرد کر دینا یا پھر ان کا اپنی اپنی حالت پر پلٹ جانا۔

غرضیکہ موجودہ عادی رفتار کا بغیر اسباب ظاہریہ کے اس طرح غیر معقول طور پر انقلاب پذیر ہونا کہ اس کی تہہ تک رسائی عقولِ انسانیہ اور افکارِ بشریہ کے بس سے باہر ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے امور یعنی جو بصورتِ معجزہ منظرِ عام پر آتے ہیں اگرچہ ظاہراً خلافِ توقع اور بغیر علل واسباب ظاہریہ کے صدور پذیر ہوتے ہیں۔ آیا واقع میں بھی علل و اسباب سے بے نیاز اور خلافِ توقع ہوتے ہیں یا ان کے لئے واقع میں اسباب ہوا کرتے ہیں لیکن ہمیں علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کو خلافِ توقع کہہ دیتے ہیں؟

اب اس بات میں الجھنا اور اس کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرنا ہمارے لئے یقیناً نتیجہ خیز نہ ہوگا کیونکہ ہماری بشری صلاحیتیں جب ماوراء البشریت کا ادراک نہیں کر سکتیں تو اس کے متعلق کوئی اٹل نظریہ قائم کرنا صاف و صریح نااندیشی ہے اور ایسا ہے جیسے منقولات کو نہ سمجھ سکنے والے کا دخل در معقولات مثال کے طور پر ایک کمسن بچہ جب اس کا ذہن ابتداء میں کسی حد تک ظاہری دنیا سے تعلق قائم کر سکتا ہے اب اس کے سامنے پہلے پہل ماں باپ کی زبان سیکھنا اہم ترین مرحلہ ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں ان سے کچھ کہوں وہ اپنی زبان کو حرکت بھی دیتا ہے لیکن لفظ نہیں بنا سکتا اسی طرح کان سے الفاظ کو سنتا ہے لیکن ان کی تعیین و تمیز اور حفظ و ضبط سے اس کا ذہن و شعور کوتاہ ہوتا ہے پس وہ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس کرتے ہوئے ماں باپ کا منہ تکنے لگتا ہے اور وہ اپنے اندر طاقت گویائی کو ایک محالِ عقلی اور قطعاً ناشدنی امر قرار دیتے ہوئے اپنے والدین کے تکلم سے متاثر ہو کر محوِ حیرت ہوتا ہے اور ان کو بولتا دیکھ کر استعجاب سے ہنس پڑتا ہے اس کے ماں باپ کے بس میں نہیں کہ بچے کو حیرت و استعجاب کے موجودہ بھنور سے نکال لیں وہ اس مرحلہ میں اس کو ہزار سکھائیں اور تکلم کے واقعی اسباب و ذرائع کی طرف لاکھ توجہ دلائیں سب فضول اور بے فائدہ ہوگا کیونکہ اس میں متوجہ ہونے اور سمجھ سکنے کی اہلیت ہی نہیں۔ وہ بہرکیف ماں باپ کے تکلم بلکہ ہر اس سے نہ ہو سکنے والی بات کا ماں باپ سے صادر ہونے کو اپنے اندر معجزہ اور

خلاف عادات اور غیر متوقع امر قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے اذہان گو کتنے ہی کامل ہوں انبیا کے اذہان و افکار کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے کم سن بچہ کا ذہن ہمارے مقابلہ میں جس طرح بچہ اپنے احول کی عادی رفتار کے ماتحت اپنے سے افراد کی حرکات کو غیر ممکن اور نادر شدنی امر قرار دیتا ہے۔ اور ان کے اسباب و علل واقعیہ سے نہ مطلع ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے اسی طرح ہم بھی اپنے احوال کے اعتبار سے نادر شدنی و غیر ممکن امور کے اسباب واقعیہ سے نہ مطلع ہیں اور نہ مطلع ہو سکتے ہیں کیونکہ اذہان میں صلاحیت ہی نہیں اسی طرح ذات واجب الوجود کے علم محیط اور قدرت کاملہ کے مقابلہ میں انبیاء کے علوم و اقدار کو سمندر و قطرہ یا شمس و ذرہ کی نسبت ہے۔ بلکہ اس کی ذات وصفات سے مخلوقات کو کوئی نسبت ہی نہیں۔

پس ممکن ہے کہ ان کے علل و اسباب ہوں اور انبیاء جانتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف اللہ کے علم تک ہی محدود ہوں اور چونکہ خداوند کریم نہ ایجادِ کائنات میں محتاج تھا نہ بقائے کائنات میں محتاج ہے لہٰذا ممکن ہے کہ بغیر علل و اسباب اس قسم کے امور کو ظاہر کر دے کیونکہ ممکن کو اسباب کی احتیاج ہوا کرتی ہے واجب کو اسباب کی قطعاً کوئی احتیاج ہی نہیں۔

بالجملہ ہم ہزاروں بلکہ لاکھوں کوششیں کریں کہ انبیاء و اوصیاء کے ہاتھوں صادر شدہ معجزات کے اسباب واقعیہ معلوم کر لیں ناممکن ہے اس مقام تک معجزہ کے معنی کی وضاحت بہت کچھ ہو چکی اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء کی بعثت سے غرض یہ ہے کہ وہ عبد و معبود کے درمیان عہدۂ سفارت کے فرائض انجام دیں اور خالقِ کائنات نے اپنے کمال لطف و کرم سے ہر انسان کو عمومی دعوت بھی دے دی کہ اے میرے بندے میری اطاعت کر تاکہ تجھے وہ قدرت عطا کروں کہ تیرا ارادہ کائنات میں نفوذ کرے یا بعض اسرار فطرت اور اسباب حقیقت کی تیرے سامنے نقاب کشائی کر دوں تاکہ تیرے افعال ظاہری دنیا میں اعجازی حیثیت کے حامل ہوں جس طرح عام سردار اپنے خاص وفادار اور اطاعت شعار غلاموں کو بعض ایسے خصوصی اسرار و رموز پر اطلاع دے دیتے ہیں جو کسی اور کے سامنے بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتے اور اس قسم کے غلاموں کو محرم راز کہا جاتا ہے اور سردار اس کو محرم راز بنا کر بعض اوقات انہیں اپنے خصوصی اختیارات بھی دے دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اطاعت شعار انسان کے لئے ذاتِ احدیت بعض رموزِ حقیقت منکشف فرما دیتی ہے۔ اور بعض امور میں تصرف کا حق بھی عطا کر دیتی ہے جن کی بدولت ان سے خارق عادت افعال کا صدور ہوا کرتا ہے۔ چونکہ مادہ و طبیعت کی پرستار ذہنیتیں ہمیشہ پیغامِ توحید سے برسرِ پیکار رہی ہیں۔ وہ ہر شیئے کو اسباب و علل ظاہریہ کی مخلوق سمجھتی ہیں۔ لہٰذا داعیانِ توحید کے لئے ضروری تھا کہ ان آفت زدہ اذہان کو خالقِ کائنات کی طرف اس طرح بلائیں کہ علل و اسباب کے متلاشی مادہ طبیعت کی قید و بند سے آزاد ہو کر ذاتِ واجب الوجود کی معرفت کا درس حاصل کر سکیں جو نہ خلق اشیاء میں مادہ کا محتاج ہے اور نہ نظامِ اکمل کائنات میں طبیعت کا ممنونِ احسان ہے

ممکن ہے مادہ پرستوں کی جانب سے انبیاء پر یہ سوال کیا جاتا کہ مادہ کے بغیر کس طرح کوئی شیئ منصۂ شہود پر آ سکتی ہے یا طبیعت کے سوا کیسے نظامِ عالم برقرار رہ سکتا ہے؟ تو ان کے سوالات کو عملی طور پر سمجھانے سلجھانے کیلئے۔

انبیاء کو ایسی قوت کا دینا ضروری تھا۔ جس کے استعمال سے ہر دور کا مہذب گروہ اور ترقی یافتہ طبقہ براہین وجود ذاتِ احدیت کو سن کر ان کے قبول کرنے میں پس و پیش نہ کر سکے۔ اسی بناء پر جس دور میں ترقی یافتہ طبقہ کے نزدیک کوئی فعل اسباب و علل ظاہریہ کے ماتحت انتہائی عروج کے منازل پر پہنچا ہوا تھا کہ اس دور کے اعلیٰ مفکرین و ماہرینِ فنون کے نزدیک اس سے بلند قدم رکھنا ایک مافوق العادۃ امر تھا جس سے علل و اسباب کی دنیا ناآشنا تھی تو اس دور میں فرائض تبلیغ انجام دینے کے لئے جس نبی کو مبعوث فرمایا اسے وقتی مصلحت کے لحاظ سے وہ قوت عطا کی یا ایسے اسرارِ فطرت پر اطلاع دی جس کے استعمال سے مفکرین کی گردنیں جھک گئیں اور انہیں چار و ناچار تسلیم کرنا پڑا کہ ہمارے قویٰ و افکار سے ایک بالا دست ایسی طاقت موجود ہے جو خلق میں مادہ سے اور نظام میں طبیعت سے بے نیاز ہے چنانچہ عصائے موسیٰؑ فن داؤدؑ دمِ عیسیٰؑ علیٰ نبینا و علیہم السلام اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں تھیں

جنابِ رسالتمآبؐ کے زمانۂ بعثت میں چونکہ فصاحت و بلاغت کا چرچا اس حد تک تھا کہ عرب لوگوں کی نگاہوں میں جمیع ممالک غیر عربیہ گنگ کی حیثیت سے تھے اسی بناء پر غیر عربوں کو عجم کی لفظ سے تعبیر کیا کرتے تھے کیونکہ عجم کا معنی یہی ہوتا ہے اور تاریخ بتلاتی ہے کہ اس زمانہ میں اقوامِ عالم کے مقابلہ میں عرب قوم شجاعت، سیاست، سیاحت اور تجارت کے اعتبارات سے مہذب ترین قوم شمار ہوتی تھی۔ لہٰذا اس دور کے مہذب اور متمدن طبقہ کو پیغامِ خدا پہنچانے کے لئے ایک ایسے مافوق العادۃ کلام کی ضرورت تھی جو فصحاء و بلغاء کی گردنیں جھکا دے۔ حتیٰ کہ وہ اس کلام کے مقابلہ میں گنگ نظر آئیں۔ پس اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے جنابِ رسالتمآبؐ کو قرآن مجید عطا ہوا تاکہ دستورِ بعثت کے ماتحت موجودہ دور کے اعلیٰ مفکرین کو مقصدِ تبلیغ کے تسلیم کرانے میں زیادہ سے زیادہ مؤثر ثابت ہو۔ لہٰذا یہ کلام بصورتِ معجزہ نازل ہوا اور قیامت تک تمام آئندہ طبقات کے لئے نسلاً بعد نسل ہادی قرار دیا گیا اور اس میں متعدد خارق العادۃ اعجازی پہلو سمو دیئے گئے۔

۱۔ الفاظ و معانی کے نظم و نسق اور مقتضائے حال و مقام کی مطابقت کے اعتبار سے وہ کمال کہ باوجود ببانگ دہل اعلانیہ چیلنج اور تحدی کے کسی کو مقابلہ کی جرأت نہ ہو سکی اور ایک چھوٹے سے چھوٹے سورۂ کوثر کو پڑھ کر (مَا هٰذَا كَلَامُ الْبَشَرِ) کے اعتراف پر مجبور ہو گئے۔

۲۔ تدقیقِ مطالب اور اسرار و رموز و معارف کے وہ خزانہ ہائے بیش قیمت اسمیں تفویض کر دیئے کہ تا قیامِ قیامت حقائق جو مفکرینِ عالم کی انتہائی تگ و دو اور غیر معمولی جدوجہد بھی انہیں ناپید نہ کر سکے بلکہ ہر مفکر اپنی آخری کوشش کے بعد اس کے دقائق کے استقصاء سے اظہارِ عجز پر مجبور ہو اور روایات میں ہے کہ قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور پھر باطن کا باطن یہاں تک کہ سات بواطن تک اور وہ سوائے حضرت علیؑ اور ان کی اولاد امجاد کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔

۳۔ سلاستِ کلام اور روانی کے علاوہ مرغوبیت اور حلاوت کا وہ عالم کہ کبھی عارفِ طبیعتیں تلاوت سے طول کا شکوہ نہ کریں بلکہ جس قدر تلاوت میں اضافہ ہو اسی قدر لطف اندوزی میں زیادتی ہو۔ چنانچہ فضائلِ قرآن کے باب میں معصومینؑ کے کلام سے

اس امر کو صراحت سے ذکر کیا گیا ہے۔

عن الرضا عن ابیه علیهما السلام انه سئل ابو عبدالله ما بال القرآن لا یزداد علی النشر والدرس الا غضاضة فقال لان الله تبارک و تعالی لم یجعله لزمان دون زمان و لناس دون ناس فهو فی کل زمان جدید و عند کل قوم غض

حضرت امام رضاؑ اپنے والد بزرگوار سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا گیا کہ قرآن مجید باوجود زیادہ نشر و اشاعت اور درس و تدریس کے زیادہ تازہ ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے اس کو صرف ایک زمانہ اور ایک قوم کے لئے تو نہیں بھیجا بلکہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے ہے)
لہٰذا ہر زمانہ میں نیا اور ہر قوم کے لئے تازہ ہے اور رہے گا۔

۴۔ بیانِ احکام میں اس قدر لازوال اور غیر متزلزل مصالح و مفاسد کا اعتبار کہ سیاست دانانِ عالم اور دانایانِ ہر دور تا قیامت اس میں نقص و عیب جوئی کی جرأت نہ کر سکیں۔

۵۔ امم سابقہ اور قرونِ خالیہ کے وہ مفصل حالات و واقعات اور تاریخی مفید نکات و معلومات کا ذخیرہ جس کی واقفیت سے بہرہ ور فرد نہ ہو اور ایسے نبی کی وساطت سے جو علل و اسباب کی ظاہری دنیا میں امم سابقہ اور قرونِ ماضیہ کے بقایا افراد خصوصاً ان کے علماء سے مجالست و مصاحبت کا کوئی رابطہ نہ رکھتا ہو حتیٰ کہ ظاہر بین لوگ اس کو ان پڑھ سے تعبیر کرتے ہوں۔

۶۔ آئندہ کی اخبار میں وہ صداقت کہ فنِ کہانت کے ممتاز لوگ حیرت سے انگشت بدنداں ہو کر ظاہری اسباب سے اس کی بے نیازی کا اعتراف کر لیں، خلقتِ کائنات اور ایجادِ عالم کے متعلق وہ حقیقت آمیز تبصرہ کہ انصاف پسند اور حقیقت رس طبائع تسبیح و تقدیسِ خدا کے علاوہ منہ سے حرف تک نہ نکال سکیں۔

۷۔ معرفتِ خدا کے متعلق وہ ناقابلِ تردید براہین جن کو سن کر مشرکین کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور جواب میں دم بخود ہو جائیں۔

۸۔ حشر و نشر اور موت و حیات کی وہ جزوی تفصیلات بمعہ استدلالات کہ فلاسفرِ دور سر پکڑ لیں۔

۹۔ الفاظ و معانی میں وہ توازن کہ ہر دور کے ماہرینِ علوم عربیہ ایک حرف و حرکت کی اونچ نیچ یا کمی بیشی کا فرق نہ نکال سکیں

۱۰۔ لسانیت کے لحاظ سے وہ کمال کہ باوجود ابد میں آنے کے پورے کلام عرب کا اعجاز و اساس تسلیم کی جائے۔ حتیٰ کہ اہلِ لسان کے نزدیک بھی کلام کی تصحیح و تغلیط کا معیار قرار پائے اور علمائے عربیت کلام عرب کی صحت و خطا کو اسی مقدس کلام سے جانچنے پر مجبور ہوں۔

۱۱۔ سب سے محیر العقول پہلو یہ کہ اس کلام کے لانے والا نبی ظاہری دنیا میں ناخواندہ اور موجودہ دور کے خطباء، فصحاء و بلغاء سے کنارہ کش، شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کے تمام خطبات و مواعظ و مکاتیب میں فصاحت و بلاغت کے وہ بے پناہ سمندر موجزن ہیں کہ مخالفین کو تسلیم کرنا پڑا کہ کلام اللہ کے بعد فصاحت و بلاغت میں نہج البلاغہ کے مقابل کوئی کلام

شبہ نہیں لیکن ہمارے رسالتمآب کے تمام خطبات و مواعظ یا احادیث شریفہ میں وہ رنگ نہیں بلکہ عام عربی کلام سے اس کو خاص کوئی نمایاں امتیاز حاصل نہیں ہے۔

کیونکہ ہمارے رسالتمآب کے ذاتی کلام میں اگر یہ جوہر ہوتا تو معترضین کو کہنے کا موقع مل جاتا کہ کلام مجید انہی کا اپنا کلام ہے اور جس کے لئے کہ جب ان کا عام بیان اور فی البدیہہ تکلم اس قدر فصاحت و بلاغت کا حامل ہے تو وہ سوچ سمجھ کر فکر و تدبر کے بعد قرآن مجید جیسا بے نظیر کلام کیوں نہ پیش کریں؟ پس قرآن مجید کو سرکار رسالت کا نتیجہ فکر قرار دیا جاتا اور وہ مقصد تشنۂ تکمیل رہ جاتا جس کے لئے قرآن معجزہ بنا کر بھیجا گیا۔

دیگر کتب سماویہ اور قرآن مجید میں ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ ان کتابوں میں صرف وہی احکام تھے جو فقط اسی وقت کے لئے موزوں تھے اور قرآن مجید صحیح علوم عقلیہ و نقلیہ کا خزانہ اور پائیدار خزانہ ہونے کے علاوہ اپنے اندر ایسے ثابت و غیر متزلزل احکام رکھتا ہے جن کو مرور زمانہ نہ مضمحل کر سکتا ہے اور نہ وہ قابل ترمیم و تنسیخ ہیں اسی لئے اس نبی کے بعد کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ان کی شریعت آخری شریعت ہے اور ان کا قانون آخری قانون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ کتب کی افادی حیثیت محدود تھی جو بالآخر ختم ہوگئی اور قرآن مجید کی افادیت تاقیامت محفوظ ہے اور رہے گی۔ موجودہ دنیائے روشنی کے اعلیٰ مفکرین جب بڑی غور و خوض اور بحث و تمحیص میں غیر معمولی عرق ریزی کے بعد ایک قانون مرتب کرتے ہیں تو اپنی حد امکان تک اس کو ہر قسم کے نقائص سے پاک کر کے متعدد اجتماعات میں جرح و قدح اور تصحیح و تعدیل کے بعد اس کے نفاذ کا اعلان کرتے ہیں اور ایسی ہم اسے ناقابل نسخ و ترمیم قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ آئے دن کے واقعات اور ان کے تجربات شاہد ہوتے ہیں کہ کل کا بنایا ہوا قانون آج نہیں تو کل تک ضرور منسوخ نہیں تو قابل ترمیم ضرور ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ نت نئے قانون اور نت نرالے ضوابط منظر عام پر آتے رہتے ہیں اور اس طرح قوانین و ضوابط کا ایک تانتا بندھا رہتا ہے۔

بڑی وجہ یہ ہے کہ قانون ساز کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو چیزوں کے تمام مصالح[1] و مفاسد کو جان سکتا ہی نہیں اور اسی لئے ہر قانون ساز خود چند روز کے بعد اپنے قانون کا دشمن بن جاتا ہے اور اگر خود ضد پہ ڈٹا رہے تو اس کے ایام اقتدار ختم ہونے کے بعد تو یقیناً اس کا قانون ختم ہو جائے گا کیونکہ (ہر کہ آمد عمارت نو ساخت)

لیکن ذات علیم و قدیر نے احکام قرآنیہ کی بنیاد ایسے غیر متزلزل اصول پر رکھی ہے جو کسی زمانہ میں نہ منسوخ ہو سکتے ہیں اور نہ قابل ترمیم قرار دیئے جا سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج پونے چودہ سو سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود قرآنی احکام و ضوابط میں نئی روح اور تازہ جان موجود ہے اور تاقیامت رہے گی۔

---

[1] خوبیاں اور برائیاں

معجز نما کی ضرورت

گذشتہ عنوان کے ذیل میں قرآن مجید کے معجز ہونے اور اس کے اعجازی پہلوؤں کے متعلق بیان کیا گیا ہے اس مقام پہ یہ بیان کرنا ہے کہ چونکہ معجزہ بغیر معجز نما کے نہیں وقوع پذیر اور ظاہر ہو سکتا۔ لہذا یہاں بھی اعجاز قرآن کے اظہار کے لئے ایک معجز نما ضروری ہے۔ عصا سانپ بن سکتا ہے لیکن موسیٰؑ کے ہاتھ میں۔ اونٹنی پتھر سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن صالحؑ کے اشارے سے۔ آگ گلزار بن سکتی ہے لیکن خلیلؑ کی ضرورت ہے مٹی سے پرندہ بن کر پرواز کر سکتا ہے لیکن دمِ عیسٰیؑ کے ساتھ۔ میر انیسؔ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

جس ہاتھ میں عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے — ہر ہاتھ کو لائق ید بیضا نہیں کہتے

پس قرآن قرآن ہے لیکن اس کے اعجازی کرشمے معجز نما کے وجود کے محتاج ہیں۔

گذشتہ انبیاء کی چونکہ نبوتیں محدود اوقات کیلئے ہوا کرتی تھیں اس لئے ان کے معجزات بھی مختصر اور محدود زندگی رکھتے تھے اور قرآن چونکہ قیامت تک کے لئے ہے اور شریعت مصطفوی کی کنجی سلسلہ بھی قیامت تک ہے۔ لہذا قرآن مجید کے ساتھ معجز نما کا ہونا بھی قیامت تک ضروری ہے کیونکہ اگر معجز نما کے وجود کا دائرہ صرف زمانِ رسالت تک ہی محدود کر دیا جائے تو قیامت تک کے لئے اس کے اعجاز کی رٹ لگانا صرف لقلقۂ لسانی ہو کر رہ جائے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ معجزہ ہائے انبیاء سابقین کی طرح اس کی اعجازیت بھی محدود وقت تک تھی اور بس حالانکہ باتفاق جمیع فرق اسلامیہ اعجازیت تاقیامت باقی ہے اس کے خلاف کہنے والا منقول و معقول کے خلاف ہونے کے ساتھ دشمن اسلام ہے پس ثابت ہوا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے لے کر تا قیام قیامت ہر دور میں قرآن کے ساتھ ایک قرآن والا ضرور ہوگا۔ جو حضور رسالتمآبؐ کی صحیح جانشینی کے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنے زمانہ کی ضروریات کے پیش نظر قرآن کے اعجازات سے لوگوں کو روشناس کرا سکتا ہوگا۔

عن عیون اخبار الرضا سُئِلَ اَمِیرُالمؤمنینؑ عَنْ مَعْنٰی قَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ اِنِّیْ مُخَلِّفٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْن کِتَابُ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ مَنِ الْعِتْرَۃُ؟ قَالَ اَنَا وَالْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ وَالْاَئِمَّۃُ التِّسْعَۃُ مِنْ وُلْدِ الْحُسَیْنِ تَاسِعُھُمْ مَھْدِیُّھُمْ وَقَائِمُھُمْ لَا یُفَارِقُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَلَا یُفَارِقُھُمْ حَتّٰی یَرِدُوْا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ حَوْضَہٗ

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ حضرت رسالتمآبؐ کا جو فرمان ہے کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں اللہ کی کتاب اور عترت چھوڑے جاتا ہوں عترت کون ہیں؟ آپ نے فرمایا میں اور حسنؑ اور حسینؑ اور نو حسینؑ کی اولاد سے ہوں گے جن کا نواں مہدی و قائم ہوگا۔ یہ قرآن سے جدا نہ ہوں گے اور قرآن ان سے جدا نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ جناب رسالتمآبؐ کے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہمیں صرف قرآن مجید کافی ہے اور قرآن کے علاوہ اور کسی چیز سے تمسک پکڑنے کی ضرورت نہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کو کلام معجزنما جانتا ہو اور اس کی اعجازی حیثیت کا سرے سے انکار کرتا ہو۔

۲۔ قرآن مجید کے اعجاز کا قائل ہو لیکن خود اپنے آپ کو معجزنما سمجھتا ہو۔

۳۔ نہ قرآن کے اعجاز کا منکر ہو اور نہ اپنے آپ کو معجزنما جانتا ہو۔

پہلی صورت میں تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ منکر اعجاز قرآن خارج از ایمان ہے۔

دوسری صورت کہ وہ شخص معجزنما ہو عقل ونقل سے بعید ہے کیونکہ معجزنما ہونے کا دعویٰ خام ہی کا گھر نہیں۔ عصا ہاتھ میں رکھنا آسان ہے لیکن موسیٰ ہونا کہ اسے سانپ بنانا یا دریا پر مار کر رستے پیدا کرنا یا پتھر پر مار کر پانی کے چشمے جاری کرنا وغیرہ مشکل ہے اسی طرح دم کرنا سہل ہے لیکن عیسیٰ بن کر مٹی میں روح پھونک دینا یا مردہ میں جان ڈال دینا ہر شخص کا کام نہیں اور یہی حال لوہا اٹھانا اور بات ہے اور اس میں اثر داؤدی پیدا کر دینا اور شئے ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس بلکہ گذشتہ انبیاء کے معجزوں اور قرآن مجید کے اعجاز میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے کیوں کہ قرآن مجید عصائے موسیٰ کی طرح نہیں کہ زمین پر رکھ دینے سے اعجازی جلوؤں کو ظاہر کرنے لگ جائے یا دم عیسیٰ کی طرح نہیں کہ صرف شو کرنے سے کام چل جائے۔ یہاں تو عیسیٰؑ و موسیٰؑ کو دم مارنے کی بھی جرأت نہیں بلکہ قرآن مجید کے اعجاز کے سامنے تو وہ خود دم بخود نظر آتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کو حضرت حجت کے انتظار میں رکھنا اور بوقت ظہور ان کا ان کی اقتدا میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا اسی امر کی دلیل ہے کہ وہ حامل اعجاز ہیں اور یہ صاحب اعجاز ہیں۔

بہر کیف ہر قرآن کو اٹھانے والا معجزنما نہیں ہو سکتا بلکہ معجزنما کے لئے قرآنی رموز وحقائق پر اطلاع چاہیئے۔ اس کے عمائق اور دقائق تک رسائی کی ہمت ہو۔ اسرار فصاحت اور نکات بلاغت میں مہارت کاملہ اور بصیرت صادقہ کے علاوہ جودت طبع اور سلامت فطنہ کا حامل ہو۔ مقام اطاعت میں شان عبودیت رکھتا ہو اور مقام معرفت میں راز در رموز خفیہ اور اسرار لطیفہ کا محرم ہو۔ گویا قرآن کے ساتھ جسم و جان اور قالب و روح کا تعلق رکھتا ہو۔

لیکن یہ باتیں ابواب مدینہ علوم نبویہ کے بغیر اور کہیں بھی نہیں مل سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ حضرت رسالتمآب کی رحلت کے بعد جب کبھی صحابہ کو کوئی مسئلہ ایسا پیش آتا جس کے حل سے عاجز ہو جاتے تو باب مدینۂ علم نبی حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کے دروازہ کا طواف کرتے نظر آتے تھے صرف انہی تک منحصر نہیں بلکہ ہر دور میں امت اسلامیہ مسائل مشکلہ میں آل محمد کے دروازہ پر جھکتی رہی اور بنی عباس کے فقہی دور میں فقہائے عالم کی گردنیں صادق آل محمد کے علمی وقار کے سامنے خم ہو گئیں۔ اگر تعصب کی عینک اتار کر تاریخ اسلام کا صحیح مطالعہ کیا جائے تو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کے حقیقی ترجمان خاندان رسالت کے وہ افراد خاص ہیں جنہیں خداوند عالم نے علوم قرآنیہ کا حامل قرار دیکر منصب خلافت کے لئے منتخب فرمایا ہے

اس بیان سے ثابت ہُوا کہ قرآن کے ساتھ قرآن والا صرف خاندانِ رسالت کا فردِ معصوم ہی ہو سکتا ہے اگر کوئی دوسرا یہ دعوےٰ کرے تو جھوٹا ہوگا۔

پس اب تیسری صورت باقی رہی تو اسمیں ضروری ہے کہ قرآن کے ساتھ قرآن والے پر بھی ایمان لایا جائے اور وہی امام بالحق ہوا کرتا ہے جس کا وجود ہر دَور میں ضروری ہے تاکہ قرآنی تعلیمات کے ماتحت ہر زمانہ میں اسلام کی ترویج و تقویت کا کفیل ہو اور جو لوگ صرف قرآن مجید کے ساتھ تمسک پکڑنا کافی سمجھتے ہیں اور قرآن والے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے وُہ قرآن کے ساتھ رہنے کے حقیقی مفہوم سے غافل ہیں بلکہ ان کا قرآن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ صرف زبانی ہی زبانی ہے ورنہ درحقیقت نہ ان کا قرآن سے تمسک ہے اور نہ ایمان ہے۔

فی البرھان عن الدیلمی باسنادہ عن زید بن ثابت قال قال رَسُولُ اللّٰہِؐ اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابُ اللّٰہِ وَعَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍؑ وَعَلِیٌّؑ اَفْضَلُ لَکُمْ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ لِاَنَّہٗ مُتَرْجِمٌ لَکُمْ عَنْ کِتَابِ اللّٰہِ۔

برہان میں دیلمی سے بالاسناد زید بن ثابت سے منقول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں (ایک) اللہ کی کتاب اور (دوسرے) علی بن ابیطالبؑ اور علیؑ تمہارے لئے کتاب اللہ سے افضل ہے کیونکہ یہ تمہارے لئے کتاب اللہ کی ترجمانی کرے گا۔

(علیؑ ناطق ہے اور قرآن صامت ہے اور ناطق صامت سے افضل ہوا کرتا ہے)

وفیہ عنہ عن سلیم بن قیس الھلالی عن امیر المومنینؑ قال اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی طَھَّرَنَا وَعَصَمَنَا وَجَعَلَنَا شُھَدَآءَ عَلٰی خَلْقِہٖ وَحُجَجًا فِیْ اَرْضِہٖ وَجَعَلَنَا مَعَ الْقُرْاٰنِ وَجَعَلَ الْقُرْاٰنَ مَعَنَا لَا نُفَارِقُہٗ وَلَا یُفَارِقُنَا۔

اسی کتاب میں سلیم بن قیس ہلالی سے روایت ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا تحقیق اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں پاک معصوم خلق پر گواہ اور زمین میں اپنی حجت بنایا ہے ہمیں قرآن کے ساتھ اور قرآن کو ہمارے ساتھ قرار دیا نہ ہم اس سے جُدا ہیں اور نہ وہ ہم سے جُدا ہے۔

احادیث اس مضمون کی بہت زیادہ ہیں جو حدِ تواتر سے بڑھی ہوئی ہیں۔ انشاء اللہ کسی اور عنوان کے تحت میں کچھ حصہ ان کا ذکر کیا جائے گا۔ بس اس مقام پر صرف یہی ثابت کرنا تھا کہ قرآن کی اعجازیت کے پیشِ نظر ہر زمانہ میں ایک ایسے قرآن والے کا ہونا ضروری ہے جو بحیثیت معجزنما کے قرآن کے ساتھ ہو اور عقلی بیان سے بھی ثابت ہوگیا۔ کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر صفتِ حسنہ اور خصلتِ حمیدہ اپنے اندر رکھتا ہو بلکہ ہر وہ کمال جو انسانی امکانی احاطہ سے باہر نہ ہو اس میں پایا جائے تاکہ قرآن کے ظواہر و بواطن اور دقائق و حقائق پر بصیرت افروز تبصرہ کرکے ایک طرف ہر دَور کے مہذّب و ترقی یافتہ یا جدت پسند گروہ کو اس کا گرویدہ بنا سکے اور دوسری طرف اپنے اوصاف و کردار کے سایہ میں ان کی روحانی زندگی کو تابناک بھی بنا سکے۔

قرآن کریم نے تاویلِ قرآن کے علم کو تو راسخین فی العلم میں بند کر دیا لیکن مصداق کی تعیین کیسے ہو اس کی تلاش کے لئے منصف مزاج گروہ اور دانا بینا طبقہ کے لئے چنداں دقت نہیں تھی لیکن خواہشات کی رو میں بہنے والے اور جذباتی رجحانات کے پیچھے چلنے والے عموماً نظریاتی اختلافات کی آڑ لے کر طرف داری اور جنبہ نوازی کا کھیل کھیلنے لگ جاتے ہیں۔ اور اس قسم کے خطرات بدوی عربوں کی متعصبانہ روش کے پیشِ نظر اہم ترین طور پر مرکزِ نگاہِ التفاتِ رسالت تھے جن کا ازالہ اہم ترین فریضہ تھا۔ پس حضورؐ نے غیر مبہم الفاظ میں صحابہ کرامؓ پر وضاحت فرما دی اور زبانِ وحی ترجمان نے صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ تمہارے لئے قرآن سے علی بہتر ہے کیونکہ وہ قرآن کا مترجم ہے۔ نیز اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا کے صاف اور کھلے لفظوں میں صحابہ کو سمجھایا۔ عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِيٍّ۔ علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔[1] عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ۔ علیؑ حق کے ساتھ اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ اس قسم کی واضح اور صریح فرمائشات صحابہؓ کے گوش گزار فرما کر حقیقت کے چہرہ سے پوری طرح نقاب کشائی کر دی تاکہ اعذارِ فاسدہ کا سدِ باب ہو جائے اور قرآن کے ساتھ قرینِ قرآن کا ذکر اور ہر دو سے متوازی طور پر تمسک کا امر فرما کر نص کر دی کہ قرآن کے مفسر اور عالم یہی ہیں اور راسخون فی العلم بھی یہی ہیں۔ ان توضیحات و تصریحات کا مقصد صرف انتخابات و اجتماعات و شورائی کارروائیوں کی تردید کرنا تھا۔

لیکن باوجودیکہ جنابِ رسالتمآبؐ نے پوری اُمتِ اسلامیہ کو ایک نکتہ پر جمع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تاہم تمام فرمائشاتِ سرکارِ رسالتؐ کو پسِ پُشت ڈال کر کہنے والے کہہ اُٹھے کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے اور ہر زمانہ میں اس بے بنیاد دعویٰ کو اپنانے والے پیدا ہوئے اور ہر بغل میں قرآن لٹکانے والے نے کہنا شروع کر دیا کہ میں قرآن کا عالم ہوں اور ہر شخص نے قرآنی مطالب میں اپنی رائے کو داخل کر دیا۔ جس کی وجہ سے معانیٔ قرآنیہ میں اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور استحسانات و قیاسات کی بناء پر لوگ جس قدر آلِ محمدؐ سے دُور ہوتے چلے گئے۔ قرآنی حقائق سے اتنا ہی تہی دست اور خالی داماں رہے۔

امام محمد تقی علیہ السّلام کا واقعہ

چنانچہ معتصم عباسی کے عہدِ حکومت میں ایک مرتبہ چور پر شرعی حد جاری کرنے کا مسئلہ پیش آیا۔ درباری فقہاء کی نگاہیں صرف فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا (ہاتھ کاٹ دو) تک محدود تھیں۔ اب سوال پیدا ہوا کہ ہاتھ کس مقام سے کاٹا جائے تو فقہاء میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ قطع کی حد کلائی ہے کیونکہ آیتِ تیمم میں ہاتھوں کا مسح واجب ہے اور مسح کی حد کلائی ہے اور کسی نے فتویٰ دیا کہ ہاتھوں کو کہنیوں سے جدا کرنا چاہیئے کیونکہ آیتِ وضو میں ہاتھوں کے دھونے کا حکم ہے اور حد اس کی کہنیوں تک ہے۔ مسئلہ کیا تھا ایک عقدۂ لاینحل بن گیا

[1] یہ حدیثیں باختلافِ الفاظ تفصیلاً مع حوالہ کتب بعد میں آئیں گی۔ منہ

معتصم نے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ دربار میں تشریف لائیں۔ چنانچہ بدلِ ناخواستہ آپ تشریف لائے تو مسئلہ پیش ہوا۔ آپ نے جواب سے معذرت طلب کی لیکن خلیفہ نے قبول نہ کی اور طلب جواب پر مصر ہُوا۔ آخر کار آپ نے فرمایا کہ چور کے ہاتھ کا صرف پنجہ یعنی انگلیوں کی جڑوں سے کاٹ دیا جائے اس جواب پر تمام درباری فقہاء سیخ پا ہو کر دلیل کا مطالبہ کرنے لگے آپ نے فرمایا اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ مساجد اللہ کے لئے ہیں (وہ اعضاء جو بوقت سجدہ زمین کو مس ہُوا کرتے ہیں وہ ہیں مساجد اور ان کی تعداد سات ہے دونو پاؤں کے انگوٹھے دونوں گھٹنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پیشانی آپ نے فرمایا جس چیز کو اللہ نے اپنے لئے مخصوص فرمالیا ہے حد جاری کرتے وقت اس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور باقی پر حد کو جاری کرنا چاہیئے۔ معتصم آپ کی فہمائش سے مطمئن ہو گیا اور آپ ہی کے ارشاد کے مطابق چور پر حد کو جاری کیا اس پر درباری فقہاء ناراض ہو گئے چنانچہ ابن ابی داؤد کئی دن تک بوجہ رنجش کے دربار میں حاضر نہ ہُوا اور امام کے تبحر علمی کو دیکھ کر آتشِ حسد اس کے سینۂ پُر کینہ میں زور سے بھڑک اٹھی کہ اس کیلئے چین و آرام ختم ہو گیا آخر کار امام عالی مقام کو زہر دلوا کر شہید کروانے پر معتصم کو آمادہ کیا۔ تب رضامند ہُوا۔

اصولی طور پر اسے ورود سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک دلیل اگر دوسری دلیل کے موضوعِ حکم کی وسعت سے کسی فرد کو بطور تخصیص خارج کر دے تو اس کو اصطلاح اصول میں حکومت کہتے ہیں مخصِّص کو حاکم اور مخصَّص کو محکوم سے تعبیر کیا جاتا ہے جس طرح آیتِ وضو کے عام موضوعِ حکم سے حرجی مقاماتِ آیتِ حرج نے خارج کر دیئے آیتِ وضو محکوم اور آیتِ حرج حاکم ہے اور اگر ایک دلیل دوسری دلیل کے موضوعِ حکم سے کسی فرد کو بطور تخصّص خارج کر دے یعنی وہ دلیل یہ کہے کہ فرد مذکور اس موضوع سے مستثنیٰ منقطع کی طرح تخصصاً خارج ہے یعنی ابتداء سے یہ اُس موضوع کا فرد ہی نہیں اور وہ حکم اس کو شامل ہی نہیں تو اس کو اصطلاحِ اصول میں ورود کہتے ہیں۔ روایت مذکورہ میں اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ نے بتلایا کہ حد چوری کے حکم میں مساجد سبعہ داخل ہی نہیں لہٰذا یہ وارد ہے اور آیتِ سرقہ مورود۔

سطحی ترجمہ مشکل سے سمجھنے والے اس قسم کے اصولی نکات کا قرآن سے کیا خاک استنتاج کر سکتے تھے؟ یہ راسخین فی العلم ہی کی شان ہے اہلبیتِ عصمتؑ کے دامن سے علیحدگی اور دعویٰ حَسْبُنَا کی مقبولیت نے قرآن مجید کو ایک بازیچۂ اطفال بنا کے رکھ دیا ہے ہر دو حرف سیکھا ہُوا اپنے تئیں عالم قرآن کہلوانے سے ذرا بھر جھجک محسوس نہیں کرتا۔ عوام کے دل و دماغ میں یہی بات سمائی ہوئی ہے کہ ہر شخص عالم قرآن ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہر ملّا نما شخص سے اپنے پیش آمدہ مسائل کا حل قرآن مجید سے طلب کرتے ہیں اور بغیر اس کے اپنے اندر اطمینان کی صورت ہی نہیں پاتے ادھر لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین پر نگاہ جمی ہوئی ہے لیکن وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ فَاسْئَلُوْ

---

[1] اس کا قرآنی استشہاد ہے يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ الاية یہاں ایدی سے مراد صرف انگلیاں ہی انگلیاں ہیں کیونکہ لکھا انگلیوں سے جاتا ہے منہ

اَهْلَ الذِّكْرِ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ وغیرہ کا خیال تک نہیں نیز انی تارک فیکم الثقلین پر دھیان تک نہیں اور ان ہی تخیلاتِ فاسدہ نے عوامِ شیعہ کو ایک بڑی حد تک اپنے اصول مسلمہ سے غافل کر دیا ہے ان کے اذہان میں بھی یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ہر بات کا ثبوت قرآن مجید سے ہونا چاہیئے پس اپنے مولوی صاحبان سے جزوی اختلافی مسائل کا حل قرآن مجید سے ہی چاہتے ہیں کیونکہ ان سے مخالفین بھی قرآن مجید کا حوالہ طلب کرتے ہیں مثلاً سوال کیا جاتا ہے رونا پیٹنا دیگر رسوم عزاداری - ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا اور آئمہ اثنا عشر کے اسمائے طاہرہ وغیرہ قرآن مجید میں کہاں ہیں؟ مخالفین تو جونکہ حسبنا کو اپنانے والے ہیں وہ یہ سوال کیوں نہ کریں؟ اور ان کے لئے قرآنی استشہادات اور ساتھ ساتھ ان کے اکابر کی تصریحات اور حدیث و تاریخ کے واقعات میں ان کے اس قسم کے بلکہ جملہ اعتراضات کے منہ توڑ جوابات موجود بھی ہیں اور علمائے مناظرہ سے وہ منہ کی کھاتے ہیں نتیجتہً بعض کو ہدایت بھی ہو جاتی ہے لیکن تعجب ہے ان شیعہ افراد پر جو اس قسم کے سوالات کے جوابات میں سیرتِ آل محمدؐ کو ناکافی قرار دیتے ہیں ان کے دل و دماغ پر بھی وہی دشمن کی زبان سے نکلا ہوا جملہ حاوی ہے گو زبان سے حسبنا کہنے والوں سے بیزاری ہے لیکن عملاً خود اسی راہ پہ گامزن ہیں اور پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی نہیں - حالانکہ ان کو سوچنا چاہیئے کہ ہمارے اصول میں سے قرآن و اہلبیت ہر دو کے ساتھ تمسک کرنے کا حکم ہے اور ہمارا ایمان ہے۔ کہ محمدؐ و آل محمدؐ ہی قرآن کے حقیقی عالم اور مفسر ہیں اور ہمیں تسلی اور اطمینان ہے کہ قرآن ایک ایسا سربستہ راز ہے جو بغیر معجز نما کی رہنمائی کے انحلال پذیر ہو ہی نہیں سکتا - خداوند کریم ایسے فریب خوردہ افراد کو چشم معرفت عطا فرمائے اور ہم سب کو قرآن اور اہلبیت کے ساتھ قولی و فعلی تمسک کی توفیق مرحمت فرمائے (آمین)

آلِ محمدؐ سے دوری کے نتائج میں سے یہ بھی ہے کہ قرآن مجید تسکینِ جذبات کا آلہ قرار دیا گیا ہے - تصدیقِ بیانات کے لئے سچے و جھوٹے معاملہ میں قرآن بطور گواہ ہے اور قرآن مجید کی قسم تو بچوں کا ایک کھیل بن گیا ہے مساجد میں تلاوت کرنے کے لئے اتنے قرآن خوان نہیں ملتے جتنے کچہریوں میں قسم اٹھانے کے لئے حاملین قرآن دکھائی دیتے ہیں کسی کے سر پہ کسی کے ہاتھ پر کسی کی بغل میں اور کسی کے سینے سے لگا ہوا ہے پہلی دفعہ حضرت علیؑ علیہ السلام کے مقابلہ میں جنگ صفین میں قرآن کو ان اغراض کے لئے پیش کیا گیا[1] اور پھر رفتہ رفتہ یہ وبا روئی کی آگ بن کر اطراف عالم میں پھیل گئی -

نیز گداگری اور بھیک مانگنے کا ذریعہ بھی قرآن مجید کو ٹھیرایا گیا - باطہارت یا بے طہارت کا فرق نہیں - ڈیرہ اور مسجد کا امتیاز نہیں - بلکہ صحیح یا غلط کی بھی پرواہ نہیں - صرف پیسہ دو پیسہ پر منظر ہے اور طوفانِ ظلمت کے ہمہ گیر تلاطم کی حد ہو گئی کہ باجوں کی پلیٹوں میں قرآن مجید اور ریڈیائی اشاعات میں قرآن مجید - احباب ہوٹلوں میں قہوہ خانوں میں بیٹھے ہیں - تاش کھیلا جا رہا ہے - نرد و شطرنج وغیرہ کی محفل گرم ہے شراب و کباب میں انہماک ہے اور محبوب کے ساتھ بے تکلفانہ مکالمات جاری ہیں اور ادھر ساتھ ہی باجہ میں ریڈیو میں قرآن خوانی بھی شروع ہے - غضب یہ کہ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی - اور ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں - خدا سب مومنین کو اس قسم کی جملہ روحانی وباؤں سے محفوظ رکھے -

[1] تاریخ طبری جلد ۴ اور الامامت والسیاست اور تاریخ الخلفاء وغیرہ میں امیر شام کی فوج کا قرآن کو بلند کرنا مذکور ہے - 'منہ'

نیز قرآن مجید کو ترتیل سے پڑھنے کے متعلق قرآن کے ارشاد پاک کے ساتھ جو اہل بیت عصمتؑ کی طرف سے فرمائشات صادر ہوئیں یکسر نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ خصوصاً طبقۂ حفاظ میں تو عموماً اس چیز کا خیال تک نہیں۔ قرآن کو انتہائی تیزی سے پڑھنا حافظ صاحب کا کمال سمجھا گیا ہے اور اسی تیز خوانی کو قرآن مجید کی اہم خدمت تصور کر لیا گیا ہے حتیٰ کہ تین یا چار گھنٹوں میں پورے قرآن کو ختم کر لینے والا بہت بڑا حافظ سمجھا جاتا ہے حالانکہ معصوم نے ایک پورے دن میں ختم قرآن کرنے کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے متعلق احادیث ترتیل کے بیان میں گذر چکی ہیں۔

علومِ قرآنیہ اہلبیت عصمتؑ کے پاس ہیں

تفسیر برہان میں بروایت کافی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔

ایھا النّاس! اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہاری طرف رسول بھیجا اور سچی کتاب نازل فرمائی۔ حالانکہ تم لوگ کتاب اور کتاب کے نازل کرنے والے سے غافل تھے رسولؐ اور اس کے بھیجنے والے سے بے خبر تھے۔ رسولوں کے گذر جانے سے ایک عرصہ گذر چکا تھا۔ امتیں لمبی نیند سو چکی تھیں۔ احکام کمزور ہو چکے تھے۔ حق سے چشم کوری۔ ظلم میں کجروی اور دین میں بے برکتی عام ہو چکی تھی۔ گلزار جنت دنیا میں پژمردگی کی بنا پر گرمی کی آگ پڑ رہی تھی۔ ٹہنیاں خشک پتے مردہ پھلوں سے مایوسی اور پانیوں میں کمی رونما تھی۔ ہدایت کے نشانات کہنہ اور گمراہی کے علم بلند تھے۔ دنیا دنیا والوں کے سامنے بدنما شکل میں ظاہر تھی۔ اس کا ثمر فتنہ اور ذائقہ بد تھا۔ باطن میں خوف و ہراس اور ظاہر میں تلوار نمایاں تھی۔ گویا تم لوگ پوری طرح تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ اہل دنیا کی آنکھیں اندھی اور روشن دن سیاہ ہو چکے تھے۔ قطع رحمی، خونریزی اور لڑکیوں کا زندہ در گور کرنا عام مشغلہ تھا اور یہ سب کچھ عیش پسندی اور خوش باشی کے لئے محبوب عام تھا۔ وہ لوگ نہ اللہ سے ثواب کے اُمیدوار تھے اور نہ اس کے عذاب سے خوفزدہ و ترساں تھے وہ چشم کور زندہ تھے اور مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن تھے۔

پس حضور رسالتمآبؐ سابقہ شریعتوں کی نسخ اور کتب متقدمہ کی تصدیق لے کر تشریف لائے۔ جس میں حلال و حرام کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اور وہ قرآن مجید ہے پس اس کے ساتھ کلام کرو۔ لیکن یاد رکھو) وہ ہرگز تمہارے ساتھ کلام نہیں کرے گا (یعنی تم اس کے رموز و اسرار پر مطلع نہیں ہو سکو گے) البتہ میں تم کو اس کے متعلق خبریں دے سکتا ہوں۔ اس میں ماضی و مستقبل حتیٰ کہ قیامت تک کا علم ہے۔ تمہارے روزمرہ کے احکام باہمی نزاعات کے فیصلے سب اس میں موجود ہیں۔ لیکن مجھ سے اگر اس کے متعلق دریافت کرو گے تو تمہیں بتلاؤں گا۔

(۲) بروایت مرازم امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند کریم نے قرآن مجید میں ہر شئے کو وضاحت سے بیان

فرمایا ہے اور ضروریات انسانی کے متعلق کوئی ایسی فروگذاشت نہیں کی کہ کوئی کہے ۔ کاش قرآن میں یہ بات ہوتی ۔ بلکہ خداوند کریم نے سب کچھ قرآن مجید میں بیان فرما دیا ہے ۔

(۳) بروایت معلی بن خنیس آپ نے فرمایا کہ کسی بھی معاملہ میں دو آدمیوں کا تبادلہ خیالات نہیں ہوتا ۔ مگر یہ کہ اس کی اصل قرآن مجید میں ہوا کرتی ہے مگر عام انسانی عقول کی رسائی سے بالاتر ہے ۔

(۴) بروایت سماعہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے ۔ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آیا ہر چیز کتاب اللہ اور سنت نبوی میں موجود ہے ۔ یا لوگوں کا بے بنیاد دعویٰ اور خود ساختہ مقولہ ہے ؟ تو آپ نے فرمایا کہ بے شک ہر شئے کتاب و سنت میں موجود ہے ۔

(۵) بروایت اسماعیل بن جابر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اور آئندہ کی تمام خبریں موجود ہیں اور تمہارے معاملات کا حل بھی موجود ہے اور ہم ان چیزوں کو جانتے ہیں

(۶) عبدالاعلیٰ بن اعین سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں زمانہ بچپنے سے علم کتاب کو جانتا ہوں ۔ حالانکہ اس میں ابتداء خلقت سے لے کر قیامت تک کے تمام واقعات موجود ہیں اور اس میں آسمان و زمین جنت و نار اور کان و مایکون کی خبریں موجود ہیں اور میں ان کو اس طرح جانتا ہوں ۔ جس طرح اپنی ہتھیلی کو جانتا ہوں ۔

ہمارے نزدیک قرآن اور اہل بیت دونوں واجب الاتباع ہیں اور قرآن مجید کے حقیقی عالم صرف اہل بیتؑ ہی ہیں ۔ بنا بریں عوام جہلاء کے دلوں میں اس جنون کا مسلط ہونا کہ ہر شئی کا ثبوت قرآن ہی سے ہو ۔ قطعاً مبنی برانصاف نہیں ۔ البتہ یہ فقرہ ان لوگوں کو زیبا ہے جو حسبنا کہہ کر آل محمدؐ سے کنارہ کش ہو گئے اور ثقلین سے تمسک کرنے کا حکم رد کر دیا ۔ ہمارا تو ایمان اور اعتقاد ہے کہ جس طرح عہدِ رسالت میں قرآن فہمی کے لئے ہمیں جناب رسالتمآبؐ کی تفسیر و تاویل کی احتیاج تھی ۔ اسی طرح دور نبوی سے لے کر تا قیام قیامت ان کے صحیح جانشینوں کی توضیحات کے ہم محتاج ہیں ۔ ہم جس طرح ایمان رکھتے ہیں کہ ہر خشک و تر کا علم قرآن مجید میں ہے اسی طرح ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ ہر شے کا احصاء و شمار امام مبین کے پاس ہے ایک طرف کتاب مبین میں ہر چیز کا حصر بتلایا گیا ہے اور دوسری طرف امام مبین میں ہر شئے کا احصار کر دیا گیا ہے ۔ گویا ان دونوں حصروں سے یہ ثابت ہوا کہ کتاب مبین اور امام مبین ایک دوسرے سے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

(۷) فی البرھان عن ابن عباس عن امیرالمومنین اِنَّهٗ قَالَ اَنَا وَاللّٰہِ الْاِمَامُ الْمُبِیْنُ اُبَیِّنُ الْحَقَّ مِنَ الْبَاطِلِ وَرِثْتُهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ

برہان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا واللہ میں ہی وہ امام مبین ہوں ۔ جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرسکے اور یہ چیز مجھے جناب رسالتمآبؐ سے ورثہ میں پہنچی ہے ۔

(۸) تفسیر برہان میں بسند ابن بابویہ منقول ہے کہ جب یہ آیت اتری ۔ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِيْ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۔ تو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دریافت کرنے لگے کہ یا رسول اللہ کیا اس سے مراد تورات ہے ؟ آپ نے فرمایا

نہیں۔ پھر سوال کیا کہ کیا انجیل مراد ہے تو آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر پوچھا کیا قرآن مراد ہے؟ فرمایا نہیں۔ اتنے میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام تشریف لائے۔ تو آپ نے فرمایا یہی وہ امام مبین ہے جس کے اندر اللہ نے ہر شے کے علم کا احصا کیا ہے۔ بہر کیف اس مطلب کی احادیث بکثرت موجود ہیں۔ جو انشاء اللہ اپنے مناسب مقامات پہ مذکور ہوں گی لیکن اس مقام پہ تتمہ کے طور پہ ایک دو احادیث پیش کرتا ہوں تاکہ مطلب کی وضاحت پورے طور پہ ہو جائے۔

بارہ امام بفرمان پیغمبرؐ[۱]

(۱) تفسیر برہان میں سلیم بن قیس ہلالی سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ جناب رسالتمآبؐ پر کوئی آیت ایسی نہیں اتری جو انہوں نے مجھے پڑھائی لکھائی نہ ہو۔ اور میں نے لکھی نہ ہو۔ مجھے انہوں نے تاویل و تفسیر ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کا علم تعلیم فرمایا اور میرے لئے اللہ سے حفظ و فہم کی دعا طلب کی۔ پس اس کے بعد مجھے کتاب اللہ سے کسی آیت کا جناب رسالتمآبؐ کے تعلیم کردہ علمی مطالب میں سے کسی علمی نکتہ کا کبھی نسیان نہیں ہوا۔ حلال و حرام، امر و نہی گذشتہ و آئندہ کی باتیں اور گناہ و ثواب کے متعلق کوئی ایسا امر نہیں جو انہوں نے مجھے تعلیم نہ فرمایا ہو اور میں نے بھی ان تعلیم کردہ اشیاء کو اس طرح حفظ کیا ہے کہ ایک حرف تک فراموش نہیں ہوا۔ پھر جناب رسالتمآبؐ نے میرے سینہ پہ ہاتھ رکھ کر دعا مانگی کہ خدا میرے سینہ کو علم و فہم حکمت اور نور سے ایسا پُر کرے کہ کوئی چیز فراموش نہ ہونے پائے اور غیر مکتوب مطالب میں سے کوئی چیز فوت نہ ہونے پائے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا آپ کو میرے متعلق نسیان کا کوئی خطرہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا نہیں! مجھے اپنے پروردگار نے خبر دی ہے کہ اس نے میری دعا تیرے متعلق اور تیرے شرکاء کے متعلق قبول فرمائی ہے (جو تیرے بعد ہوں گے) میں نے پوچھا یا رسول اللہ! کون لوگ میرے شرکاء ہیں جو میرے بعد ہوں گے؟ فرمایا وہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر خیر خدا نے اپنے اور میرے نام کے ساتھ کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (اللہ اور رسولؐ اور صاحبان امر کی اطاعت کرو) میں نے عرض کی وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ سب میرے اوصیاء ہیں اور حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے یہ سب کے سب ہادی و مہدی ہوں گے۔ ان کو چھوڑنے والا ان کو ضرر نہ پہنچا پائے گا۔ وہ قرآن کے ساتھ ہوں گے اور قرآن ان کے ساتھ ہوگا۔ قرآن ان کو نہ چھوڑے گا اور وہ قرآن کو نہ چھوڑیں گے۔ میری امت پر اللہ کی مدد انہی کے ذریعہ سے نازل ہوگی انہی کے ذریعہ سے مینہ برسے گا اور انہی کے وسیلہ سے مصائب دور ہوں گے۔ اور انہی کے واسطہ سے دعا مستجاب ہوگی میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ ان کے نام بتلائیں۔ آپ نے فرمایا ایک تو میرا یہ فرزند اور اپنا ہاتھ مبارک امام حسن علیہ السلام

---

[۱] از صفحہ ۱۳۸ تا صفحہ ۱۴۰ بعض احادیث نقل کی گئی ہیں۔ (مصنف)

کے سر پر رکھا، پھر امام حسینؑ کے سر پہ ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ دوسرا میرا یہ فرزند پھر اس کا ایک فرزند ہوگا جس کا نام علی ہوگا۔ اور تیری موجودگی میں متولد ہوگا۔ اس کو میرے سلام پہنچا دینا۔ اس کے بعد حضورؐ نے میری اولاد سے بارہ اماموں کی تعداد کا پورا ہونا ذکر فرمایا۔ تو میں نے پھر عرض کی کہ قبلہ آپ ان کے نام تو بتلائیں۔ پس آپ نے پھر ایک ایک کر کے سب کے نام بتلا دیئے

پس حضرت امیر المومنین علیہ السّلام نے سُلیم بن قیس راوی حدیث سے خطاب کر کے فرمایا۔ خدا کی قسم انہی میں سے مہدی امّت ہوگا جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ خدا کی قسم میں ان لوگوں کو بھی پہچانتا ہوں جو رکن اور مقام کے درمیان ان کی بیعت کریں گے۔ صرف ان کو نہیں بلکہ ان کے باپ دادا اور سارے قبیلہ کو جانتا ہوں

(۸) بروایت کافی حضرت محمد باقر علیہ السّلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا۔ قرآن مجید کے پورے ظاہر و باطن کے علم کا دعویٰ سوائے اوصیاء کے اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

(۹) ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں پورے قرآن کا جامع ہوں جس طرح کہ وہ اترا تھا۔ تو وہ جھوٹا ہے بلکہ جس طرح اترا تھا۔ اسی طرح پورے طور پہ اس کو جمع اور حفظ سوائے علیؑ بن ابی طالبؑ کے اور کوئی کر ہی نہیں سکا۔ اور پھر وہ آئمہ کے پاس ہے جو ان کے اوصیاء ہیں۔

(۱۰) امام جعفر صادق علیہ السّلام سے اس آیت کے متعلق ہے۔ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ۔ (بلکہ وہ آیات بیّنات ہیں۔ ان لوگوں کے سینوں میں کہ علم دیا گیا ہے ان کو) آپ نے فرمایا اس سے مراد آئمہ علیہم السّلام ہیں۔

(۱۱) ایک روایت میں آپ نے فرمایا کتاب اللہ میں ماضی و مستقبل کی خبریں اور تمہارے فیصلے موجود ہیں۔ جن کو ہم جانتے ہیں اور نیز ہم راسخون فی العلم ہیں اور ہم ہی اس کی تاویل کو جانتے ہیں۔

بس ان ہی احادیث پہ اکتفا کرتا ہوں۔ آل محمدؐ کے علم کا اندازہ کرنا انسانی طاقت سے بلند و بالاتر مرحلہ ہے بس یہی اعتقاد ہے کہ خدا نے اہل بیت عصمتؑ کو جناب رسالتمآبؐ کے بعد تمام کائنات پہ جملہ کمالات میں فوقیت عطا فرمائی ہے۔ ان کے کسی کمال کی حدود معین کرنا ہماری رسائی سے بعید ہے۔

نوٹ:۔ اختصار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حوالہ کتب بعض حدیثوں سے حذف کر دیا ہے نیز اصلی عبارت کی بجائے صرف ترجمہ بھی اسی نظریہ کے ماتحت ہے)

تائیدِ مطلب

خداوند کریم کا ارشاد ہے۔ وَلَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔ یہ صیغہ نفی یا تو معنیٰ انشاء میں استعمال ہے اور یا معنیٰ خبر میں ہے۔ اگر معنیٰ انشاء میں ہے تو آیت مجیدہ کا معنی ہوگا (اس کو نہ مس کریں مگر وہ لوگ جو پاک ہیں) اور اگر معنیٰ خبر میں ہے تو آیت مجیدہ کا معنیٰ یہ ہوگا اس کو مس نہیں کرتے مگر وہ لوگ جو طاہر ہیں۔

پس اگر معنیٰ انشاء میں ہو اور نہی کے قائم مقام ہو تو یہ ایک حکم تشریعی مراد ہے اور قرآن کے مس کے متعلق جو احکام تفصیل کے ساتھ کتب فقہیہ اور رسائل عملیہ میں مذکور ہیں۔ انہی کی طرف اشارہ ہے یعنی بغیر طہارت کے قرآن کا چھونا حرام ہے اور طہارت سے مراد صرف طہارت از خبث ہی نہیں۔ بلکہ حدث سے طہارت بھی مطلوب ہے یعنی بغیر وضو یا اغسال ضروریہ کے یا بحالت اضطرار

بغیر تیمم کے قرآن مجید کا مس کرنا حرام ہے۔ صرف ہاتھ لگانے تک محدود نہیں بلکہ تمام اعضاء میں سے کسی عضو کا کوئی حصہ قرآن کو لگانا حرام ہے۔ اسی طرح نجس سیاہی کے ساتھ قرآنی آیات کا لکھنا بھی حرام ہے[1]۔ قرآن مجید کے حروف تشدید، مدیں حرکات اور سکنات وغیرہ سب کا یہی حکم ہے اور جس طرح قلم سے لکھے ہوئے قرآن کو حدث یا خبث کے ساتھ مس نہیں کیا جا سکتا اسی طرح پتھر، دیوار اور فرش وغیرہ پر کندہ شدہ الفاظ قرآن کا مس کرنا بھی بغیر طہارت کے حرام ہے۔ خواہ حروف کے مقامات کو کرید لیا جائے۔ یا باقی جگہ کرید کر حروف کو ابھرا ہوا رکھا جائے۔ اسی طرح بستروں چادروں اور دریوں وغیرہ پر نقش شدہ آیات خواہ بنائی سے لکھی جائیں۔ یا بعد میں ان کا اضافہ بذریعہ دستکاری صنعت کے ہوا ہو۔ اسی طرح کپڑے یا کاغذ کے حروف بنا کر الفاظ قرآن کی ترتیب میں جوڑنے کے بعد یہی حکم ہے۔

مسئلہ:۔ جس طرح قرآن مجید کا بلا طہارت مس کرنا حرام ہے۔ اسی طرح ہر وہ فعل جس سے قرآن کی توہین لازم آئے حرام ہے۔

مسئلہ:۔ بنا بریں قرآن مجید کافر کے حوالہ کرنا حرام ہے اور ان کے قبضہ میں ہو تو حتی الامکان اس کا حاصل کرنا واجب ہے۔

مسئلہ:۔ نیز مقام نجاست سے یا ہر وہ مقام جہاں قرآن کی توہین ہو اس سے قرآن کا اٹھا لینا ضروری ہے۔

لیکن اگر لَا یَمَسُّہٗ کو خبر کے معنی میں لیا جائے (یعنی اس کو مس نہیں کرتے مگر وہ لوگ جو پاک ہیں) تو ظاہراً یہ معنی درست نہیں۔ کیونکہ یہ خبر ہے اور خبر اگر واقع کے مطابق نہ ہو تو جھوٹ ہوا کرتا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ کافروں کے پاس قرآن کے سینکڑوں نسخے موجود ہیں۔ وہ انہیں مس بھی کرتے ہیں۔ بلکہ پاکستان کے وجود سے پہلے لاہور و پشاور میں سنت سنگھ و کھڑک سنگھ کے مطابع میں ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید طبع ہوئے۔ نولکشور لکھنؤ نے اس سلسلہ میں بڑی خدمات انجام دیں۔ بہر کیف اگر آیت مجیدہ کے اس جملہ کو خبر قرار دیا جائے تو یقیناً خلاف واقع ہوگا اور کذب لازم آئے گا وَتَعَالَی اللّٰہُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيرًا

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ ایک امر تکوینی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی قرآن کے حقائق و دقائق رموز و اسرار سے سوائے ذوات مطہرہ کے کسی کو مس تام حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ پاک اور مطہر ذاتیں کون ہیں؟ تو اس کا جواب آیۃ تطہیر نے واضح کر دیا اور علمائے امت کا اجماع ہے کہ اس سے مراد حضرات خمسہ نجباء ہیں۔ محمدؐ۔ علیؑ۔ فاطمہؑ۔ حسنؑ۔ حسینؑ علیہم آلاف التحیۃ والسلام۔ آیۃ تطہیر کا شان نزول اور مزید توضیح اپنے مقام پر آئے گی۔

لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ کا مطلب ہے کہ قرآن کا حقیقی مس اور لگاؤ کسی کو نہیں سوائے مطہرین کے۔

اور آیۃ تطہیر کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت عصمت کے علاوہ کوئی بھی مطہر نہیں۔ کیونکہ شان نزول صرف انہی حضرات سے مختص ہے پس دونوں آیتوں کی تطبیق سے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن سے حقیقی مس اور لگاؤ کسی کو نہیں سوائے محمدؐ و آل محمدؐ کے علیہم الصلوٰۃ والسلام

اقول:۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ وَاَھْلُ الْبَیْتِ ھُمُ الْمُطَھَّرُوْنَ۔ فینتج من الحصرین المذکورین۔ ان القرآن لا یمسہ الا اھل البیت وھذا واضح لا ستره فیه ولما کان المراد من المس ھھنا المس الحقیقی

[1] اسی طرح نجس کاغذ پر قرآن کی کتابت بھی حرام ہے۔ منہ

لا المس الظاهری کما مرّ بیانه والمس الحقیقی هو الاطلاع علی رموزه و معارفه والاحاطة بحقائقه و دقائقه فثبت انحصار رسوخ العلم فیهم علیهم السلام۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن مجید کے حقیقی علماء محمدؐ و آل محمدؐ ہی ہیں جو زیور تطہیر سے آراستہ ہیں

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیۂ مجیدہ لا یمسّهٗ الّا المطهّرون یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس کا مس صرف مطہرین کو ہی کو حاصل ہے یعنی علوم قرآنیہ صرف معصومین ہی کے پاس ہیں تو چونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی سب کے سب معصوم ہیں۔ لہٰذا وہ بھی گویا قرآن کا علم رکھتے تھے۔ حالانکہ یہ خلاف منقول ہونے کے علاوہ اختصاص محمدؐ و آل محمدؐ کے منافی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیہ شریفہ کا معنی ہے قرآن سے حقیقی تعلق (علم) صرف مطہرین اور معصومین کو ہی حاصل ہے یعنی جس کو قرآن مجید کا علم کامل عطا ہوا ہے۔ وہ معصوم اور مطہر ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو بھی معصوم و مطہر ہے وہ عالم قرآن بھی ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ ہر نبی معصوم ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ ہر معصوم نبی ہے۔ اسی طرح ہر عالم قرآن معصوم ہے لیکن اس کا اُلٹ کہ ہر معصوم عالم قرآن ہے درست نہیں۔

فاقول: کل ماس و عالم للقرآن مطهر لقوله ولا یمسّهٗ الّا المطهّرون۔ فهو موجبة کلیة والموجبة الکلیة لا تنعکس کلیة کما یعلم کل من له ادنی مساس بالمیزان بل هی تنعکس موجبة جزئیة فعکس الکلیة بعض المطهرین یمسّونه و یعلمونه والمراد من البعض هم اهلبیت النبوّة فهم مع القرآن والقرآن معهم کما ثبت متواترا عن النبی صلی اللّٰه علیه و اٰله وسلّم وقد ذکرنا بعض الاخبار الواردة فی هذا وسیاتی بعضها فی مطاوی العنادین الآتیة انشاء اللّٰه۔

پس ثابت ہوا کہ علوم قرآنیہ کما حقہٗ صرف اہل بیتِ عصمت ہی کے پاس ہیں۔ اس مطلب کی زیادہ توضیح بعد کی ابحاث میں ہوگی اس عنوان کے تحت ہم جو کچھ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ وہ عرض کیا جا چکا ہے اور اتنا ہی کافی ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر و تاویل

فی مجمع البیان۔ اَلتَّفْسِیْرُ کَشْفُ الْمُرَادِ عَنِ اللَّفْظِ الْمُشْکِلِ وَالتَّاوِیْلُ رَدُّ الْمُحْتَمَلَیْنِ اِلٰی مَا یُطَابِقُ الظَّاهِر

تفسیر کا معنی ہے لفظ مشکل کی مراد کو واضح کرنا تاویل کا معنی ہے دو احتمالوں میں سے ایک کا ظاہر کی مطابقت کی طرف لانا۔

ابن عباس سے تفسیر کی چار قسمیں منقول ہیں۔

(۱) وہ تفسیر جس کی جہالت سے کوئی شخص معذور نہیں جیسے توحید کی دلیلیں۔
(۲) وہ تفسیر جس کو اہلِ لسان انداز بیان سے سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے حقائق لغویہ اور محاورات عرفیہ۔
(۳) وہ تفسیر جس کو صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے تاویل متشابہات
(۴) وہ تفسیر جس کو سوائے ذاتِ علام الغیوب کے کوئی نہیں جان سکتا۔ جیسے قیامت کا آنا۔
علامہ طبرسی صاحب تفسیر مجمع البیان نے تفسیر کو چار قسموں میں تقسیم فرمایا ہے۔
(۱) یہ کہ نہ الفاظ مجملہ ہوں اور نہ معانی میں ایک سے زیادہ کا احتمال ہو۔ جیسے آیۂ قصاص اور ادلہ توحید اس قسم کی تفسیر کو ہر واقفِ عربیت جان سکتا ہے۔
(۲) وہ معانی جن میں اجمال پایا جاتا ہے۔ ان کی تفسیر کو صرف معصومینؑ ہی جان سکتے ہیں جیسے طریقِ نماز و زکوٰۃ وغیرہ
(۳) وہ مقام جہاں ایک سے زیادہ معانی کا احتمال ہو۔ اب یہاں دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ صرف ایک احتمال مراد ہو اور باقی احتمالات کی قطعاً نفی ہو اور دوسری یہ کہ سب احتمالات مراد لئے جا سکتے ہوں۔ پہلی صورت میں اپنی رائے سے ایک معنی کی تعیین کرنا بغیر دلیل قطعی حرام و ممنوع ہے اور دوسری صورت میں ایک احتمال کو یقین و قطع کے طور پر لینا بغیر نص صریح کے ناجائز ہے اور اس بارہ میں اقوال مفسرین پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک اسکی تاویل پر اجماع متحقق نہ ہو
پس نتیجہ یہی ہوا کہ معانی لغویہ اور محاوراتِ عرفیہ میں جہاں اجمال یا معانی کثیرہ کا احتمال نہ ہو۔ یا محکماتِ قرآن جہاں کسی تاویل کی گنجائش تک نہ ہو۔ کے علاوہ پورے قرآن کی تفسیر و تاویل محمدؐ و آل محمدؐ کی نشاندہی کے بغیر تفسیر بالرائے ہے اپنے استحسانات و قیاسات کو عمل میں لانا ناجائز ہے اور اپنی ذاتی رائے کی بنا پر قطعی اور یقینی طور پر ایک معنی کی تخصیص یا توجیہہ و تاویل ممنوع ہے۔ البتہ صرف احتمال کے طور پر بیان کرنا حرام نہیں اور نہ اقوال مفسرین کو ذکر کرنا حرام ہے۔ اگر اقوالِ متعددہ اور احتمالاتِ کثیرہ میں سے کسی قول یا احتمال کی تائید فرمانِ امام سے نہ ہو تو اپنی رائے سے ترجیح پیدا کرنا حرام ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے امام کوفہ کی گفتگو

بحار الانوار جلد ا میں احتجاج سے منقول ہے ایک دفعہ ابو حنیفہ مدینہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو آپ نے دریافت فرمایا۔ کہ کیا تو مفتیٔ عراق ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ہاں۔ پھر آپ نے پوچھا۔ کہ کس چیز سے فتویٰ دیتا ہے؟ جواب دیا کتاب اللہ سے۔ آپ نے فرمایا کیا تو کتاب اللہ کے ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کو جانتا ہے؟ کہا ہاں! فرمایا کہ خدا فرماتا ہے وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ (ہم نے اس میں چلنا مقدر کیا پس تم اس میں دن رات امن سے سیر کرو) فرمایا یہ کس زمین کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں شب و روز انسان با امن سفر کرے اور کسی دشمن، چور

ڈاکو بلکہ حشرات الارض یا درندوں وغیرہ کا کوئی خطرہ اس کو لاحق نہ ہو؟ کہنے لگا حضور! مکہ و مدینہ کے درمیان والی زمین مراد ہے۔ یہ سُن کر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام حاضرین مجلس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ خدارا سچ سچ کہو جب تم مکہ اور مدینہ کی طرف سفر کرتے ہو تو تم کو جانی یا مالی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا؟ کہنے لگے۔ کیوں نہیں (بڑے خطرے لاحق ہوتے ہیں۔ آپ نے ابوحنیفہ کو خطاب کر کے فرمایا۔ وائے ہو تیرے اوپر اے ابوحنیفہ خدا تو غلط بات نہیں کہتا۔ ابوحنیفہ سے کوئی جواب نہ بن سکا۔ پس خاموش بیٹھا رہا۔

پھر آپ نے فرمایا۔ خدا فرماتا ہے وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (جو بھی اس میں داخل ہوگا باامن رہے گا) بتا اس سے کون سا مقام مراد ہے؟ ابوحنیفہ نے جواب دیا۔ بیت الحرم (کعبہ) مراد ہے۔ آپ نے فرمایا (حاضرین سے متوجہ ہو کر۔ کیا عبداللہ بن زبیر اور سعید بن جبیر کے متعلق تمہیں معلوم ہے کہ وہ دونوں اس مقام پر قتل سے نہیں بچ سکے تھے۔ سب نے جواب دیا کہ ہاں! بے شک وہ دونوں اسی مقام پر قتل کر دیئے گئے۔ آپ نے پھر ابوحنیفہ کو خطاب کر کے فرمایا۔ وائے ہو تجھ پر خدا تو سچ ہی کہتا ہے (ابوحنیفہ خاموش رہا) پھر کہنے لگا۔ کہ میں کتاب اللہ کو نہیں جانتا۔ بلکہ میں تو قیاس سے فتویٰ دیا کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تیرے قیاس میں قتل اور زنا میں سے کون سا گناہ زیادہ سخت ہے؟ جواب دیا کہ قتل سخت ترین گناہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر قتل کے لئے گواہ دو اور زنا کے لئے گواہ چار کیوں ضروری سمجھے گئے ہیں۔ حالانکہ قیاس کے اعتبار سے معاملہ برعکس ہونا چاہیئے۔ یعنی قتل کے لئے چار اور زنا کے لئے دو گواہ ہوں۔ پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ نماز افضل ہے یا روزہ؟ تو جواب دیا کہ روزہ سے نماز افضل ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ حائض عورت پر نماز کی قضا معاف اور روزہ کی قضا واجب کیوں ہے؟ حالانکہ نماز افضل ہے اس کی قضا معاف نہ ہوتی اور روزہ کی قضا معاف ہوتی۔ پھر آپ نے سوال کیا کہ پیشاب زیادہ نجس ہے یا منی؟ تو ابوحنیفہ نے کہا۔ پیشاب زیادہ نجس ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قیاس کی رُو سے پھر پیشاب کے لئے غسل واجب ہونا چاہیئے اور منی کے لئے فقط استنجا کو ہی کو کافی قرار دیا جانا چاہیئے۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک معاملہ برعکس ہے (ان سوالات کے جوابات سے جب عاجز آگیا) تو کہنے لگا میں خود صاحب رائے ہوں۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا کہ ایک شخص نے اپنی اور اپنے غلام کی ایک ہی دن میں شادی کی اور ایک ہی رات میں دونوں نے اپنی بیوی سے ہمبستری کی پھر ہر دو سفر کو چلے گئے۔ دونوں عورتیں ایک ہی مکان میں تھیں اور دونوں کے ہاں ایک ہی دن میں لڑکے پیدا ہوئے اتفاق سے مکان کی چھت گری اور دونوں عورتیں نیچے دب کر مر گئیں اور دونوں لڑکے بالکل بچ گئے اب یہ بتا کہ تیری رائے میں آقا کون ہے اور غلام کون؟ اور مالک کے مرنے کے بعد ان دونوں بچوں میں سے وارث کون ہوگا؟ اور ورثہ کون؟ یہ سُنتے ہی وہ (جھلا کر) بولا میں تو صرف حدود ہی کو جانتا ہوں پس آپ نے پھر استفسار فرمایا کہ اگر نابینا کسی بینا کی آنکھ نکال دے یا اپاہج کسی تندرست کا پاؤں کاٹ دے تو تیری رائے میں مجرم پر حد کیسے جاری ہوگی؟ جواب سے عاجز ہو کر کہنے لگا کہ میں بعثتِ انبیاء کے مسائل اچھی طرح جانتا ہوں اور بس پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب خداوند کریم نے حضرت

موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرعون کی طرف بھیجا تو فرمایا۔

قُولَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ترجمہ:۔ اس فرعون کے ساتھ نرم نرم باتیں کرنا شائد وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے کیا لَعَلَّ کا استعمال مقام شک پر ہوتا ہے؟ جواب دیا ہاں! آپ نے فرمایا کیا خدا کو شک تھا؟ تو کہنے لگا جی۔ مجھے اس کا علم نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے قرآن سے فتویٰ دینے کا دعویٰ کیا حالانکہ تو وارث کتاب نہیں اور تو اپنے آپ کو صاحب قیاس قرار دیتا ہے حالانکہ پہلا قیاس کرنے والا ابلیس ہے اور (یاد رکھو) خدا کا دین قیاس کی بنیادوں پر قائم نہیں۔ پھر تو دعویٰ کرتا ہے کہ میں خود صاحب رائے ہوں حالانکہ رائے کا حق صرف جناب رسالتمآبؐ کو ہی حاصل تھا۔ اور رائے صرف انہی کی درست ہے باقی لوگوں کی رائے میں غلطی واقع ہو سکتی ہے چنانچہ ارشادِ قدرت ہے اُحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ۔ اے رسولؐ ان لوگوں کے درمیان اپنی رائے سے فیصلہ کیا کرو جو خدا نے تمہیں عطا کی ہے یہ بات صرف جناب رسالتمآبؐ کے لئے ہی ہے اور پھر تو اپنے تئیں خدا کی حدود کا عالم سمجھتا ہے حالانکہ ان کو کماحقہٗ وہی سمجھ سکتا ہے جس پر نازل ہوئیں۔ نیز تو بعثت انبیاء کے علم کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ خود انبیاء تجھ سے اس چیز کو بہتر جانتے ہیں اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے۔ ابوحنیفہ (جعفر صادقؑ) فرزند رسولؐ کے پاس گیا اور انہوں نے اس سے کسی بات کا سوال تک نہ کیا اس کے علمی وقار سے مرعوب ہو گئے) تو میں تجھ سے کچھ نہ پوچھتا۔ پس جا اور اگر قیاس کا عامل ہے تو اس پر عمل کر (راوی) کہنے لگا۔ اب خدا کے دین میں قیاس و رائے کو دخل نہ دوں گا۔ آپ نے فرمایا حب ریاست ہرگز تیرا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ جس طرح اس نے تجھ سے پہلے لوگوں کا پیچھا نہ چھوڑا۔ غرضیکہ ان تمام سوالات کا مقصد صرف مسئول عنہٗ کی نااہلیت کا اظہار تھا اور درس دینا تھا کہ مطالب قرآنیہ امام حق کی راہنمائی کے بغیر قطعاً حل نہیں ہو سکتے۔

اہلبیت اطہار سے کلام اللہ کی تاویل و تفسیر دریافت نہ کرنے سے اور اپنے استحسانات عقلیہ اور آرائے مخترعہ پر عمل کرنے سے بہت فرقے پیدا ہو گئے۔ بعض لوگوں نے بعض آیات کے ظاہر سے دھوکا کھا کر خدا کا جسم مان لیا (مجسمہ کہلائے اور بعض جبر کے قائل ہو گئے (مجبرہ) کہلائے۔ حالانکہ قرآن مجید تو ایک سیدھی اور پختہ شاہراہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے چنانچہ فرماتا ہے (يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ)

آئمہ ھُدیٰ کون ہیں

تفسیر برہان میں بعض کتب امامیہ سے بروایت عبدالرحمٰن بن سمرہ منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا جو لوگ اللہ کے دین میں مجادلہ (جھگڑا) کرتے ہیں۔ ان پر خدا نے ستر نبیوں کی زبان سے لعنت بھیجی ہے اور جو لوگ اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ترجمہ:۔ آیاتِ خدا میں صرف کافر لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں۔ ان کا شہروں میں آمد و رفت کرنا تمہیں دھوکا نہ دے) اور جو شخص قرآن مجید کی تفسیر اپنی ذاتی رائے سے کرے اس نے اللہ پر افترا بندی کی اور جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دے اس پر آسمان اور زمین کے فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔ ہر بدعت گمراہی

ہے اور ہر گمراہی جہنم کا راستہ ہے عبدالرحمٰن بن سمرہ کہتا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے نجات کا رستہ بتلائیے۔ آپ نے فرمایا اے ابن سمرہ جب لوگوں کی خواہشات میں اختلاف پیدا ہو جائے اور رائیں جُدا جُدا ہو جائیں تو علیؑ بن ابی طالبؑ کا دامن پکڑو کیونکہ وہی میری امت کا امام اور میرے بعد میرا خلیفہ ہے اور وہی حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والا ہے جو اس سے (احکام دین) دریافت کرے گا تو وہ اس کو بتلائیں گے اور جو اس سے ہدایت طلب کرے گا وہ اس کو ہدایت کریں گے اور جو ان سے طالب حق ہوگا تو وہ ان کے پاس حق کو پائے گا اور جو ان کے پاس ہدایت ڈھونڈھے گا وہ پائے گا اور جو ان سے پناہ چاہے گا امن میں رہے گا اور جو ان سے تمسک رکھے گا وہ اس کو نجات دیں گے اور جو ان کی اقتدا کرے گا۔ وہ اس کی رہبری فرمائیں گے۔ اے ابن سمرہ صلح کا خواہاں وہ شخص ہے جو اس سے صلح رکھے اور اس سے اتحاد و دوستی رکھے اور ہلاک ہوگا وہ شخص جو اس کو رد کرے اور اس سے دشمنی رکھے۔ اے ابن سمرہ تحقیق علیؑ مجھ سے ہے اس کی روح میری روح ہے اور اس کی طینت میری طینت ہے وہ میرا بھائی اور میں اس کا بھائی ہوں۔ وہ میری پارہ جگر فاطمہ سیدۃ نساء العالمین کا شوہر ہے اس سے میرے دو شہزادے میری امت کے دو امام جوانان جنت کے سردار حسنؑ و حسینؑ ہیں نیز انہی سے (حسینؑ کی اولاد سے) نو (امام) ہوں گے۔ ان کا نواں میری امت کا قائم ہے جو روئے زمین کو اس طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ جس طرح کہ وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

بروایت کلینی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو بات جانو تو کہو اور جو نہ جانو صاف کہہ دو کہ اللہ بہتر جانتا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان ایک آیت کو لیکر اس پر کچھ کہہ بیٹھتا ہے (اور حق سے) آسمان و زمین کے فاصلہ سے بھی دُور جا پڑتا ہے۔

نیز بروایت ابن بابویہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے بسلسلۂ اسناد آباؤ اجداد طاہرینؑ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ (حدیث قدسی) میں ذاتِ احدیت کا ارشاد ہے وہ مومن نہیں جو میرے کلام کی تفسیر اپنی رائے سے کرے اس کو میری معرفت نہیں جو مجھے میری مخلوق سے تشبیہ دے اور میرے دین پر نہیں وہ شخص جو میرے دین میں اپنے قیاس کو استعمال کرے۔

بہرکیف قرآن مجید کی تفسیر بالرائے کی حرمت کے متعلق احادیث منقولہ کتب عامہ و خاصہ سے بہت زیادہ بلکہ حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ وارد ہے کہ اگر تفسیر بالرائے واقع میں درست بھی ہو تب بھی اس کا کوئی ثواب نہیں آیات محکمات میں جہاں نہ اجمال ہو اور نہ کثرت معانی کا احتمال ہو۔ تفسیر بالرائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جہاں اجمال ہو یا کثرت معانی کا احتمال ہو وہاں اپنی جانب سے اس اجمال کا بیان بطور یقین کے یا ایک قول کی ترجیح بجز قول معصومؑ کے تفسیر بالرائے ہوگی جو حرام ہے۔

علامہ شیخ مرتضیٰ انصاری قدس سرہ نے رسائل میں تفسیر بالرائے کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اپنی نظر قاصر اور عقل فاطر سے لفظ کو خلافِ ظاہر پر محمول کرنا یا دو چند احتمالوں میں سے ایک کو ترجیح دینا۔ چنانچہ اسی کے متعلق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ لوگ متشابہات میں ہلاک ہو گئے کیوں کہ وہ معنی کی حقیقت پر اطلاع نہیں رکھتے۔ پس اپنی رائے سے اس کی تاویل وضع کرتے ہیں اور اوصیاء علیہم السلام سے سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ تاکہ وہ ان کی اس معاملہ میں صحیح رہنمائی فرما دیں۔

(۲) دلائل عقلیہ، قرائن نقلیہ اور احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کئے بغیر بادی الرائے میں جو معانی لغویہ یا مطالب عرفیہ نظر آئیں اسی پر معنی کو حمل کر لینا۔

عقل بھی اسی چیز کا مؤید ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں اپنی رائے سے فیصلہ کرنا ممنوع ہو کیونکہ قرآن مجید کی حیثیت مثلِ عام مکتوبات کے نہیں کہ جو بھی اٹھا کر پڑھے مطلب سمجھ لے۔ بلکہ عام مکتوبات میں بھی تمام مندرجہ امور کا احاطہ سوائے مکتوب الیہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بعض اوقات بعض باہمی اصطلاحات یا رموز و اشارات وکنایات وغیرہ کا اندراج ہوتا ہے جن کو بغیر مکتوب الیہ کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ پھر خالق کا کلام ہر شخص کیسے سمجھ سکتا ہے۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید جب ہماری ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے اور اس کے خطابات، اوامر و نواہی کا تعلق بھی ہم سے ہی ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم کو وہ سمجھ نہ آئے؟ اور ہماری ہدایت کے لئے ایسی کتاب بھیجی کیوں گئی جس کو ہم سمجھ نہ سکیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک قرآن مجید ہماری ہدایت کے واسطے ہے اور اس میں مندرجہ اوامر و نواہی کا تعلق بھی ہم سے ہے لیکن چونکہ ہمارے مواد کثیفہ میں اسقدر اہلیت نہیں کہ فیوضِ انوارِ قدسیۂ الٰہیہ سے براہِ راست استفادہ کر سکیں۔ اور اس کے خطابات کے مفاہیم کا از خود ادراک صحیح کر سکیں۔ لہٰذا اس نے اپنے کمال لطف سے اس کے سمجھانے والے بھی بھیج دیئے اس کی حکمتِ عملی پر اعتراض تو تب ہوتا کہ اس نے اپنے خطابات کی توضیح و تشریح کرنے والا کوئی نہ بھیجا ہوتا جب اس نے اپنی پاک کلام کے مدرس خود منتخب فرما کر بھیج دیئے تو ہم کیوں نہ مطالب قرآنیہ کا استفادہ ان سے کریں؟ اگر ہم ہی سے اس کے خطابات سے صحیح استفادہ کرنے کی صلاحیت تھی تو جناب رسالتمآبؐ کو خصوصی عہدۂ نبوت دے کر خدا کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو ہم بھی ان جیسے ہوتے اور یکساں طور پر قرآن کی فرمائشات کو سمجھ کر عمل کرتے۔ مثال کے طور پر ظاہری حکومتوں کے ضوابط و قوانین کی طرف نگاہ کیجئے۔ صدر مملکت یا بادشاہ کی طرف سے نافذ شدہ احکام و ضوابط تمام رعایا کے لئے یکساں طور پر ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ضلع دار یا صوبہ دار عہدہ دارانِ حکومت کی طرف بھیجے جاتے ہیں اور وہ عہدہ دار اپنے ماتحت عملۂ ملازمین کے ذریعہ سے تمام افراد رعایا تک پہنچا دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ قوانین و ضوابط شائع کر دیئے جاتے ہیں۔ کتابوں میں چھپ کر عام ہو جاتے ہیں ہر شخص خرید کر مطالعہ بھی کر سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ رعایا کا ہر فرد ہر قانونی نکتہ کو سمجھ سکے یا اس کے ہر ضابطہ کی اصطلاح کو جان سکے۔ بہر کیف اس کی مخصوص اصطلاحات اور مبہم نکات کے سمجھنے اور جاننے کے لئے حکومت کے مقرر کردہ خصوصی ذمہ دار یا حکومتی قانونی مدارس کے سند یافتہ اشخاص کے دروازہ پر دستک

دینی پڑے گی۔ ورنہ صرف قانونی کتاب کا اٹھا کر بغل میں دبا لینا کافی نہیں اور جو لوگ یہ کہیں کہ ہمیں صرف کتاب کافی ہے انہیں دنیا والے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ جب انسانوں کی لکھی ہوئی اور انسانوں کی بنی ہوئی کتاب بغیر سرکاری کتاب دان کے ہمارے لئے سودمند نہیں تو خدا کا کلام بغیر خدائی کالج کے سند یافتہ افراد کے یا بغیر عہدہ داران حکومت الہیہ کے ہمارے لئے کیونکر کافی ہو سکتا ہے؟ نیز حکومت ظاہریہ میں قانون دان اور کتاب قانون کا عالم وہ نہیں ہوا کرتا جس پر رعایا کے چند افراد مل کر قانون دان یا عالم کتاب کا اطلاق کرنے لگ جائیں یا اس کو کسی سرکاری عہدہ سے پکارنے لگ جائیں اور ایسا کرنے والے سب مجرم قرار دیئے جاتے ہیں بلکہ قانون دان وُہ ہے جس کو حکومت کی طرف سے یہ اعزاز حاصل ہو اور عہدہ دار بھی وہ ہے جس پر حکومت کی طرف سے نص ہو۔ پس خدا کی کتاب کا عالم اور اس کی جانب سے مبلغ کتاب وہی ہوگا جس کو وہ خود انتخاب فرمائے۔

قرآن مجید میں خداوندکریم نے جو صریحی طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ اس میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں لیکن دل جن لوگوں کے کج ہیں وہ فتنہ کی غرض اور تاویل کی خواہش سے متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں حالانکہ ان کی تاویل کو سوائے اللہ کے اور راسخین فی العلم کے کوئی جانتا ہی نہیں اور صاف ارشاد فرمایا۔ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (جو تم خود نہیں جانتے اہل ذکر سے دریافت کر لیا کرو) عبدالرحمٰن بن کثیر سے روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت امیرالمومنین اور آئمہ علیہم السلام ہی راسخین فی العلم ہیں۔

ابوالصباح کنانی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہم ہی راسخون فی العلم ہیں

ابوبصیر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔ ہم راسخون فی العلم ہیں۔ پس ہم ہی اس کی تاویل کو جانتے ہیں۔

ان کے علاوہ آلِ محمدؐ کے علم کے متعلق پہلے عنوانات میں کافی احادیث نقل کی جا چکی ہیں اور آئندہ عنوانات کے تحت بھی بہت کچھ ذکر ہوں گی پس تاویل قرآن میں آل محمدؐ کی رہبری کے بغیر چلنا قرآن کی حقیقت سے دُوری کا موجب ہے۔ اور خدا اور رسول کی ناراضگی کا پیش خیمہ ہے۔

ہمارے مجالس خوان بعض حضرات اس معاملہ میں نہایت لاپرواہی سے کام لیتے ہیں بلکہ دنیاوی چند روزہ عارضی نفع کی خاطر بعض لوگ تو اس امر کے انتہائی طور پر دلدادہ ہیں کہ انہیں عالم قرآن کہا جائے۔ چنانچہ ہر دَور میں ایسے افراد کی بہتات رہی ہے بلکہ قرآن مجید کے دعویٰ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ کو دیکھ کر تو ہر کہ دمہ کے دماغ میں یہی جنون سمایا ہے کہ ہر متنازعہ فیہ امر کو قرآن ہی سے حل کیا جائے اور جو ملّا نما شخص ان کے سامنے اپنی طرف سے اِدھر اُدھر کی رطب و یابس ملا کر تاویل قرآن ان کے مطلب کے موافق کر دے تو داد و تحسین اور واہ وا کے شور سے فضا گونج اٹھتی ہے اور ایسا شخص واقعی عالم قرآن سمجھا جاتا ہے اور کبھی عوام کے سامنے یہ بات کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ میں فلاں بات نہیں جانتا کیونکہ وہ اس بات میں اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اپنی بے علمی سے قرآن کی توہین کرتا رہے تو پرواہ نہیں لیکن بے علم کہلانے میں اپنی توہین ملحوظ ہوتی ہے جو قابلِ برداشت نہیں ہوتی اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر ایک عالم بعض مطالب قرآنیہ میں صحیح نظریہ

پر نہ پہنچ سکے یا کسی دقیق مقام میں الجھ جائے اور تامل کا اظہار کرے تو عوام بجائے محتاط کہنے کے اُسے جاہل اور بے علم کہنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور بخلاف اس کے اگر ایک جاہل ناخدا ترس بے سوچے سمجھے کوئی اختراع کر کے بیان کر دے تو عوام اس کو سر پر اٹھالیں گے۔ قرآن کی تفسیر بالرائے کی ذرہ بھر پرواہ نہیں صرف تسکین جذبات ہو جائے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں تمام چیزوں کا علم موجود ہے لیکن یہ بھی خیال ہونا چاہئیے کہ تمام مطالب کا صحیح استکشاف قرآن مجید سے صرف حاملین علوم قرآنیہ یعنی محمدؐ و آل محمدؐ ہی کر سکتے ہیں۔ جس طرح قرآن کا دعویٰ ہے۔ لَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِيْنٍ اسی طرح قرآن کا دعویٰ ہے سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ وَقُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ وَكُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى یعنی اس کے ذریعہ سے پہاڑ چل سکتے ہیں زمین کا فاصلہ طے ہو سکتا ہے اور مُردوں سے کلام کی جا سکتی ہے۔ جس طرح قرآن مجید کا دوسرا دعویٰ حاملین قرآن ہی سے کما حقہٗ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے اسی طرح اس کا پہلا دعویٰ بھی انہی سے پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے۔

اپنے آپ کو عالم کہلانے کے شیدائی پہلے دعویٰ کو دیکھ کر اپنی جہالت کا اظہار باعثِ خجالت سمجھتے ہیں کیونکہ اِدھر اُدھر کی باتوں اور کج مج بیانوں کے ذریعہ عوام کے قلوب کی تسکین کی جا سکتی ہے اور ان کے سیدھے سادے دماغوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن قرآن کے دوسرے دعویٰ پر جب نظر پڑتی ہے تو اس آیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے اپنی جہالت کو جھٹلاتے ہیں اور علم قرآن کو اہلبیت عصمت کی میراث قرار دیتے ہیں۔ اگر یہاں بھی عوام کے قلوب کی تسکین کا کوئی پہلو نظر آتا تو یقیناً اس کسرِ نفسی سے بھی گریز کیا جاتا کیونکہ آیت اولیٰ کے متعلق تو یہ ہو سکتا ہے کہ تاویلات سے کام چلا کر عوام کو مطمئن کر لیا جائے لیکن دوسری آیت میں صرف تاویلات سے کام نہیں بنتا بلکہ عملی تطبیق کی ضرورت ہے۔ لہٰذا صرف پہلے مقام پر اپنی کم مائیگی کا اعتراف اور اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کا حوالہ خلافِ شان شمار کرتے ہیں اور بے دریغ تفسیر بالرائے کر کے عوام کو دھوکا دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام ان کی اس دماغی غلطی کی گرفت نہیں کر سکتے انہیں کیا معلوم کہ واقع میں معنی اس کے خلاف ہے تاکہ اس کو جھوٹا کہیں لیکن دوسری آیت میں چونکہ عملی تطبیق کا مقام ہے دماغی چوری نہیں کہ عوام متوجہ نہ ہو سکیں۔ پہاڑوں کا چلنا۔ مُردوں کا بولنا۔ اور زمینوں کی مسافت کا طے ہو جانا۔ یہ سب حس ظاہری سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں۔ لہٰذا چار و ناچار اَلرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ کا حوالہ دے کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ خداوند کریم اس قسم کی فریب کاری اور فریب کاروں سے تمام مومنین کو محفوظ رکھے۔ آمین

علم علیؑ کے متعلق صحابہ کا اعتراف

کتب فریقین سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے علم کا صحابۂ حضرت رسالتمآبؐ میں سے ہم پلہ کوئی نہ تھا بلکہ آنحضرت کی تمام صحابہ سے اعلمیت کے متعلق روایات تواتر سے موجود ہیں اور واقعات تاریخ پر بھی اگر منصفانہ نظر ڈالی جائے تو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کو علمی اعتبار سے جو نسبت باقی صحابہ سے تھی اسی طرح حضرت کی اولاد طاہرینؑ کو اپنے اپنے زمانہ کے علماء

فضلاء سے وہی نسبت حاصل تھی۔

علامہ امینی نے اس سلسلہ میں کتب مخالفین سے بہت کافی آثار نقل کئے ہیں جناب رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے۔

۱۔ اَعْلَمُ اُمَّتِیْ مِنْ بَعْدِیْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ [۱] — میرے بعد میری امت کا بڑا عالم علیؑ بن ابی طالبؑ ہے۔

۲۔ عَلِیٌّ وِعَاءُ عِلْمِیْ وَوَصِیِّیْ وَبَابِیَ الَّذِیْ اُوْتیٰ مِنْهُ — علیؑ میرے علم کا ظرف اور میرا وصی اور میرے پاس پہنچنے کا دروازہ ہے

۳۔ عَلِیٌّ [۲] بَابُ عِلْمِیْ وَمُبَیِّنٌ لِاُمَّتِیْ مَا اُرْسِلْتُ بِهٖ مِنْ بَعْدِیْ — علیؑ میرے علم کا دروازہ اور میری امت کے لئے ان چیزوں کے بیان کرنے والا ہے جن کے لئے میں رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

۴۔ عَلِیٌّ [۳] خَازِنُ عِلْمِیْ — علیؑ میرے علم کا خازن ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی روایات بالفاظ مختلفہ متعدد کتابوں سے انہوں نے نقل فرمائی ہیں جو حد تواتر تک پہنچتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکابر صحابہ مسائل مشکلہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے دروازہ پر جبہ سائی کا شرف حاصل کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے اور حل مسائل کے بعد آنحضرت کی علمی سبقت اور اپنی بے مائیگی کا کھلے لفظوں میں اعتراف کر لیا کرتے تھے چنانچہ علامہ موصوف نے حضرت عمر کا اعتراف مختلف تعبیرات کے ساتھ متعدد کتب مخالفین سے نقل فرمایا ہے۔

۱۔ لَوْلَا عَلِیٌّ [۴] لَهَلَكَ عمر — اگر علیؑ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

۲۔ اَللّٰهُمَّ [۵] لَا تُبْقِنِیْ لِمُعْضَلَةٍ لَیْسَ لَهَا ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ — اے اللہ مجھے ایسے مشکل مسئلہ کے لئے زندہ نہ رکھ جس کے حل کرنے کے لئے علیؑ موجود نہ ہوں۔

۳۔ اَقْضَانَا [۶] عَلِیٌّ — ہم میں بڑا قاضی علیؑ ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد عبارتیں ہیں جو الغدیر کے مطالعہ سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

دیگر صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس (حبر الامۃ) کا قول ہے۔

مَا عِلْمِیْ وَعِلْمُ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ فِیْ عِلْمِ عَلِیٍّ اِلَّا كَقَطْرَةٍ فِیْ سَبْعَةِ اَبْحُرٍ — میرا اور جناب رسالتمآبؐ کے تمام صحابہ کرام کا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسا کہ ایک قطرہ آب سات سمندروں کے سامنے۔

نیز عبداللہ بن مسعود کا قول ہے۔

اِنَّ الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ مَا مِنْهَا حَرْفٌ اِلَّا وَلَهٗ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَاِنَّ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ عِنْدَهٗ مِنْهُ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ — تحقیق قرآن مجید سات حرفوں پہ نازل ہوا ہے اور ان میں سے ہر حرف کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے پاس ان کے ظاہر و باطن کا علم ہے

[۱] مناقب خوارزمی و کنز العمال ج ۶ [۲] شمس الاخبار [۳] کنز العمال ج ۶ [۴] شرح ابن ابی الحدید [۵] مناقب خوارزمی الریاض النضرۃ مطالب السئول وغیرہ [۶] مناقب خوارزمی وغیرہ [۷] استیعاب تاریخ ابن عساکر مفتاح السعادۃ ص ۴۰۰

یہ روایت سات قرأتوں کے عنوان کے ذیل میں بیان کی جا چکی ہے۔

ان کے علاوہ اور کئی اکابر صحابہ کا انہوں نے ذکر کیا جنہوں نے حضرت علیؑ کی اعلمیت کا اعتراف کیا ہے۔

اسی طرح بہت بڑی تعداد ہے اُن صحابہ کرام کی جنہوں نے جناب رسالتمآبؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا۔

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا وَلَا تُؤْتَی الْبُیُوْتُ اِلَّا مِنْ اَبْوَابِھَا وَفِیْ بَعْضِھَا
میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے اور گھروں میں دروازوں سے ہی آیا جاتا ہے اور بعض روایات میں یہ لفظ ہیں۔

مَنْ اَرَادَ الْمَدِیْنَۃَ فَلْیَاْتِھَا مِنْ بَابِھَا
جو شہر میں آنا چاہے اس کو دروازہ سے آنا چاہیئے۔

اَوْکَذِبَ مَنْ زَعَمَ اَنَّہٗ یَصِلُ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ اِلَّا مِنْ قِبَلِ الْبَابِ۔ اَوْلَنْ تُؤْتَی الْمَدِیْنَۃُ اِلَّا مِنْ قِبَلِ الْبَابِ
جو دروازہ کے سوا شہر میں داخل ہونے کا وہم و گمان کرے۔ وہ جھوٹا ہے۔ دروازہ کے بغیر شہر میں داخل ہونے کی صورت ہی نہیں۔

اَوْفَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ
جو علم کا خواہش مند ہو پس وہ دروازہ سے ہی آئے۔

اسی طرح روایات میں مدینۃ العلم۔ دار الحکمۃ، دار العلم اور مدینۃ الفقہ کے الفاظ کا اختلاف بھی ہے۔ علامہ امینی نے ایک سو تینتالیس[۱۴۳] علمائے اہلسنت کی فہرست لکھی ہے جنہوں نے باسناد صحیحہ یہ حدیث نقل کی ہے۔

حضرت علیؑ کا دعویٰ سلونی

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک فرمان بھی تازگیٔ رُوح کے لئے درج کر دوں۔ بحار الانوار جلد ۴۔ باب احتجاجات امیر المومنین علیہ السلام میں اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے کہ جب حضرت علیؑ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور لوگ بیعت کر چکے تو آپ جناب رسالتمآبؐ کا عمامہ سر پر اور آنحضرتؐ کی چادر دوش اطہر پر اور نعلین رسول الثقلین زیب پا اور تلوار سرکار رسالتؐ کمر سے آراستہ کر کے مسجد نبوی میں تشریف لائے آتے ہی منبر رسالت پر جلوہ افروز ہوئے اور اطمینان سے بیٹھ کر ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لئے اور فرمایا۔

یَامَعَاشِرَ النَّاسِ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ ھٰذَا سَفَطُ الْعِلْمِ ھٰذَا لُعَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ھٰذَا مَازَقَّنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ زَقًّا زَقًّا سَلُوْنِیْ فَاِنَّ عِنْدِیْ عِلْمُ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ اَمَا وَاللّٰہِ لَوْ ثُنِّیَتْ لِیَ الْوِسَادَۃُ فَجَلَسْتُ عَلَیْھَا لَاَفْتَیْتُ اَھْلَ التَّوْرَاۃِ بِتَوْرَاتِھِمْ حَتّٰی یَنْطِقَ التَّوْرَاۃُ فَتَقُوْلَ صَدَقَ۔

اے لوگو مجھ سے سوال کرو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ یہ علم کا جوہر ہے یہ رسول اللہؐ کا لعاب ہے۔ یہ علم مجھے رسالتمآبؐ نے اس طرح سکھایا ہے۔ جس طرح پرندہ اپنے بچّہ کو دانہ بھراتا ہے۔ تحقیق میرے پاس اوّلین و آخرین کا علم ہے آگاہ ہو! اگر میرے لئے تکیہ لگا دیا جائے پس میں اس پر بیٹھ جاؤں تو اہل تورات کو تورات سے ایسا فتوے دوں کہ تورات خود بول اُٹھے گی۔ اور کہے گی کہ سچ فرمایا

عَلِیٌّ مَا کَذِبَ لَقَدْ اَفْتَاکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیَّ وَاَفْتَیْتُ اَهْلَ الْاِنْجِیْلِ بِاِنْجِیْلِهِمْ حَتّٰی یَنْطِقَ الْاِنْجِیْلُ فَیَقُوْلَ صَدَقَ عَلِیٌّ مَا کَذِبَ لَقَدْ اَفْتَاکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیَّ وَاَفْتَیْتُ اَهْلَ الْقُرْاٰنِ بِقُرْاٰنِ حَتّٰی یَنْطِقَ الْقُرْاٰنُ فَیَقُوْلُ صَدَقَ عَلِیٌّ مَا کَذِبَ لَقَدْ اَفْتَاکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیَّ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَیْلًا وَنَهَارًا فَهَلْ فِیْکُمْ اَحَدٌ یَعْلَمُ مَا نُزِّلَ فِیْهِ اِلٰی اَنْ قَالَ، ثُمَّ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ فَوَالَّذِیْ خَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ لَوْ سَئَلْتُمُوْنِیْ عَنْ اٰیَةٍ اٰیَةٍ فِیْ لَیْلٍ نَزَلَتْ اَوْ فِیْ نَهَارٍ نَزَلَتْ مَکِّیِّهَا وَمَدَنِیِّهَا وَسَفَرِیِّهَا وَحَضَرِیِّهَا وَنَاسِخِهَا وَمَنْسُوْخِهَا وَمُحْکَمِهَا وَمُتَشَابِهِهَا وَتَاْوِیْلِهَا وَتَنْزِیْلِهَا لَاَخْبَرْتُکُمْ (الحدیث) وَفِیْ اٰخَرَ قَالَ سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ فَاِنَّ بَیْنَ جَوَانِحِیْ عِلْمًا جَمًّا

علیؑ نے ... اور جھوٹ نہیں کہا اور تم کو وہ فتویٰ دیا ہے جو مجھ میں خدا نے نازل فرمایا ہے اور انجیل والوں کو انجیل سے ایسا فتویٰ دوں کہ خود انجیل پکار کر کہے گی کہ علیؑ نے بالکل درست کہا اور غلط نہیں کہا اور تمہیں ایسی چیز کا فتویٰ دیا جو خدا نے مجھ میں نازل فرمائی ہے اور قرآن والوں کو قرآن سے اس طرح فتویٰ دوں گا کہ خود قرآن پکار کر کہے گا کہ علیؑ نے درست فتویٰ دیا ہے اور جھوٹ نہیں کہا اور تمہیں ایسے امر کا فتویٰ دیا ہے جو خدا نے مجھ میں نازل فرمایا ہے۔ حالانکہ تم بھی شب و روز قرآن مجید پڑھتے ہو کیا تم میں کوئی بھی ایسا ہے جو قرآن میں نازل شدہ تمام امور کو جانتا ہو (سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے) آپ نے فرمایا پھر سوال کرو مجھ سے قبل اس کے کہ میں تم سے جدا ہو جاؤں مجھے دانہ کو شگافتہ اور روح کو پیدا کرنے والے کی قسم ہے کہ اگر تم مجھ سے ایک ایک آیت کے متعلق سوال کرو رات میں اتری ہو یا دن میں، مکی ہو یا مدنی، سفری ہو کہ حضری، ناسخ ہو یا منسوخ، محکم ہو یا متشابہ اور تاویل یا تنزیل البتہ میں تم کو سب بتلا سکتا ہوں ایک اور جگہ فرمایا مجھ سے سوال کرو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ تحقیق میری پسلیوں کے اندر علم کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے

حضرت امیر المومنینؑ کے دعویٰ سلونی کو سن کر مختلف دوروں کے ملاؤں کے منہ میں پانی بھر آیا اور برسر منبر اسی دعویٰ کی رٹ لگائی لیکن کوتاہ اندیشی، تہی دامنی اور کور باطنی کے منظر عام پر آنے کے فوراً بعد ہی اپنے الفاظ واپس لینے پر مجبور کر دیئے گئے پس حسد و عناد کی آگ دل میں، تعصب کی پٹی آنکھوں پر، غضب خدا کا وبال سر پر اور رسوائی و خجالت کا طوق گردن میں پہن کر منبر سے ان کو نیچے اترنا پڑا سبط ابن جوزی کا واقعہ عام مشہور ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے طبع آزمائی کی اور رسوائی پائی والحمدللہ بہرکیف یہ واضح ہو گیا کہ علوم قرآنیہ اہلبیت عصمتؑ کے ہی پاس ہیں لہٰذا ان سے حاصل کئے بغیر کسی شخص کو قرآن مجید کی تاویل یا متعدد احتمالات میں سے بعض کی ترجیح میں ذاتی رائے دینے کا کوئی حق نہیں ائمہ طاہرینؑ کی فرمائشات کے علاوہ جناب رسالتمآبؐ سے قریب تواتر کے منقول ہے مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (ترجمہ جو قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرے وہ اپنی جگہ جہنم میں سمجھے) اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ

حدیث اِنّی تارِکٌ فیکمُ الثقلین

عن مسند احمد بن حنبل عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ۔ ترکت فیکم ما ان تمسکتم بہما لن تضلوا بعدی۔ الثقلین احدہما اکبر من الآخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض وعترتی اہلبیتی و انہما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض۔

مسند احمد بن حنبل سے بروایت ابو سعید خدری منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا میں نے تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑی ہیں کہ اگر ان سے تمسک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ وہ ثقلین (گرانقدر چیزیں) ہیں۔ ایک دوسری سے بزرگ تر ہے۔ کتاب اللہ جو آسمان سے زمین تک لمبی رسّی ہے اور میری عترت اہلبیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گی۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر دونوں میرے اوپر وارد ہوں گے۔

عن صحیح المسلم عن زید بن ارقم فی حدیث طویل قال قال رسول اللہ۔ ما لفظہ اِنّی تارِکٌ فیکم الثقلین اولہما کتاب اللہ فیہ النور فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ (الی ان قال) واہلبیتی اذکرکم اللہ فی اہلبیتی۔ فقال حصین ومن اہلبیتہ؟ فقال لیس نساءہ اہلبیتہ ولکن اہلبیتہ من حرمت علیہم الصدقۃ۔

صحیح مسلم سے بروایت زید بن ارقم ایک حدیث طویل میں جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جاتا ہوں۔ پہلی ان دونوں میں سے اللہ کی کتاب جس میں نور (ہدایت) ہے پس اللہ کی کتاب لو اور اس سے تمسک پکڑو (آپ نے فرمایا) اور میرے اہلبیت اور اپنے اہلبیت کے متعلق تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں (راوی حدیث) حصین (نے زید بن ارقم سے پوچھا کہ اہلبیت رسول کون ہیں؟ کیا آپ کی بیویاں اہلبیت نہیں؟ تو زید نے) جواب دیا کہ انکی بیویاں اہلبیت نہیں بلکہ ان کے اہل بیت تو وہ لوگ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔

عن التفسیر الثعلبی فی تفسیر قولہ واعتصموا بحبل اللہ عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ایہا الناس قد ترکت فیکم الثقلین خلیفتین ان اخذتم بہما لن تضلوا بعدی احدہما اکبر من الآخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض وعترتی اہلبیتی و انہما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض

تفسیر ثعلبی سے واعتصموا بحبل اللہ کی تفسیر میں بروایت ابو سعید خدری منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا اے لوگو میں نے دو گرانقدر جانشین تم میں چھوڑے ہیں۔ اگر تم ان کے ساتھ رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے میرے بعد ان میں کا ایک دوسرے سے بڑا ہے کتاب اللہ جو آسمان سے لے کر زمین تک ایک حبل ممدود ہے اور میری عترت اہل بیت یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے اوپر دونوں وارد ہوں گے۔

ابن مغازلی سے بروایت زید بن ارقم منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ میں تم سے پہلے حوض کوثر پر موجود ہوں گا۔

اور تم سے سوال کروں گا۔ کہ تم نے ثقلین کے ساتھ کیا کیا؟ زید بن ارقم کہتا ہے) کہ ہمیں ثقلین کا مطلب معلوم نہ تھا تو مہاجرین میں سے ایک شخص اٹھا اور کھڑے ہو کر عرض کی کہ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہو جائیں۔ ثقلین سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا ان میں سے بزرگ تر اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک کنارا اللہ کے پاس ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ساتھ تمسک پکڑو اور اس پر اعتراضات نہ کرو اور ان میں سے دوسری جو چھوٹی چیز ہے وہ میری عترت اہل بیت ہے۔ پس جو لوگ میرے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں اور میری باتوں پر ایمان رکھیں۔ ان پر لازم ہے کہ ان کو قتل کریں اور ان پر ظلم بھی نہ کریں یہاں تک کہ ارشاد فرمایا کہ ان کا ناصر میرا ناصر اور ان کا خاذل میرا خاذل اور ان کا دشمن میرا دشمن ہوگا (الحدیث) **اقول** ۔ حدیث ثقلین کتب فریقین میں تواتر سے نقل کی گئی ہے۔ تمام آثار جو اس حدیث شریف کے متعلق وارد ہیں۔ کا جمع کرنا مناسب نہیں ہے اور صرف ترجمہ پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ تاکہ زیادہ طول نہ ہو

(۱) جابر بن یزید جعفی سے مروی ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جناب رسالتمآبؐ نے لوگوں کو مقام منیٰ پر بلایا اور فرمایا۔ ایہا الناس! میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر ان سے تمسک پکڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری میری اہلبیت یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے۔ پھر فرمایا اے لوگو! میں تم میں اللہ کی تین حرمتیں چھوڑ رہا ہوں۔ اللہ کی کتاب اپنی عترت اہل بیت اور کعبہ بیت الحرام۔ اس کے بعد امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ پس کتاب اللہ کی لوگوں نے تحریف کر لی اور کعبہ کو گرا دیا۔ اور عترت کو قتل کیا۔ گویا اللہ کی تمام امانتوں کو پس پشت ڈال دیا۔ **اقول**: تحریف سے یہ مراد نہیں کہ قرآن کے الفاظ تبدیل کر دیئے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی ذاتی رائے سے تاویلات فاسدہ اور استحسانات عقلیہ پر اعتماد کر کے معانیٔ قرآن کو بدل ڈالا اور ان میں اپنی من مانی کر لی۔ اگر اہلبیت کے دروازہ پر آتے اور ان سے قرآن کو سیکھتے تو یہ خرابیاں نہ ہوتیں)

(۲) ابن بابویہ سے کتاب النصوص علی الائمہ میں عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ میں نے جناب رسالتمآبؐ کو فرماتے سنا۔ ایہا الناس! حوض کوثر کے کنارے تم میرے پاس پہنچو گے (جس کی وسعت صنعا سے بصرہ تک کے برابر ہے) وہاں چاندی کے پیالے ستاروں کی تعداد کی مثل ہوں گے۔ جب تم میرے پاس پہنچو گے۔ تو میں تم سے ثقلین کے بارے میں سوال کروں گا۔ دیکھنا ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہو۔ سبب اکبر اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک کنارا اللہ کے ہاتھ میں اور دوسرا کنارہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ساتھ تمسک پکڑو اور اس کو تبدیل نہ کرو اور 'دوسری' میری عترت اہلبیت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر وارد ہوں گے (راوی کہتا ہے) میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کی

تعداد آئمہ

لہ البرہان ۔ علہ یہ روایت گو بطریق اہل بیت منقول نہیں، لیکن چونکہ کتب امامیہ سے منقول ہے۔ اس لئے اس کو ان احادیث کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے۔ (حسین بخش عفی عنہ)

عترت کون لوگ ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ میرے اہلبیتؑ جو علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد سے ہیں اور نو شہزادے جو حسینؑ کی پشت سے ہوں گے ۔ یہ آئمہ ابرار ہیں اور یہی میری عترت ہیں ۔ میرے گوشت اور خون سے ہیں ۔

(۳) نیز اسی کتاب میں ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ حدیث ثقلین میں عترت سے کون لوگ مراد ہیں ۔ آپ نے فرمایا میں ، حسنؑ ، حسینؑ اور نو امام حسینؑ کی پشت سے جن کا نواں مہدی قائمؑ ہوگا ۔ یہ ہرگز کتاب اللہ سے جُدا نہ ہوں گے اور کتاب اللہ ان سے جُدا نہ ہوگی ۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر جناب رسالتمآبؐ کے پاس پہنچیں گے ۔

(۴) اسی کتاب میں حذیفہ سے روایت ہے (بمضمون سابق) یہاں تک کہ فرمایا رسالتمآبؐ نے کہ حوض کوثر پر جب تم میرے پاس پہنچو گے ۔ تو بعض لوگ پیچھے ہٹ جائیں گے ۔ میں کہوں گا ۔ اے اللہ یہ لوگ میری امت سے ہیں ۔ تو جواب ملے گا ۔ اے محمدؐ ! کیا تجھے معلوم ہے جو کچھ انہوں نے کیا ؟ یہ لوگ تیرے بعد اپنے پچھلے نقش قدم پر پلٹ گئے ۔ پھر تین بار ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں اپنی عترت کے متعلق نیکی کی وصیت کرتا ہوں ۔ پس حضرت سلمان نے کھڑے ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ! آپ اپنے بعد کے آئمہ کا پتہ دیجیے ۔ جو آپ کی عترت سے ہوں گے تو فرمایا ۔ ہاں ! میرے بعد آئمہ جو میری عترت سے ہوں گے ۔ وہ نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کے برابر ہوں گے ۔ جن میں نو۹ حضرت امام حسینؑ کی پشت سے ہوں گے ۔ ان کو خداوند کریم نے میرا علم و فہم عطا فرمایا ہے تم ان کو نہ سکھانا ۔ کیونکہ وہ تم سے اعلم ہیں ۔ اور ان کے پیچھے چلنا ۔ کیونکہ وہ حق کے ساتھ ہیں اور حق ان کے ساتھ ہے

(۵) ابن بابویہ سے کتاب الغیبتہ میں زید بن ارقم سے روایت ہے کہ جناب رسالتمآبؐ حجتہ الوداع سے واپس آکر غدیر خُم پر اُترے ۔ اور چند درختوں کے نیچے جھاڑو دینے کا حکم صادر فرمایا ۔ پس درختوں کے نیچے جھاڑو دیا گیا ۔ (پس آپ نے لوگوں کو بُلایا ۔ اور ارشاد فرمایا کہ مجھے اللہ کی طرف سے گویا دعوتِ وصال پہنچ چکی ہے اور میں جانے والا ہوں ۔ میں نے تم میں دو۲ گرانقدر چیزیں چھوڑی ہیں ۔ ایک بڑی ہے دوسری سے ۔ یعنی کتاب اللہ اور عترت اہل بیت ۔ دیکھو ان کے ساتھ میرے بعد کیا سلوک کرتے ہو ۔ وُہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے ۔ حتیٰ کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے ۔ اس کے بعد فرمایا ۔ تحقیق اللہ میرا مولا ہے اور ہر مومن اور مومنہ کا میں مولا ہوں ۔ پھر علیؑ بن ابی طالب کے ہاتھ سے پکڑا اور فرمایا جس کا میں ولی ہوں اس کا علیؑ ولی ہے (پھر دُعا مانگی) اے اللہ جو علی کے ساتھ موالات رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے تو اُسے دشمن رکھ (عامر بن واثلہ راوی حدیث) کہتا ہے کہ میں نے زید بن ارقم سے دریافت کیا کہ کیا تُو نے جناب رسالتمآبؐ سے خود سُنا تھا ؟ تو اس نے جواب دیا کہ اُن تمام درختوں کے نیچے کوئی مرد ایسا نہ تھا ۔ جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ ہو اور کانوں سے سُنا نہ ہو ۔

(۶) عیسیٰ بن معمر سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوذر غفاری کو کعبہ کے دروازے کا حلقہ پکڑ کر کہتے ہوئے سُنا کہ جو شخص مجھے پہچانتا ہے ۔ وہ تو پہچانتا ہی ہے اور جو مجھے نہیں پہچانتا تو وہ اب سے جان لے کہ میں ابوذر جندب بن السکن ہوں میں نے (اپنے کانوں) جناب رسالتمآبؐ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ۔ کتاب اللہ اور

عترت اہلبیت۔ یہ ہرگز ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر وارد ہوں گے اور ان دونوں کی مثال کشتی نوحؑ جیسی ہے جو سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا وہ غرق ہو گیا۔

(۷) بروایت سلیم بن قیس ہلالی حضرت امیر المومنینؑ سے منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ خدا نے ہمیں پاک معصوم شہید علی الخلق اور اپنی طرف سے حجت بنایا اور ہمیں قرآن کے ساتھ اور قرآن کو ہمارے ساتھ قرار دیا۔ ہم قرآن سے جُدا نہ ہوں گے اور قرآن ہم سے جُدا نہ ہو گا (یہ روایت اصل عبارت کے ساتھ (معجز نما کی ضرورت) کے عنوان سے گذر چکی ہے ص۵۵)

(۸) بروایت دیلمی زید بن ثابت سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا میں دو گرانقدر چیزیں تم میں چھوڑنے والا ہوں کتاب اللہ اور علیؑ ابن ابی طالب اور علیؑ تمہارے لئے کتاب اللہ سے افضل ہے کیونکہ یہ کتاب اللہ کا ترجمان ہے (گذر چکی ہے ص۶۵)

(۹) کتاب روضۃ الواعظین سے بروایت امام محمد باقر علیہ السلام منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ایک خطبہ کے دوران میں جو مسجد خیف میں ارشاد فرمایا تھا جس میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خلافت پر نص فرمائی تھی۔ ارشاد فرمایا کہ تحقیق علیؑ اور اس کی طیب اولاد ثقل اصغر ہیں اور قرآن ثقل اکبر ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا ترجمان اور مبین ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر پر (خدا کے امر و حکم، جو زمین سے متعلق ہیں کے ساتھ) وارد ہوں گے تحقیق اللہ نے فرمایا اور میں نے اس کی طرف سے پہنچایا۔ آگاہ ہو تحقیق میں ادا کر چکا۔ آگاہ رہو میں پہنچا چکا۔ آگاہ ہو تحقیق میں سُنا چکا آگاہ ہو تحقیق میں واضح کر چکا۔ آگاہ ہو تحقیق امیر المومنین سوائے میرے اس بھائی کے اور کوئی نہیں اور اس کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں کہ امیر المومنینؑ کہلائے۔ پھر اپنا ہاتھ مبارک حضرت علیؑ کے بازو میں ڈال کر ان کو بلند فرمایا۔ پس حضرت امیر المومنینؑ علیہ السلام ہی پہلے وہ شخص ہیں جن کو رسالتمآبؐ نے بلند فرمایا اور اس قدر بلند کیا کہ حضرت علیؑ کے پاؤں مُبارک حضرت رسالتمآبؐ کے گھٹنوں کے برابر ہو گئے۔ تفسیر برہان میں پچاس سے زائد حدیثیں اسی مضمون کی نقل کی گئی ہیں۔ بعض احادیث میں ثقلین کی وجہ تسمیہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ تمسک پکڑنا چونکہ ثقیل ہے اس لئے ان کو ثقلین کہا گیا ہے۔

یہ واضح ہے کہ قرآن مجید کو ثقل اکبر اور اہلبیت کو ثقل اصغر کی لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن مقام اطاعت میں حضرت علیؑ اور اس کی اولاد طاہرینؑ افضل ہیں۔ کیونکہ یہ ناطق ہیں اور وہ صامت ہے۔ قرآن مجید پر ان سے دریافت کر کے عمل کرنا ہے پس ان کی اطاعت ہی قرآن کی اطاعت ہے اور اسی مطلب کی تائید دیلمی کی گذشتہ روایت سے ہوتی ہے۔

بالجملہ۔ قرآن اور اہلبیت میں لازم و ملزوم کی حیثیت ہے اور ہمیں ان ہر دو کے ساتھ یکساں نیت سے تمسک پکڑنے کا حکم ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کا انکار کفر ہے اور بغیر ان دونوں کی اطاعت کے خدا و رسول کی رضا کا حاصل کرنا قطعی ناممکن ہے بلکہ ان دونوں میں سے ایک سے کنارہ کش ہو کر دوسرے کا دعویٰ کرنا فضول محض اور لقلقہ لسانی ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔

مزید توضیح چونکہ مسلمانوں کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ناقابل تنسیخ دستور العمل ہے اس کے فیصلہ جات آخری اور قطعی ہیں۔ جن میں ترمیم تک کی کسی کو مجال نہیں۔ اب عقل سلیم خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ جب کوئی بھی

دستور بغیر دستور چلانے والے کے مفید و کار آمد نہیں ہوتا تو یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ دستور خداوندی تنہا کافی قرار پائے۔
اگر یہ تنہا کفایت کر سکتا تو ابتداء سے کسی لانے والے کی کیا ضرورت تھی؟ خداوند کریم کے لئے ممکن تھا کہ وہ براہِ راست کسی طریقہ سے ہر انسان کے پاس اپنا قانونی ضابطہ بھیج دیتا اور ہر انسان اسی ضابطہ پر عمل کر کے راہ نجات حاصل کر لیتا پھر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی و رسولؐ بھیجنے کا لمبا چوڑا انتظام کرنے کی اس کو کیا ضرورت تھی؟ صرف صحف سماویہ اور کتب الٰہیہ سے کام نکل سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں اور انسانی فطرت سے بہت بعید ہے کہ وہ صرف کتاب ہی پر عمل کر کے راہ حق پر بغیر کتاب والے کے گامزن ہو جائے۔ اسی بناء پر خالق فطرت نے ضروری قرار دیا کہ کتاب کے ساتھ کتاب والا ہو۔ قانون کے ساتھ قانون دان ہو۔ جو لوگوں کو ایک طرف دعوتِ عمل دے اور دوسری طرف خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی سزا دے۔

پس جس طرح قانونِ الٰہی کی وضع انسان کے بس سے باہر ہے بلکہ خود خدا ہی بنا کر بھیجتا ہے۔ اسی طرح اس کے مبلّغ کا انتخاب بھی اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔ عام سکولوں میں جس طرح نصاب درسیہ اور کتب متعلقہ کا انتخاب افسر اعلیٰ کے اختیار میں ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح درجہ وار مدرسین کا انتخاب بھی اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کسی کلاس کے لڑکے اپنی صف میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ ورنہ نتیجہ نہایت افسوس ناک ہوگا۔

حکومت رعایا کے لئے جو قوانین ان کے نظم و نسق اور فلاح و بہبود کے لئے وضع کرتی ہے۔ ان کی محافظت اور نگہداشت کے لئے متعلقہ افسر بھی خود ہی متعین کرتی ہے۔

اسی طرح اس مقام پر انتہائی بے راہ روی اور نا انصافی ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ قوانین کی کتاب خُدا کی طرف سے ہو۔ اور مبلّغ کا انتخاب ہماری مرضی سے ہو۔ اگر سابق طریق انتخابات تو بعید پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح انبیاء کا انتخاب لاجواب خود اللہ نے ہی فرمایا تھا۔ اسی طرح ان انبیاء کے قائم مقام اوصیاء کا انتخاب بھی اسی نے ہی فرمایا۔

چونکہ گذشتہ انبیاء سب کے سب صاحب شریعت و حامل کتاب نہیں تھے۔ لہٰذا جن جن انبیاء کو کتاب و شریعت عطا فرمائی گئی۔ اس کے بعد دوسرے صاحب کتاب و شریعت آنے والے نبی کی آمد تک درمیان میں جس قدر نبی ہوا کرتے تھے گویا وہ عہدہ دار نبوت بھی تھے اور گذشتہ نبی کی شریعت کے منجانب اللہ محافظ و نگہبان و مبلّغ بھی تھے۔ ان کا انتخاب گذر جانے والے صاحب شریعت نبی کے اختیار میں نہیں ہُوا کرتا تھا۔ بلکہ ان کو بھی خود خداوند کریم ہی اس عہدہ کے لئے نامزد فرماتا تھا۔
یہاں تک کہ یہ سلسلہ جناب رسالتمآبؐ تک منتہی ہُوا۔ اب حضورؐ نے (لا نبی بعدی) (بارشاد قدرت) فرما کر دروازۂ نبوّت کے قطعی طور پر بند ہو جانے کا اعلان فرما دیا۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا ہوتا تو آپ کے سکوت سے ناجائز فائدہ اٹھائے جانے کا کافی احتمال تھا۔ کیوں کہ قرآن مجید کے فرمان خاتم النّبیّین کی من مانی تاویلیں کرنا مدعیان نبوّت کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بلکہ جب لا نبیَّ بعدی کی استغراقی اور عمومی نفی کی مضبوط حصار کو پھاند کر ادعائے نبوّت کے متوالے اپنے تئیں ظلّی و بروزی یا امتی نبی کہلوا کے ہی رہے تو خدا معلوم اس حصار کی عدم موجودگی میں تو نبوّتوں کا بے پناہ سیلاب امتِ اسلامیہ کو کہیں سے

کہیں بپا کرے جاتا۔ بلکہ بہت ہی ممکن تھا کہ ہر طرح کا تعلیم یافتہ انسان بلکہ ہر با رسوخ آدمی اپنے آپ کو عہدۂ نبوت پر فائز قرار دے کر ایک جماعت بنا لیتا۔

بہرکیف باتفاق امتِ اسلامیہ جناب رسالتمآبؐ پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ ہوا۔ اور آپ کی شریعت اور کتاب کی حد قیامت قرار پائی۔ تو کس قدر تعجب خیز بلکہ ایک ناممکن سا تصور ہے۔ کہ سابقہ قابلِ نسخ اور محدود شریعتوں کی تبلیغ اور ترویج کے لئے تو اللہ کی جانب سے عہدہ دار متعین ہوں اور ناقابلِ نسخ شریعت اور غیر محدود دین کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی انتظام نہ ہو۔ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ بات منافی عدل وحکمت ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ جس طرح قرونِ سابقہ اور امم سالفہ میں صاحبانِ شریعت انبیاء کے قائمقام نبی ان کی شریعت کے محافظ اور ان کے دین کے مبلغ ہوا کرتے تھے۔ اور وہ عالمِ شریعت وکتاب ہونے کے علاوہ پاک ومعصوم بھی ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح آخری نبی سید الانبیاء کی قائم مقامی کا شرف جن کو ملے گا وہ گو نبی تو نہ ہوں گے (کیونکہ نبوت ختم ہوچکی ہے) لیکن عالمِ کتاب وشریعت اور معصوم ضرور ہوں گے اور جس طرح ان قائمقام انبیاء کا انتخاب وتقرر ید قدرت میں تھا۔ اسی طرح ان اوصیائے معصومین کا انتخاب اور تقرر بھی ید قدرت میں ہی ہے۔

اوصیائے پیغمبرؐ

جس طرح جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام صاحبانِ شریعت انبیاء سابقین سے افضل ہیں۔ اسی طرح ان کے اوصیائے طاہرینؑ جو مروج شریعت اور مبلغین احکام قرآن ہیں۔ انبیاء کے قائمقام اوصیاء سے افضل ہوں گے اور جس طرح یہ قرآن کتب سابقہ اور صحف گزشتہ پر حاکم ہے۔ اسی طرح اس کے مبلغین (اوصیائے رسالتؐ) ان کتابوں اور صحیفوں کے مبلغین پر حاکم ہوں گے۔

بلکہ اس قاعدہ سے اوصیائے جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گذشتہ صاحبانِ شریعت انبیاء سے بھی افضل ہوں گے۔ کیونکہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء حضرت رسالتمآبؐ کے سامنے رعایا کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کے اوصیائے طاہرینؑ کے سامنے بھی وہ بحیثیت رعایا کے ہوں گے۔

مثال کے طور پر۔ ایک ایک ملک میں ہر ہر ضلع وریاست کا حکمران جس طرح پورے ملک کے بادشاہ کی رعایا میں شمار ہوا کرتا ہے اسی طرح ملک کے بادشاہ کے وزراء کا بھی وہ محکوم اور فردِ رعیت شمار ہوتا ہے۔ ہر ضلع یا صوبہ وریاست کا حاکم اپنے ماتحت پر حاکم ضرور ہے لیکن اپنے ملکی بادشاہ یا اس کے وزراء کا ماتحت ہونا بھی اس کی کسرِ شان نہیں بلکہ اس کے لئے مقامِ فخر ہوا کرتا ہے۔ یہاں بھی اپنے اپنے حدود وشرع کے اندر ہر نبی اپنی امت کا حاکم اور بادشاہ ہے لیکن جناب محمد مصطفیٰ کی عالمی نبوت کے مقابلہ میں چونکہ وہ بحیثیت امت اور رعایا کے ہے۔ لہٰذا آنحضرتؐ کے اوصیا وخلفائے طاہرین علیہم السلام بھی ان کے سردار اور حاکم ہیں۔

بلکہ جہاں تک جناب رسالتمآبؐ کا دائرہ نبوت ہے وہاں تک اُن کا دائرہ خلافت ہے اگر وہ عالمین کے لئے بشیر ونذیر ہیں تو یہ بھی عالمین کے امام وامیر ہیں۔ لہٰذا تحت الثریٰ سے لے کر عرش علا تک اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت ہے تو اسی ساری کائنات میں آنحضرتؐ کے اوصیائے طاہرین کی خلافت وولایت ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسالتمآبؐ کے بعد ظاہری مسندِ اقتدار خواہ کوئی سنبھال لے ۔حقیقت میں مسندِ رسالت کا اہل اور ملکِ خلافت کا تاجدار وہی ہوگا ۔جس کا اقتدار عرش سے لے کر فرش تک مسلّم ہو اور جس کی غلامی میں انبیاء معصومین اور ملائکہ مقربین سب داخل ہوں اور اس عہدۂ جلیلہ کا اہل غیر معصوم تو یقیناً نہیں ہو سکتا ۔پس آلِ محمدؐ ہی اس عہدہ پر فائز ہو سکتے ہیں اور چونکہ جناب رسالتمآبؐ کی شریعت کی حد دِ قیامت سے جاملتی ہیں تو ان کے اوصیائے طاہرینؑ کا سلسلہ بھی قیامت تک قائم رہنا ضروری ہے اور وہ سب کے سب آلِ محمدؐ ہی سے ہیں اس وقت سرکار رسالت کا آخری جانشین خلافتِ الٰہیہ کا آخری تاجدار اور سلکِ امامت کا بارہواں درشہوار حضرت حجۃ العصر صاحب الامر امام زمان مہدی و ہادی علیہ و علیٰ آباۂ السلامؑ موجود ہیں ۔جو قرآن و شریعت کے حقیقی محافظ و نگہبان ہیں اور انہی کے وجودِ مسعود کی برکات سے وجود کائنات باقی ہے ۔ایک وقتِ مقرر تک اللہ کی حکمت و مصلحت سے غائب ہیں ۔جب پردۂ غیبت اٹھے گا ۔عالمِ ظاہر میں تشریف فرما ہو کر عالمی مسندِ اقتدار پر متمکن ہوں گے اور قرآن و شریعت کو نئی زندگی بخش کر پورے روئے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے ۔جس طرح کہ ظلم و جور سے بھر چکی ہے اور ان کے وجود غائب سے دنیا اس طرح استفادہ کر رہی ہے جس طرح بادلوں میں چھپ جانے کے بعد سورج سے کیا جاتا ہے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی طرف سے قرآن کا آجانا کافی ہے اور اس کے سمجھانے کے لئے صرف حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کافی ہیں اور ان کے گذر جانے کے بعد ان کے جانشین کے تقرر کا اختیار تمام امتِ اسلامیہ کو حاصل ہے وہ جسے منتخب کر دے بس درست ہے کیونکہ سب امت باطل پر جمع نہیں ہو سکتی تو اس صورت میں وسعت نظری اور بلند حوصلگی سے یہ خیال کرنا ہوگا کہ کیا حضورؐ رسالتمآبؐ کی حدودِ رسالت صرف مدینہ یا مکہ یا اطراف حجاز و عرب تک محدود تھیں اگر جواب نفی میں ہے تو پھر دامنِ انتخاب کو بھی حدودِ مملکتِ نبوت کی وسعتوں تک پھیلانا پڑ جائے گا ۔کیونکہ محدود علاقہ اور محدود اقوام تک اگر ان کی نبوت محدود ہوتی تو انتخابات کو بھی اسی قدر محدود ہونا چاہیئے تھا ۔لیکن اگر حدودِ مملکتِ نبوت عرش سے فرش تک اور ناسوت سے لے کر ملکوت تک پھیلی ہوئی ہوں تو انتخابات کو صرف مدینہ تک بلکہ وہاں کے بھی گنے چنے چند افراد تک محدود کیوں کر دیا جائے ؟

تاریخ بتلاتی ہے کہ بہت سے صحابہ کرام اس انتخاب پر راضی نہیں تھے ۔جنہوں نے پرُ زور احتجاجات بھی کئے آواز بھی اٹھائی لیکن دبا دی گئی ۔چنانچہ انصار نے سقیفائی اجتماع میں کھلا نعرہ لگایا تھا ۔لَا نُبَایِعُ اِلَّا عَلِیًّا یعنی ہم علیؑ کے علاوہ کسی دوسرے کی بیعت نہ کریں گے ۔ (تاریخ طبری) ۔اب کسی کا برسرِ اقتدار آجانا اور اس کی حکومت کا مضبوط ہو جانا اور مخالف آواز کا مرعوب ہو کر دب جانا اور ...... ہے اور اس کو صحیح اور قانونی طور پر منتخب ماننا اور شے ہے ۔اربابِ تاریخ و سیر نے مسئلہ انعقادِ اجماع اور کیفیتِ خلیفہ سازی کو کافی بسط و تفصیل کے ساتھ معتبر ذرائع سے اپنی تصانیف میں مبرہن اور مدلل طور پر محققانہ انداز کے ساتھ ایسا واضح و عیاں کیا ہے کہ منصف طبائع کو تلاشِ حق میں ذرہ بھر دقت نہیں رہتی چنانچہ

آغا سلطان مرزا کی کتاب "البلاغ المبین" جو بلند پایہ مصنف کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ اس موضوع پر ہر پہلو سے تحقیقی بحث کرنے میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اور مصنف کے تاریخی معلومات میں یدِطولیٰ کا پتہ دیتی ہے۔ اور اگر بنا بر تسلیم اس انتخاب کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ دوسری خلافت کے تعین کے لئے اس طرزِ عمل کو کیوں ترک کر دیا گیا اور بطور نامزدگی کے تقرری عمل میں کیوں آئی۔

اگر پہلا طریق تعین (انتخابات) درست تھا تو اس کو ترک کرنا ناجائز تھا۔ پس دوسری خلافت غیر قانونی ہو گی اور اگر دوسرا طریقہ درست تھا (یعنی نامزدگی) تو دونوں خلافتیں غلط ٹھہریں۔ پہلی اس لئے کہ وہ نامزد نہیں تھے اور دوسری اس لئے کہ جس نے نامزد کیا وہ خود غلط جانشین تھا لہذا (اس کو نامزدگی کا حق ہی حاصل نہیں تھا)

لطف یہ کہ تیسرے دورِ خلافت میں نامزدگی بھی نہ رہی بلکہ ایک شورائی کمیٹی بنا کر تقرر خلیفہ کا حق ان کو دے دیا گیا اب اگر اس کو درست کہا جائے تو پہلے ہر دو طریق غلط تھے اور اگر پہلے غلط تھے تو یہ خود بخود غلط تھا کیونکہ انہی کا ایجاد کردہ تھا اب کوئی خاک سمجھے کہ نبی کی خلافت کا تعین کیسے ہونا چاہیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خلافتِ نبویہ با اقتدار طبقہ کے ذاتی رجحانات کے ماتحت نئے نئے طریق بدل کر نئے روپ میں نئے جنم لیا کرتی ہے اس کا نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ قانون بلکہ جو جس طریق سے اور جس طرزِ عمل سے مسند نشین ہو جائے درست ہے۔ اس بحث کو ہماری کتاب امامت و ملوکیت میں مفصل ملاحظہ فرمائیے۔

بالفرض اگر یہ کہا جائے کہ اپنے اپنے مقام پر وہ سب طریق درست تھے اور سب پر اجماعِ امت کا اطلاق ہو گیا تو سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ کو نبی علیہ السلام کے بعد تھوڑے عرصہ تک محدود کیوں کر دیا گیا۔ جب نبوت کی حد قیامت ہے تو تقررِ خلافت بھی قیامت تک ہے۔ لہذا اس طرزِ عمل کو قیامت تک جاری رکھنا چاہیئے۔ اگر عذر پیش کیا جائے کہ خلافت بعد میں اقتدار کا تختۂ مشق بن گئی اور اقتداری رکاوٹیں انتخاباتِ صحیح کی راہ میں حائل ہو گئیں تو ہم پوچھیں گے کہ یہ اقتدار جو عام انتخابات کی راہ میں روڑا بن گیا کیوں ناجائز ہے۔ اور وہ اقتدار جو عام انتخاب نہ ہونے کے باوجود اجماع کا ڈھنڈورا پیٹتا رہا کیوں جائز ہے یا ان دونوں میں فرق کی کیا وجہ ہے؟

بہر حال یہ سوال اپنے مقام پر باقی ہے کہ دورِ اوّل کے اقتدار نے حدیثِ غدیر مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ کے سُننے کے بعد نیز علیؑ کو رسالتمآبؐ کا اپنا عمامہ (سحاب) بطور رسم تاجپوشی بندھانے اور صحابہ کے رسوم مبارک باد ادا کرنے کے بعد عہدِ رسالتؐ کو کیوں چھوڑا اور ولایت علیؑ سے منہ کیوں موڑا؟

اگر بنفسِ نفیس خود حضرت رسالتمآبؐ اپنے ولی عہد کو لاکھوں کے مجمع میں نامزد فرما دیں تو خلافت کے انعقاد کے لئے ناکافی ہے اور امت بعد میں انتخاب سے تقرر کرے (اور وہ بھی چند آدمیوں کا) یا نامزدگی کو طریق تقررِ خلافت قرار دے یا شورائی کمیٹیاں تشکیل دے کر کام نکال لے تو یہ سب کچھ درست اور کافی ہے (عجب ہے معیارِ خلافت) اگر جناب رسالتمآبؐ

کی طرف یہ نسبت دی جائے کہ انہوں نے فرمایا تھا میرے صحابہ کا اجماع یا میری امت کا اجماع حق ہے یا یہ کہ میری امت باطل پر کبھی جمع نہ ہوگی یا یہ کہ میرے صحابہ واجب الاتباع ہیں ۔ والی غیر ذالک ۔ تو ہمیں دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں بعض صحابہ کا اجتماع یا بنا بر تسلیم تمام اہلِ مدینہ کا اجماع (گو حضرت علیؑ اور بعض دیگر اکابر صحابہ شریک نہ ہوئے تھے) اگر حق اور واجب الاتباع ہے تو میدانِ غدیر میں ایک لاکھ سے زائد لوگوں کا اجماع جس میں مکی ۔ مدنی طائفی ۔ یمنی ۔ مصری ۔ بصری کوفی دشامی وغیرہ اطراف مملکتِ اسلامیہ کے افراد موجود تھے اور خود بنفسِ نفیس حضرت رسالتمآبؐ بھی تشریف فرما تھے اور شریک اجماع بلکہ محرک اجماع تھے اور تحریک اجماع بحکم آیت یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ واقع ہوئی اور جناب رسالتمآبؐ نے اپنی زبان وحی ترجمان سے اس کی ابتداء فرمائی اور تمام صحابہ نے برضائے تام بلاپس و پیش فرائض بیعت و مبارکباد ادا کئے ۔ رسم تاجپوشی بھی ادا ہوئی تو بتایئے اتنا زبردست اجماع کیوں ٹھکرا دیا گیا ؟

سب کچھ سہی لیکن اب جبکہ ممالک اسلامیہ دینی مقاصد سے دُور جا رہے ہیں ۔ قرآن کا پُرسان حال کوئی نہیں اسلام پر مخالفینِ اسلام آوازیں کس رہے ہیں ۔ تمام عالمِ اسلامی نہایت بے چینی سے وجودِ حضرت قائم آل محمد صاحب الزمان امام العصر مہدی و ہادی علیہ السّلام عَجَّلَ اللّٰہُ فَرَجَہٗ کی انتظار میں ہے ۔ ذرائع نقل و حرکت ، آمد و رفت نہایت آسان ہیں اور اجماع کی حجیت بھی قیامت تک کے لئے ہے تو دریں صورت تمام عالمِ اسلامی کو بجائے انتظار کے ایک عالمی مجلسِ مشاورت قائم کرکے کسی ایک کو عہدۂ مہدویت سپرد کرنا چاہیئے جو کفیل نظام اسلامی ہو اور منزدہ امن ہو کر فسق و فجور اور ظلم و جور کا قلع قمع کر دے ۔ پس وہ مہدی ہوگا اور اس صورت میں تمام عالم مزید خطرات سے دُور اور محفوظ ہو جائے گا ۔ دنیا آرام و اطمینان کا سانس لے گی ۔ جب اپنے بس کی بات ہے تو خدا سے مزید دعا مانگنے کی اور انتظار کی صعوبتیں برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ یہی جواب ہوگا کہ دورِ حاضر میں تمام ممالکِ اسلامیہ کے ارباب بست و کشاد جمع ہو کر اگر کوشش کریں بھی تو حضرت مہدی نہیں بنا سکتے ۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ دورِ حاضر کے اعلیٰ دماغ مفکرین تمام اطراف عالمِ اسلامی سے جمع ہو کر مہدیؑ امت نہیں بنا سکتے ۔ یعنی جناب رسالتمآبؐ کا آخری جانشین معین نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض جرأت کریں بھی تو وہ اُن کا بنایا ہوا ہوگا ۔ خدائی مہدی نہ ہوگا تو ایک محدود خطۂ زمین کے چند عمر رسیدہ مل کر پہلا جانشین بنا لینے میں کیونکر کامیاب ہو گئے تو اب سمجھ لیجئے کہ جس کو انہوں نے بنایا تھا وہ ان کا تھا لیکن خدائی عہدہ دارِ خلافت نہ تھا ۔ کہنے کو دنیا کہہ دے گی کہ دورِ حاضر میں ہمارا انتخاب ناقص ہے اور عقلائے زمانہ بارہا تجربہ کر چکے ہیں کہ ہمارا منتخب شدہ لیڈر چند روز بعد ناقابلِ انتخاب قرار پا جاتا ہے اور قہراً اسے مسند اقتدار سے اتارنا پڑ جاتا ہے ۔ جب ہمارے انتخاب کی یہ حالت ہے تو انتخاب مہدیؑ ہم سے کیسے ہو سکتا ہے ؟ وہ اللہ ہی کا منتخب کردہ ہونا چاہیئے ۔

اب انصاف طلب بات ہے کہ جب عقلائے عالم کا انتخاب ناتسلی بخش ہے اور وہ بھی دورِ حاضر میں جب کہ انسان

ذہنی اور دماغی صلاحیتوں میں ترقی کے بلند ترین زینہ پر پہنچ چکا ہے تو بھلا آج سے چودہ سو برس پہلے کے انسانوں کا انتخاب اور وہ بھی تمام ممالک کا نہیں ایک پورے ملک کا نہیں بلکہ ایک صوبہ یا ایک ضلع کا بھی نہیں اور حد یہ کہ ایک پورے شہر کا بھی نہیں (صرف چند آدمیوں کا) کیسے خالی از خطرہ قرار دیا جا سکتا ہے اور ایسے منتخب لیڈر کو کس طرح ایک ناقابلِ تنسیخ پوری ملت کا۔ مذہبی و دینی پیشوا یا خدائی فرمانروا مانا جا سکتا ہے؟

اس مقام پر تین باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یہ کہ جانشین رسالتؐ کا انتخاب ہمیشہ امت کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ یہ کہ جانشین رسالتؐ کے انتخاب کا امت کو کوئی حق نہیں بلکہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

۳۔ یہ کہ دَور اوّل میں جانشین رسولؐ کے انتخاب کا حق امت کو تھا اور بس۔

پہلی صورت میں اگر پہلے زمانہ کی امت پہلے زمانہ کے خلفاء کا انتخاب کرنے میں کامیاب تھی تو اب بھی اسی اصول کے ماتحت رسولؐ کے آخری جانشین بنانے میں کامیاب انتخاب ہو جانا چاہیئے ورنہ ماننا پڑے گا کہ یہ طریق کار اللہ کی طرف سے نہیں ورنہ ناکام نہ ہوتا۔ تیسری صورت میں اگر کہا جائے کہ پہلے لوگوں کو حق انتخاب حاصل تھا کیونکہ وہ نیک تھے اور اب چونکہ باطل پرستی کا دَور دورہ ہے۔ لہٰذا اختیار امت سے سلب کر کے خدا نے اپنے لئے مخصوص فرما لیا تو ہم کہیں گے کہ حکیم مطلق نے ایک پائیدار ملت کے لئے شروع سے ایک ناپائیدار قانون کیوں وضع فرمایا جب اس کو معلوم تھا کہ انتخابی طرزِ عمل ایک وقت کے بعد بے کار ہو جائے گا۔ تو ایسے چند روزہ کے طرز عمل کو ایک قیامت تک باقی رہنے والی ملت کا اصل و اساس کیوں قرار دیا؟ اور نیز اسلامی احکام میں مساوات اور یکسانیت کہاں گئی؟ خدا نے جنبہ داری روا کیوں رکھی؟

پس وہ درمیانی صورت ہی بالکل درست و قرینِ عقل ہے۔ یعنی جانشین رسولؐ کے انتخاب کا حق پہلے بھی اور اب بھی سوائے خدا کے اور کسی کو حاصل نہیں نہ اب کا انتخاب بارہواں اور آخری جانشین بنا سکتا ہے۔ اور نہ پہلے کا انتخاب پہلا جانشین رسولؐ اور امامِ اوّل بنا سکتا ہے اگر امت جرأت کرے بھی تو وہ امت کے بنائے ہوئے ہوں گے۔ خدائی عہدہ دار خلافت نہ ہوں گے۔ پس ثابت ہُوا کہ جس طرح قرآن مجید اللہ کی جانب سے ہمارے اعمال و افعال کے لئے ایک مستقل اور ناقابلِ تردید ضابطہ ہے اسی طرح اس کا مدرس و مبلغ بھی ہر دَور میں اللہ کی جانب سے ہی ہوا کرتا ہے۔

جس طرح ہمیں کتاب کے بنانے کا حق نہیں اسی طرح ہمیں اس کے مدرس و مبلغ کے انتخاب کا بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے جس طرح دورِ اوّل میں نبص رسولؐ قرآن کا معلم حضرت علیؑ تھا۔ اسی طرح ہر زمان میں یکے بعد دیگرے آئمہ طاہرینؑ نبص رسولؐ چلے آئے اور دَور حاضر میں حضرت حجت عجل اللہ فرجہٗ بھی بفرمانِ رسالت مبلغ قرآن ہیں۔

نہ اب ہمارے بنانے سے بن سکتا ہے اور نہ اس دَور میں لوگوں کے بنانے سے بن سکتا تھا۔

جس طرح آج کا انتخاب غلط اور خلافِ حکمِ خدا ہے اسی طرح اس زمانہ کا انتخاب بھی غلط اور خلافِ حکم خدا تھا۔

نہ آج کا بنایا ہُوا خدائی فرمانروا بن سکتا ہے اور نہ اس دَور کا لوگوں کا بنایا ہُوا خدائی خلیفہ و جانشین رسول بن سکتا ہے
پس وہ رسولؐ جو مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی (خواہشِ نفسانی سے کلام نہیں کرتا) اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (ان کا کلام تو وحی خدا سے ہی ہوا کرتا ہے) اپنی امّت کو کسی سرپرست کے بغیر قطعاً چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمام احکام قرآنیہ بیان کر کے جائیں اور اتنا بڑا مسئلہ جس پر بعد میں قیامت تک کے لئے پوری امّت کے دینی مسائل کے حل کا دارومدار ہے اس کو بغیر بیان کے چھوڑ جائیں ؟

انہوں نے کھُلے الفاظ میں صریح اور غیر مبہم بیان میں صاف طور پر ثقلین کے ساتھ تمسک کا حکم فرمادیا ۔ زبان سے بھی سنایا اور ہاتھوں پہ بلند کر کے دکھایا بھی اور سُنایا بھی اور عملی طور پہ تاج پوشی کر کے بھی آنے والے خطرات کا سدّباب کیا اور یہ سب کچھ اللہ ہی کی جانب سے تھا انہوں نے صرف پہنچا دیا ۔

اگرچہ قوم طالوت نے طالوت کے منتخب من اللہ ہونے پر اس کی مالی کمزوری کا اعتراض کیا تھا لیکن خُدا کے نزدیک چونکہ معیارِ انتخاب پر پُورا اترنے والا صرف وہی تھا ۔ اس لئے وہی منتخب ہُوا اور وہی خدائی عہدہ دار رہا ۔ خواہ کسی نے مانا یا نہ مانا ۔ خدائی عہدہ جس کے پاس ہو کسی کے تسلیم نہ کرنے سے چھن نہیں سکتا ۔ جس طرح خُدا کو نہ ماننے والے اس کی خدائی میں موجب نقصان نہیں ہو سکتے ۔ رسولؐ کو رسولؐ نہ تسلیم کرنے والے آنحضرتؐ کی رسالت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔ اسی طرح علیؑ اور اولادِ علیؑ سے منہ موڑنے والے ان سے نہ عہدۂ ولایت و امامت چھین سکتے ہیں اور نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں وہ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہے وہ نہ قرآن سے جُدا ہیں اور نہ قرآن ان سے جُدا ہے خواہ کوئی تسلیم کرلے یا نہ کرے

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الْمُتَمَسِّكِيْنَ بِالثَّقَلَيْنِ كِتَابِكَ وَعِتْرَةِ نَبِيِّكَ الطَّاهِرِيْنَ

قرآن اور ختمِ نبوّت

کتبِ سماویہ میں سے قرآن مجید کا آخری کتاب ہونا مسلّماتِ اسلامیہ میں سے ہے لیکن یہ کیوں ؟

تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ہر فردِ انسانی کا تدریجی ارتقاء اور ہر مرتبہ میں اس کی دماغی و ذہنی صلاحیتوں کا معتدبہ تفاوت اس امر کا مقتضی ہے کہ اسے ہر مرتبہ میں اسی ہی مرتبہ کی مناسبت سے تعلیم و فرائض و احکام کا حامل قرار دیا جائے کیونکہ وہ اسی کا ہی اہل ہے ۔

جس طرح ترقی کے تدریجی مدارج میں بچپنے اور جوانی و بڑھاپے کا فرق ہے کہ بچپنے کے انتہائی دانشمندانہ افعال دورِ جوانی میں طفلانہ حرکات شمار کئے جاتے ہیں گو بچے کے لئے اس دَور میں وہی زیبا اور اس کی کامیابی و کامرانی و ہر دلعزیزی کا وہی معیار ہوتے ہیں ۔ بچے کے لئے ابتدائی درجہ میں حروفِ تہجّی کا سمجھ لینا اور یاد کرنا ویسا ہی مشکل ہوتا ہے ۔ جیسا کہ منتہی

طلبہ کے لئے اپنا کورس ۔ تاہم کامیابی ہر دور میں اپنے مناسب نصاب و معیار کے ماتحت ہوا کرتی ہے لیکن دل و دماغ پر نتائج کے اثرات یکسانیت سے ہوتے ہیں ۔ کامیابی کی خوشی جس طرح منتہی کو ہوتی ہے ۔ اسی طرح مبتدی کو بھی ہوتی ہے۔ اور ایسا ہی ناکامی کا درد و افسوس بھی دونوں کو ہوتا ہے ۔ لیکن خوشی و غمی کی مقدار میں مراتب ذہن کے تفاوت کے لحاظ سے اختلاف ضرور ہوا کرتا ہے ۔

پس مدارج و مراتب کا اختلاف جب روزِ روشن کی طرح واضح ہے تو قطعاً معقول نہیں کہ ہر مرتبہ کا مدرس ایک ہی قابلیت و اہلیت کا حامل ہو ۔ بلکہ ہر مرتبہ میں اسی مرتبہ کے نصاب کے پیشِ نظر اسی معیار کے معلم کا انتخاب عین دانائی ہے اور اس کے خلاف کرنا عقلی طور پر قطعاً غلط اور ناجائز ہے ۔

یہ اختلاف انسانوں کی صرف شخصی زندگی تک محدود نہیں بلکہ اقوام کی اجتماعی زندگیاں بھی اسی طرح کے نشیب و فراز سے دوچار ہیں ۔ تاریخی مطالعہ سے اس نتیجہ پر بخوبی پہنچا جاسکتا ہے کہ اقوام کی ابتدا و وسط و انتہا میں واضح طور پر بچپنے جوانی اور بڑھاپے کا سا فرق رونما ہوتا ہے

بلکہ پوری نوعِ انسانی کے تدریجی ارتقاء کا بعینہ یہی حال ہے انسان کا ابتدائی دَور نوعِ انسانی کے بچپنے کا دَور تھا ۔ رفتہ رفتہ ترقی کی منازل عبور کرنے کے بعد اس منزل کی نوبت آپہنچی ۔ جسے نوعِ انسانی کی جوانی کا آغاز کہا جاسکتا ہے تو چونکہ ہر مرتبہ انسان ایسی ہی مرتبہ کی تعلیم و تربیت کا اہل اور ایسی موزونیّت سے فرائض و احکام کا حامل ہوا کرتا ہے ۔ لہذا اسی ہی مرتبہ کا معلم خدا کی طرف سے منتخب کیا جانا ضروری تھا ۔ پس خالقِ علیم و حکیم نے اسی ترتیب سے انتخاب فرمایا ۔

صحف آدمؑ جس درجہ کا نصاب تھے حضرت آدمؑ اسی درجہ کے معلم تھے اسی طرح صحف نوحؑ ۔ صحفِ ابراہیمؑ تورات موسیٰؑ ، زبورِ داؤد اور انجیل عیسٰیؑ جن جن انسانی مدارج کا نصاب تھیں ۔ یہ انبیاء علیہم السّلام انہی درجات کے لئے باختلاف مدارج معلم و مبلّغ بن کر تشریف لاتے رہے ۔

اب نوعِ انسانی میں پوری صلاحیتیں موجود ہوگئیں تھیں اور اس کا دورِ شباب سے ہم آغوش ہوگیا تھا ۔ تو حکیم مطلق نے اس کی فلاح و بہبود اور عمل و کردار کے لئے وہ آخری نصاب تجویز فرمایا جو نوعِ انسانی کی آخری سانس تک اس کے لئے مشعلِ راہ بن سکے اور قطعاً کسی وقت تبدیل نہ کیا جائے اور فرمایا ۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (تحقیق یہ قرآن انتہائی سیدھے اور مضبوط رستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے) ملاحظہ فرمائیے جس کو خود علیم و حکیم (اَقْوَم) انتہائی سیدھا و مضبوط ۔ کی لفظ سے تعبیر فرمائے تو اس میں تغیّر و تبدل کا امکان ہی کیا ہو سکتا ہے ؟ کیونکہ اس کے علاوہ جو بھی ہوگا ۔ اس سے کم ہوگا کیونکہ اس کے برابر اگر ہو تو اس کو یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ نہیں کہا جاسکتا ۔

پس جب قرآن مجید تکمیل تعلیم نفوس انسانیہ کا آخری کورس ہوا تو اس کا لانے والا نبی کمالات انسانیہ میں آخری حد امکان پر فائز ہو کر نوعِ انسانی کی آخری صف تک باوجود تفاوت استعدادات و اختلافات اذہان کے قابل پذیرائی ہو ورنہ

دامنِ انتخاب علیم وقدیر پر جہل یا عجز کا بدنما داغ لگ جائے گا جو شانِ اقدس الٰہیہ کے سراسر خلاف ہے اور وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات با برکات ہے جو ورائے ہمہ صفات کمالات ہے جس کو اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم اور وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ اور خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے مقدس القاب سے سرفراز فرما کر اللہ نے مبعوث فرمایا

پس معلوم ہُوا کہ اس نبی کی نبوّت وجودِ عالمِ امکان کی آخری حد تک ہے جس کے بعد قیامت ہے۔ لہٰذا اس نبی کے بعد کسی نبی کی آمد کا امکان ہی نہیں کیونکہ نہ نوعِ انسانی میں مزید ایسی صلاحیتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو معیارِ قرآن سے بالاتر ہوں اور نہ تعلیماتِ قرآنیہ میں ردّ و بدل یا نسخ کا کوئی امکان باقی ہے ورنہ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَم کے منافی ہوگا۔ اور نہ مراتبِ کمالاتِ انسانیہ میں کوئی ایسا گوشہ خالی ہے جس تک جناب رسالتمآبؐ کی رسائی نہ ہوئی ہو۔

لہٰذا جناب رسالتمآبؐ نوعِ انسانی کے آخری نصاب کے آخری مدرس ہیں۔ ان کے بعد نہ کسی کی گنجائش ہے اور نہ کوئی آسکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مستقل نبی گو نہیں آسکتا۔ لیکن آنحضرتؐ کے بعد کسی ظلّی بروزی یا امتی نبی کے آجانے میں کیا حرج ہے کیونکہ یہ نئی شریعت نہیں لاتے بلکہ ان کا کام اسی نبی کی تعلیمات کی توضیح و ترویج ہی ہوتا ہے اور بس تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کی شریعت کی توضیح و ترویج یا تشریح و تبلیغ کا فریضہ اس کے اوصیاء و خلفائے طاہرینؑ کے بعد تمام علماء پر عائد ہوتا ہے تاہم وہ نبوّت کے مقدس اور خصوصی لقب سے ملقب نہیں کئے جا سکتے۔ علاوہ ازیں جناب رسالتمآبؐ کا ارشادِ گرامی لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ اور اس کا ناقابلِ تخصیص عموم کسی مدعیٔ نبوت کو (خواہ امتی یا جزوی یا ظلّی و بروزی نبی کہلوانے کے ہزاروں بہانے بناتا پھرے) صفِ انبیاء میں قدم دھرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

نیز کسی جزوی نبی کی بعثت نوعِ انسانی کی تدریجی طرزِ تعلیم کے بھی منافی ہے جسے کوئی صاحبِ ہوش و ذی شعور قبول نہیں کر سکتا۔ مثلاً کسی کالج کے پرنسپل کے چلے جانے کے بعد کسی طالب علم کو (گو پورے کالج میں ممتاز ہی کیوں نہ ہو) کالج کا پرنسپل نہیں بنایا جا سکتا۔ خواہ اس کی کارکردگی کالج بھر میں افادی حیثیت کی حامل بھی ہو ویسے وہ اپنی بلند استعداد اور افادیت کے پیشِ نظر انعام واکرام کا مستحق بھی ضرور ہوگا۔ لیکن اگر اُس نے اس خطاب مخصوص کو ہتھیانے کی کوشش کی تو اس کی محنت اکارت جائے گی اور اس کی سب حسنِ کارکردگی افسرانِ بالا کی نگاہوں میں محض بدنیتی پر محمول ہوگی اور کالج سے نکال دینے کے علاوہ اس کو عبرتناک سزا دینا بھی عین انصاف ہوگا۔ بلکہ طالب علم تو درکنار کالج کا ممتاز ترین پروفیسر بھی اس خطاب کا اہل نہیں ہوا کرتا اگر وہ بھی ایسا کرے تو ویسی ہی سزا بلکہ اس سے بھی زیادہ سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ پس اس مقام پر کسی بھی شخص کا ادعائے نبوّت نوعِ انسانی کو دھوکا دینے اور سادہ لوح انسانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ پھر اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری پھر کیسے ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ فرائضِ نبوّت کی انجام دہی کے لئے تشریف نہ لائیں گے بلکہ حضرت رسالتمآبؐ کے آخری قائمقام حضرت مہدی امام آخرالزمان علیہ السلام عجل اللہ فرجہٗ کے مقتدی اور مؤید بن کر آئیں گے تاکہ اطرافِ عالم میں

پہلی ہوئی قوم نصاریٰ کے دل و دماغ میں جناب رسالتمآبؐ کی عظمت اور ان کے دین کا سکہ بیٹھ جائے۔ اور ان کے لئے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا رستہ ہموار ہو جائے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس جرم کی پاداش میں ان سے عہدۂ نبوت سلب کیا جائے گا اگر ان کا جرم ثابت ہو تو ان کی نبوت ہی ساقط ہے اور اگر ان کا کوئی جرم نہیں تو پھر بلا وجہ ان سے عہدہ نبوت چھین کر صفِ امت میں کھڑا کر کے دوسرے کا مقتدی بنانا عدل خداوندی سے دُور بلکہ منافیٔ عدل ہے۔

(۱) اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا حضرت مہدیؑ علیہ السلام کی اقتدا میں ہونا نہ ان کی توہین ہے اور نہ منافیٔ نبوت ہے تاکہ منافیٔ عدلِ خداوندی ہو۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کا خضرؑ کی شاگردی میں داخل ہونا نہ ان کی توہین تھا۔ اور نہ منافیٔ نبوت۔ چھوٹے مدرسے کا مدرس اعلیٰ اگر کسی کالج کے پرنسپل یا اس کے قائمقام یا ماتحت پروفیسر کے شاگردوں کی صف میں داخل ہو کر کچھ استفادہ کرلے تو یہ چیز نہ اس کی منقصت و توہین کی موجب ہے اور نہ اس کی ملازمت کے منافی ہے بلکہ وہ اپنے سکول میں ویسے کا ویسا معلم و استاد ہے لیکن کالج کے پرنسپل کے سامنے یا اس کے قائمقام یا ماتحت پروفیسروں کے سامنے شاگرد کی حیثیت سے ہے اس کے چھوٹے سکول کے مدرس ہونے کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہوا کرتا کہ وہ کالج میں بھی اسی مدرسی کی حیثیت سے جائے۔ ورنہ اس کی توہین ہوگی اور اس کی معلمی کے منافی ہوگی۔ بلکہ کالج کے پرنسپل سے کچھ استفادہ کر لینے کے بعد وہ اپنی پہلی ڈگری سے ترقی کر کے بلند درجہ کی تدریس کے قابل ہو جائیگا

(۲) نیز یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ جب وہ تشریف لائیں گے تو وہ عالمین کے نبی تو تھے نہیں۔ لہٰذا عالمین کے ہادی کے پیچھے کھڑے ہو کر اپنی قوم نصاریٰ کو پیغام خدا سنائیں گے اور جناب رسالتمآبؐ کے دین پر آنے کی دعوت دیں گے اور عمل سے حضرت حجتؑ علیہ السلام کی اقتداء میں نماز پڑھ کر اپنی قوم کے سامنے ان کا واجب الاتباع اور امام برحق ہونا ثابت کریں گے لہٰذا ان کا عہدہ ان سے چھینا نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ اپنے عہدۂ نبوت کے ماتحت اپنا تبلیغی فریضہ ادا کریں گے۔

(۳) نیز یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہا۔ حضرت مہدیؑ کے پیچھے کھڑے ہو کر اُن کے عقائد فاسدہ کو عملی طور پر باطل کریں گے کہ اگر خدا یا خدا کا بیٹا ہوتا تو کسی مخلوق کی اقتدار میں کیوں ہوتا؟ اور یہ بات اُن کے عہدۂ نبوت سے کیا منافات رکھتی ہے؟ بلکہ بطابق عہدہ فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی ہے اور اس سے پہلی فصل میں ثابت ہو چکا ہے کہ گذشتہ انبیاء اپنی امتوں کے نبی اور سردار تھے۔ لیکن حضرت محمد مصطفیٰؐ کی عالمی نبوت کے مقابلہ میں وہ بحیثیت رعایا اور امت کے تھے اور اسی طرح حضرت کے برحق جانشینوں کے سامنے بھی وہ رعایا کی حیثیت سے ہیں۔ پس حضرت عیسیٰ اپنی امت کے لئے فرائضِ نبوت کی ادائیگی کریں گے اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کے آخری جانشین کی اقتداء میں کھڑے ہو کر دنیائے اسلام کے

---

[۱] ان کا اس فریضۂ تبلیغ کا ادا کرنا بحیثیت نبی کے نہیں ہوگا، بلکہ حضرت مہدی کے ایک مقتدی و سپاہی کی حیثیت سے ہوگا۔ لہٰذا اس کی ختم نبوت سے کوئی منافات نہیں۔ گویا حضرت عیسیٰؑ دینِ اسلام کے مبلغ ہوں گے اور حضرت مہدیؑ کے ماتحت کام کریں گے (منہ)

سامنے ایک عملی وعظ و نصیحت بھی فرمائیں گے اور وہ یہ کہ ۔اے انتخاب سے محمد مصطفےٰ کے جانشینوں کا تعین کرنے والو۔ دیکھ لو محمد مصطفےٰ کا جانشین وہ ہوسکتا ہے جو گذشتہ تمام نبیوں پر حکومت کر سکتا ہو اور انبیاء چونکہ معصوم ہوا کرتے ہیں۔ لہذا اس کو معصوم ہونا چاہیئے۔ پس غیر معصوم قطعاً حضرت محمد مصطفےٰ کا جانشین نہیں ہوسکتا۔

میرے اس پورے بیان کا ماحصل یہ ہے۔

چونکہ قرآن مجید تکمیل نفوس انسانیہ کا آخری کورس ہے۔ لہذا اس کا معلم و مدرس نبی بھی آخری نبی ہے۔

چونکہ قرآن مجید شریعت کی آخری کتاب ہے۔ لہذا اس کو لانے والے نبی کی نبوت بھی آخری نبوت ہے۔

قرآن آخری کتاب اور شریعت آخری شریعت ہے پس محمد مصطفےٰ آخری نبی اور اسلام آخری دین ہے۔

قرآن کے بعد کسی دوسری کتاب کے نازل ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ کتاب بھی جھوٹی ہوگی اور اس کتاب والا بھی جھوٹا ہوگا۔ اسی طرح دین اسلام کے بعد کسی اور دین کے پیش کرنے والا بھی جھوٹا اور اس کا دین بھی جھوٹا ہوگا۔ پس محمد مصطفےٰ کے بعد اگر کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے تو اس کی نبوت جھوٹی اور وہ بھی جھوٹا ہوگا۔

والحمد للہ رب العلمین

قرآن اور وجودِ مہدیؑ عج

گذشتہ بیان میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ قرآن آخری کتاب اور اس کے لانے والا رسولؐ آخری رسولؐ ہے۔

حدیث قدسی مشہور لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ کا مطلب یہ ہے کہ حضور رسالتمآبؐ ہی مقصد تخلیق عالم تھے تو جب آپ اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف تشریف لے گئے تو کائنات کے وجود کو بھی تو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ جس کی خاطر یہ سب کچھ بنایا۔ جب وہ نہ رہا۔ تو اس سب کچھ کے باقی رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ جس معزز مہمان کی آمد کے لئے پلنگ بستره لگایا جائے۔ دسترخوان بچھایا جائے۔ فانوس جگایا جائے تو اس کے رخصت ہو جانے کے بعد سب سامان سمیٹ دیا جاتا ہے۔ پس اسی طرح جب مقصد خلقتِ کائنات و آسمانی آخری کتاب (قرآن مجید) کا آخری مبلغ موجود نہیں تو یہ کتاب کس لئے ہے اور دیگر تکالیفِ شرعیہ کیوں باقی ہیں؟

تو اس کا جواب بلکہ واحد حل یہی ہے کہ ابھی کسی آنے والے کا انتظار ہے اور ابھی وجود کائنات کا سہارا اور کتاب خدا کا مدرس ایک ایسا فرد موجود ہے جو حدیث لولاک کے مصداق کا حصہ ہے۔ ورنہ جس طرح حضورؐ تشریف لائے۔ اور چلے گئے اگر ان کے بعد حدیث لولاک کے اور مصادیق کی آمد نہ ہوتی اور دنیا میں ان کا حقیقی جانشین باقی نہ ہوتا۔

تو نہ کتاب باقی رہتی اور نہ مکتب باقی رہتا ۔ پس کتاب اور مکتب کا وجود مدرس کتاب کے وجود کی دلیل ہے ۔

علاوہ ازیں گذشتہ صفحات ۶۲ ۔ ۷۱ ۔ ۹۳ ۔ ۹۴ میں وجود حضرت ولی العصر مہدی عج آخر الزمان علیہ السلام کے متعلق مختصر طور پر روشنی ڈالی جا چکی ہے اور صاحب انصاف کے لئے وہ کافی ہے ۔

قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جن کی تاویل حضرت حجت علیہ السلام کے وجود مسعود اور ان کے زمانہ اور زمانہ والوں سے کی گئی ہے ۔

(۱) وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ

ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ بات لکھ دی ہے کہ میرے صالح بندے ہی میری زمین کے وارث ہونگے (ان سے مراد حضرت حجت اور ان کے اصحاب ہیں (بحار الانوار ج ۱۳)

(۲) يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ الآیۃ

لوگ اللہ کے نور کو منہ سے بجھانا چاہتے ہیں اور خدا اپنے نور کو تمام کرنیوالا ہے تاکہ تمام دینوں پر اس کو غلبہ دے (حضرت قائم کا دور مراد ہے) بحار الانوار ج ۱۳

(۳) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الآیۃ)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسکو تمام دینوں پر غلبہ دے (حضرت قائم کا زمانہ مراد ہے (بحار الانوار جلد ۱۳)

پہلی آیت میں ہے کہ میری زمین کے وارث صالح بندے ہوں گے اور تیسری آیت بتلاتی ہے کہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غلبہ دیگا ۔ تو جو لوگ اس وقت تک دعوائے مہدویت کر چکے ہیں ۔ ان کی تکذیب کے لئے تو ان آیات مجیدہ کے ظاہری الفاظ ہی کافی ہیں کیونکہ حضرت مہدیؑ کی حکومت پوری روئے زمین پر ہوگی اور یہ چیز کسی بھی مدعی مہدویت کو نصیب نہ ہوئی ۔ نیز حضرت مہدیؑ کے دور میں خدا کا دین تمام باطل دینوں پر غالب ہو جائے گا ۔ حالانکہ ان مدعیان مہدویت کی تحریکات معدودہ افراد تک محدود ہیں ۔ پس معلوم ہوا کہ یہ لوگ ان آیات کے مصداق نہیں تھے بلکہ غلط دعویدار تھے اور جھوٹے مدعی مہدویت تھے آیات متذکرہ جس مہدیؑ کی آمد کا پتہ دیتی ہیں وہ ابھی آنے والا ہے اور جب آئے گا تو اس کی حکومت بھی پوری روئے زمین پر ہوگی اور دین خدا غالب بھی ہو گا ۔ حتیٰ کہ ادیان باطلہ مٹ جائیں گے ۔

نیز ان مدعیان مہدویت کا جب سے سلسلہ شروع ہوا عالم اسلامی تو درکنار پوری زمین سے رفتہ رفتہ امن و آرام چین و اطمینان ختم ہونے لگ گیا اور فسق و فجور کا دور دورہ عام ہونے لگ گیا ۔ حتیٰ کہ پوری دنیا سے امن و آرام صرف برائے نام ہی باقی رہ گیا ۔ لیکن ان آیات سابقہ کے حقیقی مصداق جب ظہور فرمائیں گے تو پوری دنیا امن و آرام سے اس طرح معمور ہو جائے گی ۔ جس طرح اس سے پہلے ظلم و ستم اور فسق و فجور سے بھرپور ہو چکی ہو گی ۔

(۴) وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي

وعدہ کیا ہے اللہ نے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے تم میں سے اور عمل صالح کئے ہیں کہ ضرور خلیفہ زمین ان کو بنائے گا ۔ جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا اور ضرور پوری قدرت دے گا ان کے اس دین کو جو چن

ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا — لیا ان کے لئے اور البتہ ضرور ان کے خوف و ہراس کو امن سے تبدیل کر دے گا۔

(۵) وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَّنَجْعَلَھُمُ الْوَارِثِیْنَ — ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں کمزور قرار دیئے گئے اور ان کو امام بنائیں اور زمین کا وارث مقرر کریں۔

بحارالانوار جلد ۱۳ میں ہے کہ یہ ہر دو آیات حضرت حجت ؑ کے متعلق ہیں۔ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن کی تاویل حضرت حجت ؑ کے متعلق کی گئی لیکن سب کا ذکر کرنا اثبات مطلب کے لئے ضروری نہیں۔ لہٰذا ہم ان ذکر شدہ پنج آیات پر اس مقام میں اکتفا کرتے ہیں البتہ اپنے اپنے مقام پر آیات کی تاویلات جو آئمہ سے منقول ہوتی رہیں گی۔ بیان کروں گا۔

ان دو آیتوں میں پہلی آیت کو بعض ناسمجھ لوگ خلافتِ اجماعیہ پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ اس کے مصداق وہی لوگ تھے۔ جو خلیفے بن گئے۔ لہٰذا ان کی خلافت سے ثابت ہوا کہ وہ ایماندار اور صالح بھی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حب الشئی یُعمی ویُصم۔ یعنی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے اگر اس آیۂ مجیدہ کے صرف تحت اللفظی ترجمہ پر ہی غور کیا جائے تو قطعاً خلافتِ اجماعیہ کے انعقاد کے بطلان پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آیۂ مجیدہ میں خدا وعدہ فرماتا ہے کہ میں بناؤں گا۔ یعنی میری طرف سے منصوص ہو گا اور وہ سوائے حضرت علیؑ کے صحابہ میں اور کوئی بھی نہیں۔ جناب رسالتمآبؐ نے مقام غدیر پر اعلان فرمایا اور عملی طور پر اسے بلند کر کے بھی دکھایا تاکہ کوئی شک و شبہ نہ رہ جائے اور حضرت کے سامنے لوگوں نے بخ بخ کی صدائیں بھی بلند کیں۔ اگر لَیَسْتَخْلِفَنَّ کا کوئی مصداق صحابہ میں سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضرت علیؑ ہی کی ذات بابرکات ہے ان کے علاوہ نہ کوئی اور منصوص من اللہ ہے اور نہ اس آیۂ شریفہ کا مصداق بن سکتا ہے۔

نیز اس امر کی مزید وضاحت کے لئے خدا نے یہ بھی ساتھ ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کو خلیفہ اسی طرح بناؤں گا۔ جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو میں نے خلیفہ بنایا۔ اب آثارِ صحیحہ سے صاف معلوم کیا جا سکتا ہے کہ پہلی خلافتیں آیا اجماع سے منعقد ہوئی تھیں یا خدا کی طرف سے منصوص تھیں؟ پس جس طرح خدا نے ان گزشتہ لوگوں کو خود خلافت کے لئے منتخب فرمایا اور لوگوں کو حق انتخاب سے محروم رکھا۔ اسی طرح یہاں بھی فرماتا ہے کہ میں اسی طریق سے خلافت دوں گا جس طرح گزشتہ لوگوں کو خلافتیں دیں۔

اور اگر بالفرض یہ آیۂ استخلاف ان لوگوں کی خلافت پر نص ہے جن کو خلیفہ بنا لیا گیا۔ تو کم از کم ان خلیفہ بننے والوں کو تو یہ علم ہونا چاہیئے تھا۔ کہ یہ آیت ہماری خلافت پر نص ہے اور سقیفائی لمبے چوڑے نزاع میں انصار و مہاجرین کی خلافت کی رسہ کشی کے موقعہ پر اس آیہ مجیدہ سے استشہاد کر لینا ضروری تھا تاکہ جھگڑا طول نہ کھینچتا اور عجیب معمہ ہے کہ محبت کرنے والے اور عقیدت مند تو کہتے ہیں کہ یہ آیہ مجیدہ ان کی خلافت پر دال ہے اور خود ان کو علم ہی نہیں تھا ورنہ ضرور استشہاد

کے طور پر پیش کر دی ہوتی۔

ہاں ضرور ان کو یہ علم تھا کہ ہم اس آیت کے مصداق نہیں کیونکہ اگر ہم اس کو اپنے متعلق مخصوص کر دیں یا اختصاص کا دعویٰ کریں تو مجمع کا ہر فرد بول اُٹھے گا کہ اس صفت میں میں بھی شریک ہوں تو دریں صورت چار و ناچار یا تو حرب و ضرب پر نوبت پہنچ جاتی اور یا آیاتِ مجیدہ کی رہبری کے پیشِ منظر انتخاب خداوندی کو اپنا لیا جاتا اور عہدِ غدیری کا اعادہ ہو جاتا لیکن یہ دونوں صورتیں خلافت کی قمیص اوڑھنے والوں پر گراں تھیں۔ لہٰذا اس آیت کو پیش کرنے کی جرأت ہی پیدا نہ ہوئی۔ اس کی مزید تفسیر و تفصیل جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

اب رہی آخری آیت۔ وہ صاف بتلاتی ہے کہ وارث زمین اس کو بنایا جائے گا۔ جو پہلے کمزور و ضعیف کر دیا گیا ہو۔ وہ خلیفہ و امام بھی ہوگا اور وارثِ زمین بھی ہوگا۔

استخلاف والی آیت کے آخری الفاظ ہیں کہ خلیفہ بننے والوں کی خاطر اپنے پسندیدہ دین کو تمکین تام (پوری طاقت) دوں گا اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دوں گا۔

آخری آیت میں ہے کہ کمزور کئے جانے کے بعد ان کو خلافت و وراثتِ زمین عطا ہوگی۔

ان ہر دو آیات کی تطبیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی مصداق وہ خلافتیں نہیں اور ہرگز نہیں اس لئے کہ

(۱) دینِ اسلام کو تمکینِ تام حاصل نہ ہو سکی۔ ورنہ اطرافِ عالم میں کوئی بھی غیر مسلم نہ رہتا۔

(۲) جناب رسالتمآبؐ کے دَور میں ان کو کون سا خوف تھا۔ جس کو خدا نے خلافت کے سایہ میں امن سے تبدیل کیا۔ بلکہ یہاں تو بالکل معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے کیونکہ جناب رسالتمآبؐ کے دَور میں اہلِ اسلام پورے امن میں ہو گئے تھے۔ اغیار پر ان کا اقتدار قائم تھا۔ آپس میں صلح و آشتی تھی۔ خلافت کے انعقاد کے بعد مسلمانوں میں آپس میں قطعاً صلح و آشتی نہ رہی اگر صرف خلافتِ راشدہ ہی کا دَور لیا جائے۔ تو پہلے خلیفہ کے بعد باقی سب خلفاء مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ کیا اسلام کی تمکین اور خوف کے بعد امن اسی کا نام ہے؟

(۳) کمزور کئے جانے کے بعد ان کو طاقت نہیں ملی، بلکہ اُلٹا اس خلافت کے انعقاد کے بعد تفرق و تشتت کی خلیج کا پاٹ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس کے تلخ اثرات سے خلافت مآب خود بھی نہ بچ سکے۔

(۴) پوری روئے زمین کی وراثت (حکومت و ملکیت) حاصل نہ ہو سکی۔

اسلامی تاریخ کی اوراق گردانی اور صحیح مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آیات صرف آلِ محمد ہی کی رجعت اور حضرت قائم آلِ محمدؑ کی ہمہ گیر حکومت پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ

(۱) پہلی آیت کی رُو سے جس قدر امت نے ان کو خائف و ہراساں کیا ہے۔ اتنا کسی قوم کو کسی دَور میں نہیں کیا گیا ان کو گھروں سے نکال دیا گیا، قتل کیا گیا۔ قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا گیا۔ حقوق سے محروم کیا گیا۔ زندہ دیواروں میں چنوا دیا گیا

گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ عورتوں کو رُلایا گیا اور دربدر پھرایا گیا۔ چھوٹے بچوں پر تشدد کیا گیا۔ غرضیکہ کیا کچھ نہیں کیا گیا۔
اور حد یہ کہ اپنے مقتولین اور شہداء کی مظلومیت کی داستان پڑھنا اور سُننا ان کے لئے ممنوع قرار دیا گیا۔ ان پر گریہ کرنا اور آنسو بہانا حرام قرار دیا گیا۔ اگر تاریخ سادات کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بہت سی سادانیاں اپنے بے گناہ مردوں کے شہید کر دیئے جانے کے بعد اپنے یتیم بچوں کو ساتھ لے کر جنگلوں میں ویرانوں میں۔ پہاڑوں میں بھوک و پیاس کی شدتیں نبھا نبھا کر پیدل سفر کرنے کی تکلیفیں اٹھا اٹھا کر انتہائی غربت و کس مپرسی کی حالت میں دار فانی سے کوچ کر گئیں

خوف کا یہ عالم تھا کہ سادانیاں اپنے خورد سال بچوں کو گھر سے باہر قدم رکھنے سے روکتی تھیں اور بالفرض بچہ باہر جانے پر مُصر ہو جاتا۔ تو مائیں بار بار سمجھایا کرتیں کہ دیکھو بیٹا اگر کوئی تم سے اپنا نسب پُوچھے تو یہ نہ کہنا کہ میں سیّد ہوں اور سادات نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ بہت سے سادات اپنے نسب کو چھُپانے میں اس قدر محتاط رویّہ اختیار کرتے تھے کہ اپنی بیوی تک کے سامنے اپنا سیّد ہونا ظاہر نہ کر سکتے تھے جس کی وجہ سے اولاد کو بھی اپنے سیّد ہونے کا علم نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ بن زید[1] لڑکی کی رحلت کے بعد یہی درد لے کر دنیا سے گئے کہ ہائے میری لڑکی کو مرتے دم تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ میں سیّد زادی ہوں اور علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد سے ہوں۔

آجکل کی حالت بھی دیکھئے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس وقت حکومتِ وقت اور رعایا مل کر سادات کو پامال کرنے کی کوشش میں تھے اور اب حکومت کا رویّہ غیر جانبدارانہ ہے ورنہ اگر آج بھی حکومت کی طرف سے خوف نہ ہوتا تو کیا مجال تھی کہ آلِ محمدؐ کا اعلانیہ طور پر کوئی نام لیتا یا سادات اپنے بزرگوں کے مصائب کی یاد تازہ کرتے ؟

اہلِ اسلام کے علماء نے فتویٰ دے دیا تھا کہ امام حسینؑ کے مصائب سننے سے چونکہ بعض صحابہ کے متعلق بدظنی پیدا ہونے کا امکان ہے لہٰذا شریکِ مجلس ہونا ناجائز ہے۔ بہرکیف خوف و ہراس میں جس قدر آلِ محمدؐ اور ان کے اتباع کو رکھا گیا ہے اس سے بڑھ کر واقع ہونا تو درکنار تصوّر کرنا بھی مشکل اور محال ہے۔

(۲) دوسری آیت کی رُو سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آلِ محمدؐ سے بڑھ کر کسی قوم کو کمزور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔
پس ان آیاتِ مجیدہ کی تاویل سوائے قائم آل محمدؐ عج علیہ السلام اور ان کے انصار کے اور کسی کے متعلق ہرگز نہیں کی جا سکتی وہ منصوص من اللہ ہیں۔ لہٰذا وہی خلیفۃ اللہ ہیں۔ ان کی آمد کے بعد دینِ اسلام کی جُملہ کمزوریاں ختم ہو جائیں گی اور تمام باقی ادیان پر اس کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ وہ امام برحق اور وارثِ زمین ہیں ان کی تشریف آوری خوف کے بعد امن اور ضعف کے بعد طاقت کی حقیقی مصداق ہوگی۔

بہرکیف قرآن مجید میں بہت کافی آیات موجود ہیں۔ جن کی تاویل زمان مہدیؑ سے کی گئی ہے۔ "حدیث" پر ایک طویل روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے من جملہ اور سوالات کے ابوحنیفہ سے اس آیت مجیدہ کی تاویل

---

[1] امام زین العابدینؑ کے فرزند زید کا لڑکا گویا امام زین العابدینؑ کا پوتا تھا (مصنف)

بھی پوچھی تھی نَسِیئُوْا فِیْھَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا آمِنِیْنَ ۔ وہ تو خیر بتا ہی کیا کر سکتا تھا ؟ اس کے چلے جانے کے بعد بعض حاضرین نے امام عالی مقام سے تاویل دریافت کی ۔ تو فرمایا اس سے مراد زمانِ قائم آلِ محمدؐ علیہ السلام ہے

بحار الانوار جلد چہارم باب احتجاجات حضرت امیر المومنین علیہ السلام میں ہے آپ ارشاد فرماتے ہیں ۔

لَوْ قَدْ قَامَ قَائِمُنَا لَاَنْزَلَتِ السَّمَاءُ قَطْرَهَا وَلَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ نَبَاتَهَا وَلَذَهَبَتِ الشَّحْنَاءُ مِنْ قُلُوْبِ الْعِبَادِ وَاصْطَلَحَتِ السِّبَاعُ وَالْبَهَائِمُ حَتّٰى تَمْشِيَ الْمَرْاَةُ مَا بَيْنَ الْعِرَاقِ اِلَى الشَّامِ لَا تَضَعُ قَدَمَيْهَا اِلَّا عَلَى النَّبَاتِ وَعَلٰى رَاْسِهَا زِيْنَتُهَا لَا يُهَيِّجُهَا سَبُعٌ وَلَا تَخَافُهُ

ہمارے قائمؑ کا دور شروع ہوگا تو آسمان سے بارانِ رحمت برسے گی زمین اپنی انگوریاں اگائے گی اور لوگوں کے دلوں سے کینے چلے جائیں گے اور عام حیوانات اور درندے آپس میں اتفاق سے رہنے لگیں گے یہانتک کہ ایک عورت (تنہا) عراق سے شام تک سفر کرے گی ۔ تو پوری راہ میں اس کے قدم سبزہ زار پر ہی آئیں گے اور اس پہ اسبابِ زینت بھی موجود ہونگے لیکن کوئی درندہ اسے دیکھ کر ہیجان میں نہ آئے گا اور نہ وہ خوفزدہ ہوگی ۔

دُعا برائے ظہور حضرت حُجّت عجل اللہ فرجہٗ علیہ السّلام

اَللّٰهُمَّ كُنْ لِوَلِيِّكَ الْحُجَّةِ بْنِ الْحَسَنِ صَلَوَاتُكَ عَلَيْهِ وَعَلٰى آبَائِهِ فِيْ هٰذِهِ السَّاعَةِ وَفِيْ كُلِّ سَاعَةٍ وَلِيًّا وَحَافِظًا وَقَائِدًا وَنَاصِرًا وَدَلِيْلًا وَعَيْنًا حَتّٰى تُسْكِنَهٗ اَرْضَكَ طَوْعًا وَتُمَتِّعَهٗ فِيْهَا طَوِيْلًا

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَعَجِّلْ فَرَجَهُمْ وَسَهِّلْ مَخْرَجَهُمْ وَاَهْلِكْ اَعْدَائَهُمْ اَجْمَعِيْنَ

قرآن کا ظاہر و باطن

کتب عامہ اور خاصہ میں متواتر یا قریب متواتر احادیث وارد ہیں کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور باطن کا باطن یہاں تک کہ سات بواطن موجود ہیں ۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں حلیۃ الاولیاء سے بروایت ابن مسعود نقل کیا ہے ۔

اِنَّ الْقُرْآنَ نَزَلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ مَا مِنْهَا حَرْفٌ اِلَّا وَلَهٗ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَاِنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْطَالِبٍ عِنْدَهٗ مِنْهُ عِلْمُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ

قرآن سات قرأتوں یا سات قسموں میں اترا ہے اور ان میں ہر ایک کیلئے ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور تحقیق علی بن ابیطالب کے پاس اس کے ظاہر و باطن دونوں کا علم ہے

مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار اور مقدمہ تفسیر برہان میں مستقل الواب اسی موضوع پر قائم کئے گئے ہیں اور بہت کافی احادیث ان میں اسی موضوع سے متعلق جمع کی گئی ہیں۔

بعض روایات کا مضمون تو یہ ہے کہ جس طرح باطن کا باطن اور اسی طرح سلسلہ سات بواطن تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے ظاہر کا ظاہر اور اسی طرح کئی ظاہر در ظاہر چلے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کہا گیا ہے کہ انسان کے عقل سے کوئی چیز اتنی دور نہیں جتنی کہ تفسیر قرآن یعنی باقی ہر شئے کا ادراک عقولِ انسانیہ کے ساتھ اگر کر بھی لیا جائے۔ تاہم تفسیر قرآن تک پھر بھی عقل کی رسائی مشکل ہے۔

بعض روایات میں ہے اِنَّ الْقُرْآنَ ذُلُوْلٌ ذُوْ وُجُوْہ فَاحْمِلُوْہُ عَلٰی اَحْسَنِ الْوُجُوْہ یعنی قرآن میں ایک یہ آسانی ہے کہ اس کے معانی میں کئی وجوہ پیدا ہو سکتی ہیں۔ پس اس کو اچھی جگہ پر محمول کر لیا کرو۔ (لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے قیاساتِ عقلیہ اور استحسانات فکریہ کے ماتحت جس کو پسند کر دے لو اور باقی کو چھوڑ دو۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ادلہ شرعیہ جو احادیثِ نبویہ یا فرمائشات عترتِ طاہرہ سے مستفاد ہوں۔ اگر کوئی معنی ان کے ساتھ موافقت رکھتا ہو تو اسے اختیار کر لیا کرو اور حقیقت میں معنی حسن بھی وہی ہے جو قواعد شرعیہ کی رُو سے حُسن ہو ورنہ اگر قواعد شرعیہ کے خلاف ہو اور تفہیم صاحب شرع کے موافق نہ ہو تو وہ قطعاً معنی حُسن نہیں کہا جا سکتا اور قرآن کے معانی میں کثرت احتمالات کا پیدا ہو سکنا اور ایک کا مراد ہونا بھی بتلاتا ہے کہ تنہا قرآن کافی نہیں بلکہ قرآن والا ساتھ ضروری ہونا چاہیے۔ جو اس معنی مقصود کی طرف ہماری رہنمائی کر سکے اور وہ ہیں آلِ محمدؐ جن کو حدیث ثقلین[1] نے غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا ہے۔)

بروایت عیاشی منقول ہے کہ فضیل بن یسار نے حضرت صادق علیہ السّلام سے ظاہر و باطن کا معنی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ظاہر سے مراد تنزیل اور باطن سے مراد تاویل ہے بعض ان میں سے گذر چکی ہیں اور بعض آنے والی ہیں۔

نیز عیاشی نے حضرت امام محمد علیہ السّلام سے نقل کیا ہے کہ آپ نے حمران کو فرمایا کہ ظاہر قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے حق میں نازل ہوا ہے اور باطن سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جو ان جیسے اعمال کریں پس جو کچھ ان کے متعلق اترا ہے ان میں بھی جاری ہے۔

عن غیبۃ النعمانی عن الصادقؑ انہ قال فی حدیث لہ ذکر فیہ اِنَّ مَنْ مَاتَ عَارِفًا بِحَقِّ عَلِيٍّ دُوْنَ غَيْرِہٖ مِنَ الْاَئِمَّۃِ مَاتَ مِيْتَۃً جَاهِلِيَّۃً اِنَّ الْقُرْآنَ تَاوِيْلُہٗ يَجْرِيْ كَمَا يَجْرِي اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَكَمَا تَجْرِي الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ فَاِذَا جَاءَ تَاوِيْلٌ مِنْہُ وَقَعَ فِيْمَا مَا قَدْ جَاءَ

بروایت غیبت نعمانی حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے آپ نے ایک حدیث میں جس میں یہ ذکر کیا کہ تحقیق جو شخص علیؑ کے حق کا عارف ہو کر مرے اور باقی آئمہ کو نہ پہچانتا ہو تو وہ گویا کفر کی موت مرا فرمایا کہ قرآن کی تاویل اس طرح جاری ہے جس طرح دن اور رات جاری ہیں اور جس طرح سورج اور چاند جاری ہیں۔ پس جب تاویل آجاتی ہے تو وہ چیز واقع ہو جاتی ہے پس ان

[1] گذشتہ صفحات میں اس پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے (مصنف)

مِنۡہُ مَّا لَمۡ یَجِیۡئۡ میں سے کچھ آچکی ہیں اور کچھ باقی ہیں ابھی نہیں آئیں۔

اس مضمون کی روایات اور بھی ہیں۔جن میں تاویل قرآن کے جاری ہونے کو دن رات اور شمس و قمر کے جاری ہونے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔یعنی تاویل صرف ایک جگہ ساکن نہیں۔اس سے پہلے کی تفسیر عیاشی کی ہر دو روایات بھی اسی بات کی تصریح کررہی ہیں۔یعنی شان نزول ہر آیت کا ایک ہی واقعہ کے متعلق یا ایک یا چند اشخاص کے متعلق ہی ہوا کرتا ہے۔وہ بے شک اپنے مقام پر ساکن ہے لیکن تاویلِ آیات تمام ان لوگوں پہ حادی اور شامل ہوتی ہے۔جن سے ان جیسے افعال صادر ہوں۔جن سے تنزیل کا تعلق تھا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔کیونکہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے۔جس طرح شب و روز اور شمس و قمر کا ایک جگہ قیام نہیں بلکہ قیامت تک جاری ہیں۔

بنا بریں جو آیات ظاہر اور تنزیل کے لحاظ سے جناب محمدؐ مصطفٰے اور حضرت علی مرتضٰی علیہ السلام سے تعلق رکھتی ہیں وہ باطن اور تاویل کے اعتبار سے ان کے حقیقی جانشین حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے قیامت تک ان آیات کے تاویلاً مصداق ہیں جس طرح کہ وہ تنزیلاً ان آیات کے مصداق تھے۔ظاہر اُن کے لئے تھا اور باطن ان کے لئے ہے تاقیامت۔

پس جس طرح جناب رسالتمآبؐ کا منکر ظاہر و تنزیل کے اعتبار سے جس حکم میں ہے اسی طرح باطن اور تاویل کے لحاظ سے ان کا منکر اسی حکم میں ہے۔پس جس طرح ظاہری اور تنزیلی طور پر علیؑ کی امامت و ولایت کا منکر ان آیاتِ قرآنیہ کا منکر ہے جو علیؑ کی امامت پر دلالت کرتی ہیں۔لہذا اس کی موت کفر و جہالت کی موت ہے اسی طرح باقی آئمہ طاہرین علیہم السلام کی امامت کا منکر تاویلی اور باطنی طور پر انہی آیاتِ قرآنیہ کا منکر ہوگا۔پس اس کی موت بھی موتِ جہالت و کفر ہوگی۔

بلکہ ظاہر و تنزیل کے لحاظ سے منکرین رسالت کا جو بھی حشر ہوگا ان کے بعد حضرت علیؑ اور پھر یکے بعد دیگرے تا قیامت ہر امام برحق کی امامت کے منکر کا حشر از روئے تاویل و باطن وہی ہوگا۔

دن رات اور شمس و قمر کے ساتھ تشبیہہ دینے کا یہی مطلب ہے کہ جب پہلی مرتبہ دن کو دن کہا گیا اور اس کے اوقات کی تقسیم صبح دوپہر ظہر و عصر سے کی گئی یا اس کے دوسرے احکام وضع کئے گئے تو ایک معین دن تھا اور اسی طرح جب رات کو رات کہا گیا اور دیگر اوقات کی تقسیم و احکام کی تعیین کی گئی تو وہ ایک مخصوص رات تھی۔لیکن وہ نام اور باقی تعیینات و تخصیصات قیامت تک کے لئے تمام شب و روز پر حادی ہیں۔بس فرق صرف یہی ہے کہ وہ پہلے شب و روز ظاہری مصداق تھے اور قیامت تک کے شب و روز باطنی مصداق ہیں۔پس فرد اوّل ان احکام کا محل تنزیل تھا اور قیامت تک کے باقی افراد محل تاویل ہیں اور شمس و قمر کی تشبیہہ سے بھی بعینہٖ یہی مراد ہے۔

اب معصوم کے فرمان کی پوری وضاحت ہوگئی کہ قرآن کی تاویل شب و روز اور شمس و قمر کی طرح قیامت تک جاری

ہے تنزیلی اور تاویلی مصداق حکم میں بالکل برابر ہوا کرتے ہیں۔ جس طرح پہلے لیل ونہار قیامت تک کے لیل ونہار کے ساتھ حکم میں یکساں ہیں۔ سرمو تک فرق نہیں۔

چنانچہ بروایت ابو بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ

وَلَوْ كَانَتْ إِذَا نَزَلَتْ آيَةٌ عَلَى رَجُلٍ ثُمَّ مَاتَ ذَالِكَ الرَّجُلُ مَاتَتِ الْآيَةُ، لَمَاتَ الْكِتَابُ، وَلٰكِنَّهُ حَيٌّ يَجْرِي فِيمَا بَقِيَ كَمَا جَرَى فِيمَنْ مَضَى۔

اگر ایسا ہوتا کہ جب ایک آیت ایک شخص کے متعلق اتری اور وہ شخص بعد میں مر گیا تو اس کے ساتھ وہ آیت بھی مردہ ہو گئی ہوتی تو اس طریق سے تو پھر سب کتاب مردہ ہو گئی ہوتی حالانکہ وہ زندہ ہے اور آئندہ کیلئے اسی طرح جاری ہے جس طرح گذشتہ لوگوں کے لئے جاری تھی۔

وعن عبد الرحيم قال ابو عبد الله إِنَّ الْقُرْآنَ حَيٌّ لَمْ يَمُتْ وَإِنَّهُ يَجْرِي كَمَا يَجْرِي اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَكَمَا تَجْرِي الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَيَجْرِي عَلَى آخِرِنَا كَمَا يَجْرِي عَلَى أَوَّلِنَا

بروایت عبد الرحیم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا تحقیق قرآن زندہ ہے مرا نہیں گیا اور وہ اس طرح جاری ہے جس طرح لیل ونہار اور شمس وقمر جاری ہیں اور یہ ہمارے آخر پر ویسے جاری ہے۔ جیسے ہمارے اول پر جاری تھا۔

عن تفسير فرات بن ابراهيم عن خيثمة عن ابي جعفرؑ قال إِنَّ الْقُرْآنَ نَزَلَ أَثْلَاثًا ثُلُثٌ فِينَا وَفِي أَحِبَّائِنَا وَثُلُثٌ فِي أَعْدَائِنَا وَعَدُوِّ مَنْ كَانَ قَبْلَنَا وَثُلُثٌ سُنَّةٌ وَمَثَلٌ وَلَوْ أَنَّ الْآيَةَ إِذَا نَزَلَتْ فِي قَوْمٍ ثُمَّ مَاتَ أُولٰئِكَ مَاتَتِ الْآيَةُ لَمَا بَقِيَ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْءٌ وَلٰكِنَّ الْقُرْآنَ يَجْرِي أَوَّلُهُ عَلَى آخِرِهِ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَلِكُلِّ قَوْمٍ آيَةٌ يَتْلُوهَا هُمْ مِنْهَا مِنْ خَيْرٍ أَوْ شَرٍّ

تفسیر فرات بن ابراہیم سے بروایت خیثمہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ قرآن تین حصوں پر اترا ہے ایک حصہ ہمارے اور ہمارے دوستوں کے بارے میں ہے اور ایک حصہ ہمارے دشمنوں اور ہمارے گذشتہ بزرگوں کے دشمنوں کے حق میں ہے اور ایک حصہ سنت اور امثال میں ہے (اگر ایسا ہوتا) کہ جب کوئی آیت کسی قوم کے متعلق نازل ہوتی اور پھر اس قوم کی موت کے بعد وہ آیت بھی مردہ ہو جاتی تو اس وقت تک قرآن باقی نہ رہا ہوتا۔ (لیکن ایسا نہیں) بلکہ قرآن کا اول آخر پر جاری رہے گا جبتک آسمان و زمین باقی ہیں اور ہر قوم کے لئے آیت موجود ہے کہ وہ اسکی تلاوت کرتے ہیں یا وہ اس آیت سے خیر کے مصداق ہیں یا شر کے۔

عن تفسير العياشي عن عبد الرحيم القصير عن ابي جعفرؑ انه قال في (وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ) عَلِيٌّ الْهَادِي وَمِنَّا الْهَادِي فَقُلْتُ فَأَنْتَ جُعِلْتُ فِدَاكَ الْهَادِي؟ قَالَ صَدَقْتَ إِنَّ الْقُرْآنَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ وَالْآيَةُ حَيَّةٌ لَا تَمُوتُ

تفسیر عیاشی سے بروایت عبد الرحیم قصیر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان (وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ) کے متعلق فرمایا کہ علیؑ ہادی ہے اور ہم میں سے ہادی (مراد) ہے میں نے عرض کی میں آپ پر فدا ہو جاؤں کیا آپ وہی ہادی ہیں؟ تو فرمایا (بالکل) تو نے سچ کہا کیونکہ قرآن زندہ ہے مردہ نہیں اور یہ آیت بھی زندہ ہے مردہ نہیں (اگر

فَلَوْ كَانَتِ الْآيَةُ إِذَا نَزَلَتْ فِي الْأَقْوَامِ وَمَاتُوا مَاتَتِ الْآيَةُ لَمَاتَ الْقُرْآنُ وَلٰكِنْ هِيَ جَارِيَةٌ فِي الْبَاقِينَ كَمَا جَرَتْ فِي الْمَاضِينَ

ایسا ہوتا) کہ ایک آیت جن قوموں کے بارے میں نازل ہوتی اگر ان کے مرجانے کے بعد وہ آیت بھی مردہ ہو جاتی تو (اس طرح) پھر سارا قرآن مردہ ہو جاتا لیکن ایسا نہیں بلکہ وہ آئندہ نسلوں میں ویسے جاری ہے جیسے گذشتہ لوگوں میں جاری تھا

پہلی روایات قرآن کے ظاہر و باطن کے متعلق مقام نبوت و بیان آئیت پر مشتمل تھیں اور آخری روایات مقام اثبات اور بیان لمّیت کے لئے ہیں۔ یعنی وہ روایات بطور دعویٰ تھیں اور یہ روایات بطور دلیل ہیں۔

یعنی اگر معانیٔ قرآنیہ کو فقط ظاہری اور تنزیلی مصادیق پر بند رکھا جائے اور اس کی تاویل کو جاری نہ سمجھا جائے تو اس کا صاف یہ مطلب ہوگا کہ قرآنی ہدایات کے چشمے فقط زمانِ تنزیل تک ہی تھے گویا جناب رسالتمآبؐ کی رحلت اور اختتام وحی کے بعد وہ چشمے بالکل خشک ہوگئے اور قرآن کی معنوی زندگی ختم ہوگئی لیکن چونکہ باتفاق امتِ اسلامیہ قرآن قیامت تک زندہ ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ اس کے مصداق اہلِ خیر سے ہوں یا اہلِ شر سے ہوں قیام قیامت تک زندہ ہیں۔ اور قرآنی احکامات وخطابات میں گذشتہ لوگوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

اب قرآن مجید میں عام طور پر تین قسموں کے مضمون وارد ہیں۔

۱۔ ابتدائے تخلیق حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت ختم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور تک کے انبیاؑ و صالحین اور ان کے اتباع کے تذکرے اور ان کی اوصافِ حمیدہ کا ذکر تاکہ قیامت تک آنے والوں کے لئے مشعلِ راہ قرار دیئے جائیں۔

۲۔ دشمنانِ دین اعدائے انبیاء وصالحین اور ان کے پیروکاروں کے واقعات اور ان کی برائیاں اور ان کے عبرتناک انجام کا ذکر تاکہ قیامت کے لئے باعثِ نصیحت وعبرت ہوں۔

۳۔ اوامر ونواہی وضرب الامثال وجنت ونار وغیرہ کا ذکر تاکہ نیک لوگوں کے انعامات اور بروں کی عقوبات سے نصیحت وعبرت حاصل کرنے کے بعد خوشنودیٔ خدا کی تحصیل اور غضبِ خدا سے اجتناب کے لئے قیامت تک کی آنے والی نسلوں کو طریقِ عمل اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کا پتہ چل سکے اس کے بعد وہ اپنی مرضی سے جنت کی راہ لیں یا دوزخ کا راستہ اختیار کریں۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ یعنی دین میں کوئی مجبوری اور زبردستی نہیں۔ ہدایت اور گمراہی (دونوں کے رستے) واضح ہو چکے ہیں۔

اب تنزیل کے طور پر آیاتِ قرآنیہ کے جو اقسام ہیں۔ تاویل کے اعتبار سے بھی ویسے ہی اقسام ہوں گے۔

پس جہاں تنزیل کے آدمؑ سے لے کر خاتم تک تمام خاصانِ خدا۔ آیاتِ قرآنیہ کے ظاہری مصداق تھے۔ وہاں قیامت تک کے لئے حضرت رسالتمآبؐ کے حقیقی جانشین اور ان کے اتباع واشیاع باطنی طور پر انہی آیاتِ قرآنیہ کے مصداق ہیں۔ اور جہاں ابتداء سے لے کر جناب رسالتمآبؐ کے دور تک کے سب دشمنانِ خدا وانبیاء وصالحین۔ جن جن آیاتِ قرآنیہ کے

ظاہری مصداق تھے۔ وہاں تاویلی طور پر قیامت تک کے تمام اعدائے دین اور دشمنانِ آئمہ طاہرینؑ باطنی مصداق و مقصود ہیں۔

بنا بریں جن آیات کا تنزیلی مصداق حضرت علیؑ ہے ان کا تاویلی و باطنی مصداق ہر زمانہ کا امام ہے اسی لئے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے عبدالرحیم قصیر کے جواب میں وَلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ کا مصداق ہر زمانہ کے امام کو قرار دیا۔ حالانکہ تنزیل کے اعتبار سے اس کے مصداق صرف حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام ہی تھے اور آپ نے یہی استدلال فرمایا کہ قرآن قیامت تک زندہ ہے لہٰذا اس کے مصداق بھی قیامت تک زندہ رہیں گے۔

پس بنا بریں انبیاء کی تاویل آئمہ ہیں اور تمام اعدائے دین کی تاویل ان کے دشمن ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ باقی ہے اس تحقیقی بیان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ آدمؑ کے علم کا جوہر۔ نوحؑ کی خشیت کا مظہر۔ ابراہیمؑ کی خلت کا نقشہ یوسف کے جمال کا جلوہ۔ ایوب کا صبر و رضا۔ عیسیٰؑ کا زہد و تقویٰ۔ موسیٰؑ کی ہیبت و جلال اور حضرت محمد مصطفیٰ کا حسب و کمال بلکہ تمام انبیاء کی حمیدہ خصال کو اگر دیکھنا چاہو تو علیؑ کے چہرہ کی زیارت کرو۔ (یہ ہیں مرقع خصال انبیاء)

عن البحار۔ قال رسول اللہ فی حدیث طویل یا انس۔ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی آدَمَ فِی عِلْمِهٖ وَ اِلٰی اِبْرَاهِیْمَ فِیْ وَقَارِهٖ وَ اِلٰی سُلَیْمَانَ فِیْ قَضَائِهٖ وَ اِلٰی یَحْیٰی فِیْ زُهْدِهٖ وَ اِلٰی اَیُّوْبَ فِیْ صَبْرِهٖ۔ وَ اِلٰی اِسْمَاعِیْلَ فِیْ صِدْقِهٖ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ۔

بحارالانوار سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ایک حدیث طویل میں فرمایا۔ اے انس۔ جو شخص چاہے کہ میں حضرت آدم کو علم میں ابراہیم کو وقار میں سلیمان کو اپنے فیصلوں میں۔ یحییٰ کو اپنے زہد میں۔ ایوب کو اپنے صبر میں۔ اور اسماعیل کو اپنے صدق میں دیکھوں تو وہ علیؑ بن ابی طالب کی طرف دیکھے۔

جب احادیثِ سابقہ سے تنزیل اور تاویل۔ ظاہر اور باطن کے معنی کی وضاحت ہو چکی تو اس حدیث کی تطبیق بالکل آسان ہے کیونکہ جہاں قرآن مجید میں انبیائے سابقینؑ کے جن جن اوصافِ حسنہ اور خصال حمیدہ کا تذکرہ ہے تو وہ ظاہر اور تنزیل کے اعتبار سے ان کے مصداق تھے لیکن چونکہ آیاتِ قرآنیہ قیامت تک زندہ ہیں اگر ان کے مصداق ان انبیاء تک ہی محدود کر دیئے جائیں تو وہ آیاتِ قرآنیہ ہمیشگی کی زندگی سے قطعاً محروم ہو جائیں گی تو اس کا مطلب پھر یہ ہوگا کہ قرآن مجید کل کا کل قیامت تک کے لئے زندہ و ہادی و حجت نہیں۔ تو ماننا پڑے گا کہ انبیائے سابقین کے اوصاف و کمالات کے حاملین بھی قیامت تک زندہ اور باقی ہیں اور باطنی رنگ میں وہ انہی آیاتِ مجیدہ کے مصداق ہیں۔

اپنے دَور میں جناب رسالتمآبؐ ان تمام خصال حمیدہ کا مجسمہ تھے اور ان کے بعد حضرت امیرالمومنینؑ کی ذات تمام خصالِ انبیاء کا خزینہ تھی اور ان ہی تک محدود نہیں۔ بلکہ ہر زمان میں نسلاً بعد نسل ہر زمان میں حجت خدا پیکر خصال انبیاء تھا اور سب کے آخر میں حضرت ولی العصر صاحب الزمان عجل اللہ فرجہ علیہ و علیٰ آباءہ السلام ان تمام اوصاف و کمالات انبیاء و سابقینؑ کے جامع ہیں اور اسی ہی شان و شوکت سے ظہور اجلال فرما کر دنیا کو صلح و آشتی سے پر کریں گے اور فتن و فسادات کا

قلع قمع کریں گے۔

اس مطلب کی مزید وضاحت حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام کی زبان حق ترجمان سے سنیئے۔

(۱) عن امیرالمومنینؑ۔ نَحْنُ اَهْلُ الْبَيْتِ لَا يُقَاسُ بِنَا اَحَدٌ فِيْنَا نَزَلَ الْقُرْاٰنُ وَفِيْنَا مَعْدِنُ الرِّسَالَةِ

حضرت امیرالمومنین فرماتے ہیں کہ ہم اہلبیت کے ساتھ کسی کو برابر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرآن ہمارے متعلق اترا ہے اور رسالت کی کان ہم میں ہے۔

(۲) روی الکلینی باسنادہ عن ابی بصیر قال قال الصادق علیہ السلام یَا اَبَا مُحَمَّدٍ مَا مِنْ آيَةٍ تَقُوْدُ اِلَى الْجَنَّةِ وَلَا يَذْكُرُ اَهْلَهَا بِخَيْرٍ اِلَّا وَهِيَ فِيْنَا وَفِيْ شِيْعَتِنَا وَمَا مِنْ آيَةٍ نَزَلَتْ يَذْكُرُ اَهْلَهَا بِشَرٍّ وَلَا تَسُوْقُ اِلَى النَّارِ اِلَّا وَهِيَ فِيْ عَدُوِّنَا وَمَنْ خَالَفَنَا۔

کلینی نے باسناد خود ابوبصیر سے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ اے ابو محمد۔ جس قدر آیات جنت کی دعوت دیتی ہیں اور ان کے اہل کا ذکر خیر سے کیا گیا ہے وہ ہمارے اور ہمارے شیعوں کے حق میں ہیں اور جس قدر آیات ہیں ان کے اہل کا ذکر برائی سے کیا گیا ہے اور وہ جہنم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ وہ ہمارے دشمنوں اور مخالفوں کے حق میں ہیں

(۳) عن العیاشی عن مُحَمَّد بن مسلم عن ابی جعفرؑ قال یا محمد اِذَا سَمِعْتَ اللّٰهَ يَذْكُرُ قَوْمًا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِخَيْرٍ فَنَحْنُ هُمْ وَاِذَا سَمِعْتَ اللّٰهَ ذَكَرَ قَوْمًا بِسُوْءٍ مِمَّا مَضٰى فَهُمْ عَدُوُّنَا۔

بروایت تفسیر عیاشی۔ محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا۔ اے محمد! جہاں سنو کہ اللہ نے اس امت میں سے کسی قوم کا ذکر خیر کیا ہے (پس جان لو) کہ مراد ہم ہیں اور جب سنو کہ اللہ نے کسی بھی قوم کا ذکر بدی سے کیا ہے جو گذر چکی ہیں (تو جان لو کہ) وہ ہمارے دشمن ہیں۔

(۴) عن امیرالمؤمنینؑ فی حدیث، لہ طویل ذکر فیہ صفات الامام اِنَّ هٰذِهِ كُلَّهَا لِاٰلِ محمد لَا يُشَارِكُهُمْ فِيْهَا مُشَارِكٌ لِاَنَّهُمْ مَعْدِنُ التنزیل ومعنی التاویل۔ الخبر

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے ایک حدیث طویل میں منقول ہے جس میں آپ نے صفات امام کا تذکرہ کیا۔ فرمایا تحقیق یہ سب صفات آل محمد کی ہیں۔ ان میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ کیونکہ یہ تنزیل کی کان اور تاویل کا مقصد ہیں۔ الخبر

(۵) فی مناقب بن شہر آشوب ان معاویۃ قال لابن عباس اِنَّا كَتَبْنَا فِي الْآفَاقِ نَنْهٰى عَنْ ذِكْرِ مَنَاقِبِ عَلِيٍّ فَكُفَّ لِسَانَكَ عَنْهَا قَالَ اَفَتَنْهَانَا عَنْ قِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ قَالَ لَا قَالَ اَفَتَنْهَانَا عَنْ تَاْوِيْلِهِ؟ قَالَ نَعَمْ۔ قَالَ اَنَقْرَاُهُ وَلَا نَسْئَلُ قَالَ سَلْ عَنْ غَيْرِ اَهْلِ بَيْتِكَ

مناقب بن شہر آشوب میں ہے کہ معاویہ نے ابن عباس کو کہا کہ ہم نے اطراف مملکت میں حکمنامہ جاری کر دیا ہے کہ علیؑ کے فضائل کا ذکر نہ کیا جائے۔ پس تم بھی اپنی زبان کو اس سے روک لو۔ ابن عباس نے کہا کہ تو ہمیں قرآن پڑھنے سے روکتا ہے؟ کہا نہیں (ابن عباس) نے کہا۔ کہ کیا تو ہمیں اُس کی تاویل سے روکتا ہے؟ کہا ہاں (ابن عباس) نے کہا کہ کیا ہم قرآن کو پڑھیں اور اس کے متعلق سوال نہ کریں؟ کہا

قال اِنَّہٗ مُنَزَّلٌ عَلَیۡنَا اَفَنَسۡئَلُ غَیۡرَنَا؟ الخبر

کہ سوال کرو لیکن اہلبیتؑ کے غیر سے سوال کرو (ابن عباس) نے کہا کہ آیا ہم پر ہے اور پوچھیں غیر سے؟

(۶) عن الاحتجاج عن الباقر قال قال النبیؐ فی خطبۃ یوم الغدیر معاشر الناس! ھٰذَا عَلِیٌّ اَحَقُّکُمۡ بِیۡ وَ اَقۡرَبُکُمۡ اِلَیَّ ۔ وَاللّٰہُ وَ اَنَا عَنۡہُ رَاضِیَانِ ۔ وَمَا نَزَلَتۡ آیَۃُ رِضًی اِلَّا فِیۡہِ وَمَا خَاطَبَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اِلَّا بَدَءَ بِہٖ وَلَا نَزَلَتۡ آیَۃُ مَدۡحٍ فِی الۡقُرۡاٰنِ اِلَّا فِیۡہِ مَعَاشِرَ النَّاسِ! اِنَّ فَضَائِلَ عَلِیٍّ عِنۡدَ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَقَدۡ اَنۡزَلَہَا عَلَیَّ فِی الۡقُرۡاٰنِ اَکۡثَرُ مِنۡ اَنۡ اُحۡصِیَہَا فِیۡ مَکَانٍ وَّاحِدٍ فَمَنۡ نَبَّاَکُمۡ بِہَا وَعَرَفَہَا فَصَدِّقُوۡہُ

بروایت احتجاج حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے خطبہ غدیر میں ارشاد فرمایا اے لوگو! یہ علیؑ تمہاری بہ نسبت میرے حقوق کا زیادہ حقدار ہے اور میرے زیادہ قریب ہے اللہ اور میں اس سے دونوں راضی ہیں خوشنودی خدا کی جو آیت بھی اُتری ہے اسی کے حق میں ہے اور جس مقام پر بھی خدا نے ایمان والوں کا ذکر کیا ہے اس کا پہلا نمبر ہے قرآن میں کوئی تعریف کی آیت نہیں اُتری مگر اسی کے حق میں۔ اے لوگو! تحقیق علیؑ کے فضائل جو اللہ نے قرآن مجید میں میرے اُوپر نازل کئے ہیں وہ ایک جگہ پہ شمار کرنے میں نہیں آتے۔ پس جو شخص تمہیں اُن کی خبر دے اور ان کو پہچانتا ہو پس اس کی تصدیق کرلو۔

(۷) فی توحید الصدوق وغیرہ باسانید قال الصادقؑ مَا مِنۡ آیَۃٍ فِی الۡقُرۡاٰنِ ۔ اَوَّلُہَا یَا اَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اِلَّا وَ عَلِیُّ بۡنُ اَبِیۡطَالِبٍ اَمِیۡرُہَا وَقَائِدُہَا وَشَرِیۡفُہَا وَاَوَّلُہَا

توحید صدوق و دیگر کتب سے باسانید منقول ہے کہ حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ کوئی آیت ایسی نہیں جس کے اوّل میں یا اَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہو مگر علیؑ بن ابیطالب اس کا امیر و قائد و شریف و اوّل ہے۔

ان روایات کے علاوہ اور بھی اسی مضمون کی روایات بکثرت وارد ہیں۔ جن میں سے بعض ضمنی طور پہ اپنے مناسب مقامات پہ اِن شاءَ اللہ مذکور ہوں گی۔

بہرکیف قرآن قیامت تک زندہ ہے مردہ نہیں۔ لہٰذا اس کی آیات کے مصادیق بھی خواہ نیکوں سے ہوں یا بُروں سے ہوں۔ قیامت تک آتے رہیں گے۔

مطلب کی تائید کے لئے دستور قرآنی ملاحظہ فرمائیے۔ خداوند کریم نے جناب رسالتمآبؐ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کی طرف بہت سے کاموں کی نسبت دی حالانکہ وہ کام ان سے سرزد نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً فرمایا۔ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡبِیَآءَ اللّٰہِ تم نے نبیوں کو کیوں قتل کیا۔ قَسَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ ۔ تمہارے دل سخت ہوگئے۔ نَجَّیۡنٰکُمۡ ہم نے تم کو نجات دی۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ لیکن جن لوگوں نے یہ سب کام کئے تھے حالانکہ ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ان کو گذر چکا تھا۔ یہ لوگ ان کے کاموں کو بُری نگاہ سے نہ دیکھتے تھے بلکہ راضی تھے پس ان کو بھی ان جیسا قرار دیا گیا۔ مَنۡ رَضِیَ بِفِعۡلِ قَوۡمٍ

فَهُوَ مِنْهُمْ ۔ یعنی جس قوم کے فعل پر راضی ہے وہ گویا انہی سے ہے۔

پس ان آیات کے حقیقی مصداق وہ لوگ تھے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں تھے لیکن ان کو انہی جیسا قرار دے کر مصداق آیات بنا یا گیا ہے۔

لہذا گذشتہ لوگوں کے اعمال بد پر راضی ہونے والے یا ان کے افعال کو اپنانے والے اگر ان ہی کے درجہ میں شریک اور ان جیسے ہیں تو گذشتہ لوگوں کے افعال حسنہ اور اعمال صالحہ میں ان کے ساتھ شرکت کرنے والے کیوں نہ ان کے صفات وخطابات کے مستحق ہوں گے؟

فِی الْبُرْهَانِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِنَّ فِیْکُمْ مَنْ یُّقَاتِلُ عَلٰی تَاْوِیْلِ الْقُرْاٰنِ کَمَا قَاتَلْتُ عَلٰی تَنْزِیْلِهٖ وَهُوَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ

برہان میں ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا تحقیق تم میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو تاویل قرآن کے ماتحت جہاد کرے گا۔ جیسا کہ میں نے تنزیل کے ماتحت کیا ہے اور وہ حضرت علی بن ابی طالب ہے۔

پس اس روایت سے بھی بروز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے مقابلہ میں لڑنے والوں کی تنزیل قرآن اور ظاہر قرآن کے اعتبار سے جو پوزیشن ہے۔ اسی طرح حضرت امیرالمومنینؑ اور ان کے مقابلہ میں آنے والوں کی وہی پوزیشن ہے۔

جن خطابات قرآنیہ کے ظاہر و تنزیل کے لحاظ سے وہ حقدار تھے۔ بعینہٖ انہی خطابات کے بلحاظ باطن یہ حقدار ہیں۔ مصداق آیات الہیہ ہونے میں جناب رسالتمآبؐ اور حضرت امیرالمومنینؑ کے درمیان ظاہر و باطن یا تنزیل و تاویل کا فرق ہے یعنی آنحضورؐ ظاہری اور تنزیلی مصداق تھے اور یہ باطنی اور تاویلی مصداق ہیں۔ اس طرح اُن کے دشمنوں کو خطابات قرآنیہ سے جو ظاہری حیثیت تھی۔ ان کے دشمنوں کو باطناً وہی حیثیت حاصل ہے۔ اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے آئمہ طاہرینؑ اور اُن کے ہر دور میں دشمنوں کے درمیان خطابات قرآنیہ کی تقسیم بعینہٖ اسی طرح ہے۔ جیسا کہ اس باب کی گذشتہ احادیث میں بیان ہو چکا ہے

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

قرآن سے شیعہ کا تمسّک

اس عنوان کے تحت میں صرف یہی بیان کرنا ہے کہ شیعہ اثنا عشریہ کا قرآن سے کیا ربط ہے اور ان کا قرآن پر ایمان کس قدر راسخ ہے اور ان کے خلاف کہنے والے کس قدر ان پر بہتان تراشی کرتے ہیں۔

تصریحات علمائے شیعہ

(۱) ابن بابویہ فی الاعتقادات - اعتقادنا فی الفرقان انہ کلام اللہ ووحیہ و تنزیلہ وقولہ وکتابہ وانہ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم علیم وانہ القصص الحق وانہ لقول فصل وما ہو بالہزل وان اللہ تبارک وتعالیٰ محدثہ ومنزلہ وربّہ وحافظہ والمتکلم بہ اعتقادنا - ان القرآن الذی انزلہ اللہ تعالیٰ علی نبیّہ محمد ہو ما بین الدفتین وہو ما فی ایدی النّاس لیس باکثر من ذلک و مبلغ سورہ عند الناس مأۃ واربع عشرۃ سورۃ وعندنا ان الضُّحٰی وَاَلَمْ نَشْرَحْ سُورَۃٌ وَاحِدَۃٌ وَلِاِیلَاف وَاَلَمْ تَرَکَیْفَ سُورَۃ واحدۃ وَمن نسب الینا انا نقول انہ اکثر من ذلک فہو کاذبٌ -

(۲) المجلسیؒ فی الاعتقادات - یجب ان یومن بحقیقۃ القرآن وما فیہ مجملاً وکونہ منزلاً من اللہ تعالیٰ وکونہ معجزاً وانکارہ والاستخفاف بہ کفر وکذا فعل ما یستلزم الاستخفاف بہ کحرفتہ من غیر ضرورۃ والقائہ فی القاذورات -

(۳) المرتضیٰ - ان العلم بصحۃ نقل القرآن کالعلم بالبلدان والحوادث الکبار والوقائع

شیخ ابن بابویہؒ نے رسالۂ اعتقادات میں تحریر فرمایا ہے۔ ہمارا اعتقاد قرآن کے متعلق یہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام اور اس کی معرفت کا ذریعہ اس کی تنزیل۔ اس کا قول اور اس کی کتاب ہے اس کے پاس آگے اور پیچھے سے باطل نہیں آسکتا۔ یہ علیم وحکیم کی نازل کردہ کتاب اور تحقیق یہ بیان حق ہے اور بے شک یہ قول فصل ہے مسخری و مزاح نہیں اور تحقیق اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا پیدا کرنے والا نازل کرنے والا اور محافظ ونگہبان اور کلام کرنے والا ہے۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ تحقیق قرآن جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد مصطفٰےؐ پر نازل کیا وہ وہی ہے جو ان دو تختیوں کے درمیان ہے اور وہی ہے جو عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے کچھ بھی زیادہ نہیں اور اس کی سورتوں کی تعداد لوگوں کے نزدیک ایک سو چودہ ہے۔ اور ہمارے نزدیک الضُّحٰی اور اَلَمْ نَشْرَحْ ایک سورہ شمار ہوتی ہے۔ اور لِاِیلَاف اور اَلَمْ تَرَکَیْفَ دونو ایک سورۃ کے شمار میں ہیں۔ اور جو لوگ ہماری طرف اس سے زیادہ نسبت دیتے ہیں پس وہ جھوٹے ہیں۔

علامہ مجلسیؒ رسالہ اعتقادات میں فرماتے ہیں۔ قرآن کی حقیقت پر ہمارے نزدیک ایمان لانا واجب ہے اور اسمیں جو کچھ موجود ہے (خواہ تفصیل معلوم نہ ہو اس پر اور اس کے منزل من اللہ ہونے پر اور اس کے معجز ہونے پر ایمان لانا ہمارے نزدیک واجب ہے اس کا انکار اور توہین ہمارے نزدیک کفر ہے اسی طرح ہر وہ کام جس سے قرآن کی توہین لازم آئے مثلاً اس کو بلا ضرورت رقم کمانے کے لئے پیشہ بنانا یا نجس جگہ میں ڈالنا حرام ہے کفر ہے)

سید مرتضٰے فرماتے ہیں کہ ہمیں قرآن مجید کے صحیح منقول ہونے کا ایسے علم ہے جیسے دور کے بڑے شہروں اور بڑے حادثوں اور

العظام والكتب المشهورة و اشعار العرب المسطورة

عظیم یادگاروں اور مشہور کتابوں اور جاہل عرب کے شعروں کے صحیح نقل ہونے کا علم ہے۔

۴۔ الطبرسی۔ فی مجمع البیان۔ قال فاما الزیادة فیه فمجمع علی بطلانه واما النقصان منه فقط روی جماعة من اصحابنا وقوم من حشویة العامة ان فی القرآن تغیرا ونقصانا والصحیح من مذهب اصحابنا خلافه

علامہ طبرسی مجمع البیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں زیادتی کا قول باطل ہے (اجماعاً) البتہ کمی کے متعلق ہمارے اصحاب کی ایک جماعت اور سنیوں میں سے بھی بعض لوگوں نے قرآن میں تغیّر اور نقصان کا قول کیا ہے۔ لیکن ہمارے شیعہ علمائے کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے (کوئی کمی نہیں ہے جس طرح کوئی زیادتی نہیں)

یہ سب فرمائشات اکابر علمائے مذہب شیعہ کی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہی موجودہ قرآن جو شرق سے لے کر غرب تک اور جنوب سے شمال تک شائع اور عام ہے جس سے اسلام کا بچہ بچہ واقف ہے۔ یہی قرآن کلام خدا ہے اور جناب محمد مصطفٰے پر اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ اس کی آیات میں سے ایک چھوٹی سی آیت کا انکار کرنا بلکہ ایک حرف کا انکار کرنا بھی کفر ہے اور اس کے کسی فیصلے کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ اسی طرح اس کی توہین یا ہر وہ فعل جس سے اس کی توہین لازم آئے وہ بھی کفر ہے۔

علمائے اسلام زمان آئمہ طاہرین سے لے کر دَور حاضر تک قرآن کی خدمت اور اس کی تبلیغ و ترویج کو اپنا دین سمجھتے رہے ہیں اور رہیں گے چنانچہ ابتدائی عنوانات میں قرآن مجید کے جو فضائل کتب امامیہ سے میں نے نقل کئے ہیں۔ وہ علمائے امامیہ کی مفصل کتب میں جمع شدہ احادیث کے مقابلہ میں ایسے ہیں۔ جیسے بحر زخار کے مقابلہ میں ایک قطرۂ آب شیعہ مذہب میں قرآن ہی رُوح ایمان ہے۔ اگر کتب امامیہ سے قرآن۔ قاری قرآن۔ سامع قرآن۔ حامل قرآن۔ عالم قرآن متعلّم قرآن۔ حافظ قرآن اور کاتب قرآن وغیرہ کے تمام ذکر شدہ فضائل کو جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب میں سمانا بھی مشکل ہے اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام فیصلہ تحکیم کے بعد ایک طویل خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

چنانچہ نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۱ میں ارشاد ہے۔

اِنَّا لَمْ نُحَکِّمِ الرِّجَالَ وَ اِنَّمَا حَکَّمْنَا الْقُرْاٰنَ وَهٰذَا الْقُرْاٰنُ اِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَسْتُوْرٌ بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ لَا یَنْطِقُ بِلِسَانٍ وَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْ تَرْجُمَانٍ وَاِنَّمَا یَنْطِقُ عَنْهُ الرِّجَالُ وَلَمَّا دَعَانَا الْقَوْمُ اِلٰی اَنْ نُحَکِّمَ بَیْنَنَا الْقُرْاٰنَ لَمْ نَکُنِ الْفَرِیْقَ الْمُتَوَلِّیْ عَنْ کِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَقَدْ قَالَ

ہم نے لوگوں کو حاکم نہیں بنایا۔ بلکہ ہم نے تو قرآن کو ہی حاکم قرار دیا تھا اور یہ قرآن سوائے اس کے نہیں کہ دو تختیوں کے درمیان محفوظ خط ہے وہ خود نہیں بولتا بلکہ اس کے لئے ترجمان کی ضرورت ہے اور انسان ہی اس کی طرف سے بولا کرتے ہیں۔ جب قوم (معاویہ) نے ہم کو دعوت دی کہ قرآن کو اپنے درمیان فیصل مقرر کریں تو ہم کتاب اللہ سے منہ موڑنے والا فریق نہیں تھے۔ اللہ سبحانہٗ بھی ارشاد فرماتا ہے کہ اگر تم کسی امر

اللہ سُبْحَانَہٗ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْئٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ فَرَدُّہٗ اِلَی اللّٰہِ اَنْ نَحْکُمَ بِکِتَابِہٖ ۔ الخطبہ

میں جھگڑا کرو تو اس کے فیصلہ کے لئے معاملہ کو اللہ و رسول کی طرف پلٹا دو۔ پس اللہ کی طرف پلٹانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے نزاعات میں اس کی کتاب کو حاکم بنائیں۔ الخطبہ

اسی قرآن کا فیصلہ جنگِ صفین میں ہر دو فریق نے تسلیم کیا تھا اور جنگ روک دی گئی تھی۔ پھر تحکیم کے بعد فیصلہ قرآن مجید کے مطابق ہوا یا نہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے جو موضوع کتاب سے خارج ہے۔ بہر کیف یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت علیؑ والوں کے پاس کوئی دوسرا قرآن نہیں تھا بلکہ وہی تھا جو معاویہ والوں کے پاس تھا۔

عمل علمائے شیعہ

مذہب شیعہ کے علمائے اعلام رضوان اللہ علیہم نے قرآن مجید کی بہت بڑی تفاسیر لکھی ہیں اور وہ سب اسی قرآن کی ہیں جو تمام اہلِ اسلام کے پاس موجود ہے۔ ایک حرف تو بجائے خود ایک نقطہ بلکہ زیر و زبر تک کا فرق نہیں اور اکثر مفسرین نے اپنی تفاسیر کے مقدمہ میں فضائلِ قرآن کا ایک مستقل باب قائم کرکے اس بارہ میں بہت کچھ احادیثِ آئمہ نقل کی ہیں اور علمائے شیعہ نے جتنا اہتمام احادیثِ آئمہ کے جمع کرنے کے لئے کیا ہے اس سے کہیں زیادہ اہتمام تفسیر قرآن کے لئے کیا ہے اور تصانیف فریقین پر استقرائی نظر کرنے کے بعد منصف طبائع اس نظریہ پر پہنچ جاتی ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیری خدمات میں علمائے امامیہ تمام ملل و مذاہب اسلام سے گوئے سبقت لے گئے ہیں اور عموماً دیگر فرقوں کے اکابر نے ان کے علمی افادات سے خوشہ چینی کی ہے۔

علمائے امامیہ کا یہ اہتمام بتاتا ہے کہ مذہب شیعہ کا اصل و اساس صرف قرآن مجید ہی ہے جس طرح کہ آئمہ طاہرینؑ سے گذشتہ ابواب میں قرآن مجید کے ساتھ تمسک پکڑنے کا پُرزور فرمان اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ البتہ بات یہ ہے کہ شیعہ تنہا قرآن کو کافی نہیں جانتے بلکہ وہ حدیثِ رسول اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ کے پیشِ نظر قرآن کے ساتھ ساتھ اہلبیت رسولؐ کے ساتھ تمسک کرنا بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔

شیعہ کتب احادیث جو شرق و غرب میں دائر و سائر ہیں۔ آئمہ اہلبیتؑ کے استدلالات قرآنیہ سے بھرپور ہیں۔ اثباتِ توحید۔ عدل۔ قیامت۔ قبر حشر میزان۔ ثواب و عقاب اور جنت و نار وغیرہ میں قرآن مجید کی آیات سے ہی استدلال کیا گیا ہے۔ اسی طرح نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس اور جہاد وغیرہ تمام عبادات کے مسائل فرعیہ میں قرآنی آیات سے کافی استشہاد کیا گیا ہے اور علاوہ ازیں عقود۔ ایقاعات۔ حدود۔ تعزیرات اور فرائض وغیرہ حتیٰ کہ تمام ابواب فقہیہ کے فرعی احکام میں استدلالاتِ قرآنیہ ہی پیش پیش ہیں۔ علم اصول فقہ میں شیعہ کے نزدیک قرآن مجید موضوع علم میں پہلی اصل بلکہ اصل اصول ہے کیونکہ جملہ ابواب اصولیہ میں اصولی نکات پر اثباتی ابحاث قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں ہی ہوا کرتی ہیں غرضیکہ

تمام علوم مذہب حقہ اثنا عشریہ قرآن مجید سے ہی مستفاد ہیں اور یہی تمام علوم کی بنیاد ہے علمائے امامیہ قدس اللہ اسرارہم نے علوم قرآنیہ کی اشاعت و ترویج کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں اور اب تک یہی سلسلہ جاری ہے اور رہے گا قرآن مجید کے فیض کو عام کرنے کے لئے علمائے اعلام نے بڑے مصائب برداشت کئے قید و بند کی تکالیف جھیلیں۔ اور جلاوطنی کے دل پر تیر سہے جام شہادت ہنس ہنس کر نوش کیا۔ بایں ہمہ جب تک بدن میں جان باقی رہی۔ علوم قرآنیہ کی خدمات سے کنارا نہ کیا۔

شیعہ عوام کا کردار

تمام ممالک اسلامیہ میں جس جس مقام پر کم یا بیش شیعہ آبادی موجود ہے۔ ان کے گھروں میں قرآن، مساجد میں قرآن، امام باڑوں میں قرآن موجود ہے مقام گریہ و بکا میں **عزاداری** کا منظر ملاحظہ فرمائیے۔ اطراف عالم میں جہاں شیعہ لوگ عزائے آل محمدؐ کی صف بچھاتے ہیں اور شبیہہ وغیرہ بناتے ہیں۔ شبیہہ روضہ مبارکہ و ذوالجناح و جھولا برآمد کرتے ہیں شبیہہ روضہ کے اندر قرآن مجید۔ ذوالجناح کے ساتھ قرآن اور جھولے کے اندر قرآن ہوتا ہے

اگر تعصب کی عینک اتار کر منصفانہ نگاہ ڈالی جائے اور شبیہہ تعزیہ کا تجزیہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ گنبد نما ایک محل کا نمونہ (جس کو قیمتی پارچات یا خوبصورت کاغذات یا رنگدار لکڑیوں کے قطعات سے مزین کیا جاتا ہے) ہوتا ہے گویا وہ تاجدار مملکت امامت شہسوار عرصۂ شجاعت اور سرکار شہادت کے عصمت کدہ شاہی ایوان کا خالی ڈھانچہ ہوا کرتا ہے جس کے اندر غلافوں میں ملفوف یا بلا غلاف متعدد قرآن مجید رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ شیعہ لوگ اس کو اپنے سروں پر اٹھا کر چودہ سو برس سے ماتمی لباس میں ماتمی عنوان سے ماتمی جلوسوں میں ہزاروں کی تعداد میں سرننگے یا برہنہ نوحہ کناں سینہ زناں بازاروں میں چلتے ہوئے چوکوں میں کھڑے ہو کر غرضیکہ منظر عام پر چلا چلا کر ٹلا ٹلا کر رو رو کر پیٹ پیٹ کر تمام اقوام عالم کے گوش گذار کرتے ہیں کہ دیکھو ہمارے رسولؐ نے اس ایوان امامت میں (جس کی شبیہہ کو ہم اٹھائے ہوئے ہیں) ہماری ہدایت اور نجات کے لئے دو گرانقدر چیزیں چھوڑی تھیں۔ ایک قرآن اور دوسری اہلبیت۔ لیکن افسوس کہ نااہل امت نے اس ایوان خلافت کو لوٹ لیا۔ گھروں کو آگ لگا دی گھر والوں کو جلا وطن کر دیا۔ ان کے حقوق چھین لئے اور ان کے ناحق خون کو پانی کی طرح بہایا۔ بس اب ان محلات میں صرف قرآن باقی ہے۔

اسی طرح ہمارے سامنے گھوڑا ہے اس کی زین کے اوپر بھی قرآن ہی ہے قرآن والے کو بے وفا امت نے نشانۂ جور ظلم بنا کر آتار لیا اور ہمارے پاس صرف قرآن مجید ہی باقی رہ گیا اور امت نے چھوٹے بچوں کو شہید کر دیا۔ لہٰذا ان کے جھولے میں بھی صرف قرآن ہی موجود ہے۔

پس ہم ان مواقع پر چار کام اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

۱۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ان خالی ایوانوں کی عزت کریں، جن کی یہ شبیہیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

۲۔ ہمارا فریضہ ہے کہ قرآن مجید کی عظمت کو باقی رکھیں اور اس کی حفاظت کے لئے مخالف طاقت کے سامنے بجائے جھکنے کے اپنے خون کا آخری قطرہ بہادیں جس طرح کہ ہمارے پیشواؤں نے ہمیں عملی درس دیا ہے ماتم کرکے اپنے پورے جسم کو اپنے خون سے رنگین کرکے کربلا والوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہم دنیا والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ناموسِ قرآن کے لئے اپنے آئمہ کے نقشِ قدم پر ہمارے خون کا آخری قطرہ حاضر ہے اور یہ وہی قرآن ہے جس کو اہلبیت اپنے خالی ایوانوں میں چھوڑ کر گئے۔

۳۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ایوانِ امامت کے خالی ہو جانے کا بلکہ اس کے اجڑ جانے کا جب تک جئیں غم کریں اور اہلبیت کی یاد کو تازہ رکھتے ہوئے ان لوگوں سے اعتقادی اور عملی اور لسانی اور ہر طریق سے بیزاری اختیار کریں۔ جنہوں نے قرآن والوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھا کر اُن کے محلات کو ویران کر دیا۔

۴۔ ہمارا فریضہ ہے کہ اللہ سے بصد عجز و انکساری دعا مانگیں اور کہیں اے اللہ! ہمارے سامنے ایوانِ امامت میں صرف قرآن باقی ہے۔ قرآن والوں سے یہ ایوان خالی کرا دیا گیا ہے (جس کی تشبیہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے) پس تو اپنے فضل و کرم سے اس ایوان شاہی کے ساکن تاجدار منصب خلافت حضرت قائم آلِ محمدؑ کے ظہور میں تعجیل فرما تاکہ یہ ایوان اجڑ جانے کے بعد دوبارہ آباد ہو اور اسی ایوان میں قرآن کے ساتھ ہم قرآن والوں کو دیکھیں اور فیض حاصل کریں آمین۔

ذاکرین و واعظین کا طرزِ بیان مجالس فضائل و عزا میں یہی ہوتا ہے کہ عنوان مجلس آیات قرآنیہ کو قرار دے کر بیان کو شروع کیا جاتا ہے۔ فضائل آلِ محمد کا اثباتی بیان عموماً استدلالات قرآنیہ سے ہوتا ہے بلکہ چھوٹی مجلسوں سے لے کر بڑے جلسوں تک ابتداء تلاوتِ قرآن سے کرنا شیعانِ آلِ محمدؑ کا بالعموم شیوہ ہے۔

یہ اہتمام صرف زندگی کے لمحات تک نہیں بلکہ مرنے والے کے پاس قرآن خوانی سنت، اس کی موت واقع ہو جانے کے بعد اس کے پاس قرآن پڑھنا مستحب اس کے کفن کے قطعات پر قرآن لکھنا مستحب۔ گویا ہمیشہ قرآن شیعہ کے ساتھ اور شیعہ قرآن کے ساتھ ہیں۔

اور گذشتہ تمام مفصل بیان شیعہ کے اس دعویٰ کا مؤید و مصدق ہے کہ جملہ اسلامی فرقوں میں سے قرآن کے ساتھ صرف مذہب شیعہ والے ہی صحیح تمسک رکھتے ہیں اور حقیقۃً قرآن صرف انہی کے پاس ہے اور قرآن پر انہی کا ایمان ہے ان کے مذہب کا دارومدار بھی قرآن ہے اور موت و حیات میں ان کا سہارا بھی قرآن ہی ہے۔

لیکن متواتر حدیث ثقلین اور دیگر تصریحات نبویہ کے پیشِ نظر شیعہ قرآن مجید کی تفسیر و تاویل میں صرف آلِ محمد کی ہی فرمائشات پر اعتماد رکھتے ہیں اور کسی بڑے سے بڑے آدمی کے قول و عمل کو قطعاً درخورِ اعتناء نہیں قرار دیتے جو آئمہ آلِ محمدؑ کی تعلیمات سے بے بہرہ ہو۔

بہتانِ عظیم

جو لوگ صرف قرآن مجید کو کافی سمجھتے ہیں اور آلِ محمدؑ سے صرف دُور ہی نہیں بلکہ آلِ محمدؑ کی تعلیمات کو بالکل مٹانے

کے درپے ہیں۔ جس طرح کہ خود آلِ محمدؐ کو مٹانے میں انہوں نے کوئی کسر باقی اٹھا نہیں رکھی تھی۔ وہ سادہ لوح عوام میں بڑے زور و شور سے یہ منحوس پروپیگنڈہ کرتے پھرتے ہیں۔ کہ شیعوں کا قرآن مجید پہ ایمان ہی نہیں تاکہ عوام نہ ان کی سُنیں اور نہ آئمہ اہلبیتؑ کے کمالاتِ علمیہ سے مطلع ہوں اور نہ جناب رسالتمآبؐ کی فرمائش اِنِّی تَارِكٌ فِیكُمُ الثَّقلَین ان کے کانوں تک پہنچے۔ ورنہ کون اتنا نادان ہے کہ حق کو دیکھ کر اس سے کنارہ کرے؟ یا اہل بیت کے کمالات پہ اطلاع پاکر کسی غیر کو ان پر ترجیح دے؟

اور اسی بناء پر شیعہ مجالس میں جانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ کتابوں میں، اخباروں میں رسالوں میں اشتہاروں میں اور تقریروں میں فتاویٰ صادر کئے جاتے ہیں کہ شیعہ کی مجلس میں جانا گناہ۔ ان کے ساتھ برتاؤ کرنا حرام حتیٰ کہ ان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون ممنوع۔ مجلس میں آنے والوں پر فسخ نکاح کا فتویٰ یا تعزیرِ شرعی کا حکم بھی صادر ہوتا ہے اگر کسی شہر میں شیعہ بہت کمزور ہوں تو بہت سے مقامات پر ان کے لئے پانی جیسی عام نعمتِ الٰہیہ کا استعمال ممنوع بلکہ جملہ ضروریات زندگی سے ان کو محروم کر دیا جاتا ہے۔

اگر وجہ دریافت کی جائے کہ شیعوں کا قرآن پر کیسے ایمان نہیں؟ حالانکہ ان کے مذہب کا دارومدار ہی قرآن پر ہے ان کی تفاسیر قرآن دوسرے اسلامی فرقوں کی بہ نسبت زیادہ ان کی احادیث میں قرآن۔ ان کی فقہ و اصول میں استدلالِ قرآن، ان کی مساجد میں قرآن، امام باڑوں میں قرآن، شبیہہ تعزیہ میں قرآن، گھروں میں قرآن، درسوں میں قرآن حتیٰ کہ ان کے کفنوں پر قرآن۔ غرضیکہ ان کی شرعی زندگی کا کوئی گوشہ قرآن سے خالی نہیں؟

تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ شیعہ لوگ خلافتِ اجماعیہ کے انکاری ہیں اور "معاذ اللہ" صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں اس لئے ان کا قرآن سے کوئی واسطہ نہیں اور ان کی مجالس میں سب صحابہ ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا ان میں شرکت کرنا بدعت حرام اور موجب فسخ نکاح ہے۔

ہاں ہاں! شیعہ کے نزدیک خلافت کا معیار ہنگامہ آرائی نہیں۔ بلکہ نصِ خدائی ہے۔ جس کی مفصل بحث عنوان "ثقلین" کے تحت میں ص۸۵ سے ص۹۵ تک پیش کی جا چکی ہے۔

باقی رہا سبِ صحابہ کا افتراء۔ تو اس کے متعلق شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ صحابہؓ تو بجائے خود کسی ادنیٰ ترین انسان خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو، کو سب کرنا اور گالی دینا ناجائز اور فعل حرام ہے اور آئمہ اہلبیتؑ کی تعلیمات اور ان کی سیرت کے قطعاً خلاف ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آلِ رسولؐ کا ہم پلہ صحابہ تو درکنار آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک انبیاء کو بھی ہم نہیں سمجھتے جس کی بحث معجزنما کے عنوان کے تحت میں اور بعض دیگر مقامات پر مختصراً گذر چکی ہے اور آئندہ اپنے مقام پر تفصیل سے بھی مذکور ہوگی پس جو صحابہ کرامؓ تعلیمات رسالتمآبؐ کے پیشِ نظر ثقلین یعنی قرآن اور اہلبیت سے متمسک رہے ہم ان کے غلام ہیں۔ اور جن لوگوں نے آلِ محمدؐ کو چھوڑ دیا۔ ہم ان سے بے زار ہیں۔ ہمارا ایمان قرآن پر ہے۔ اور آلِ محمدؐ کے علاوہ قرآنی علوم نہ کسی سے حاصل

ہو سکتے ہیں اور نہ ہمیں کسی اور سے رابطہ و واسطہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔
ہمارا ایمان ہے کہ چونکہ بفرمان رسولؐ قرآن و اہلبیت ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ لہٰذا دونوں سے تمسک پکڑنا ہی دین اسلام ہے۔ جس کا قرآن پر ایمان نہیں اس کا اہلبیت سے واسطہ نہیں اور جس کا اہلبیتؑ سے واسطہ نہیں اس کا قرآن پر ایمان نہیں۔
پس شیعہ کا قرآن اور اہلبیت ہر دو پر ایمان ہے اور ہر دو سے تمسک ہے لہٰذا درحقیقت تمام اسلامی فرقوں میں سے قرآن پر صرف مذہب شیعہ ہی کا ایمان ہے جو لوگ یہ کہیں کہ شیعہ قرآن کو نہیں مانتے وہ صرف عوام کو ہی نہیں۔ بلکہ خدا و رسولؐ کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ اور فریب کاری اور افتراء پردازی اور بہتان عظیم سے اپنی عاقبت کو خراب کرتے ہیں۔

تاویل قرآن اور عباداتِ ظاہریہ

چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ہر شخص معصومینؑ کی ہر فرمائش کی تاب برداشت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے بعض لوگ مختلف قسم کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کا صحیح حل معلوم نہ ہو سکنے پر غلط عقائد ان کے دلوں میں راسخ ہو جاتے ہیں

فی الکافی عن جابر قال قال ابوجعفرؑ قال رسول اللہؐ اِنَّ حَدِیْثَ آلِ مُحَمَّدٍ صَعْبٌ مُسْتَصْعَبٌ لَا یُؤْمِنُ بِهٖ اِلَّا مَلَكٌ مُقَرَّبٌ اَوْ نَبِیٌّ مُرْسَلٌ اَوْ عَبْدٌ اِمْتَحَنَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ لِلْاِیْمَانِ فَمَا وَرَدَ عَلَیْكُمْ مِنْ حَدِیْثِ اٰلِ مُحَمَّدٍ فَلَانَتْ لَهٗ قُلُوْبُكُمْ وَعَرَفْتُمُوْهُ فَاقْبَلُوْهُ وَاِنِ اشْمَاَزَّتْ مِنْهُ قُلُوْبُكُمْ وَاَنْكَرْتُمُوْهُ فَرُدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلَی الْعَالِمِ مِنْ آلِ محمد وَاِنَّمَا الْهَالِكُ اَنْ یُّحَدَّثَ اَحَدُكُمْ بِشَیْءٍ مِنْهُ لَا یَحْتَمِلُهٗ فَیَقُوْلُ وَاللّٰهِ مَا كَانَ هٰذَا وَاللّٰهِ مَا كَانَ هٰذَا۔

کافی میں جابر سے مروی ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا۔ تحقیق آل محمدؐ کی حدیث مشکل اور گراں تر ہے اس کو نہیں تسلیم کرتا مگر مقرب فرشتہ یا نبی المرسل یا وہ عبد جس کا دل خدا نے امتحان کی کسوٹی پر پرکھ لیا ہو۔ پس آل محمدؐ کی جو حدیث تم پر وارد ہو اگر تمہارے دل اس کے لئے نرم ہو جائیں اور تم اس کو پہچان لو تو قبول کر لو اور جس کو سن کر تمہارے دل اچاٹ ہو جائیں اور تم اسے اجنبی جانو تو اس (کے علم) کو اللہ اور رسولؐ اور آل محمدؐ کے عالم کی طرف رد کر دو۔ اور وہ شخص برباد ہو گیا جس کو آل محمدؐ کی ایک حدیث سنائی گئی جو اس کی برداشت سے باہر تھی تو کہنے لگ جائے کہ خدا کی قسم ایسا نہیں خدا کی قسم ایسا نہیں۔

وفیه عن ابی عبداللہؑ قال اِنَّ حَدِیْثَنَا صَعْبٌ مُسْتَصْعَبٌ لَا یُؤْمِنُ بِهٖ اِلَّا صُدُوْرٌ مُنِیْرَةٌ

نیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہماری حدیث مشکل اور گراں تر ہے۔ صرف نورانی سینے صاف

اَوْقُلُوْبٌ سَلِيْمَةٌ اَوْ اَخْلَاقٌ حَسَنَةٌ (الحدیث) دل اور نیک طبیعتیں ہی اس کو برداشت کر سکتی ہیں۔

اس مضمون کی بہت زیادہ احادیث کتب اخبار میں اہلبیت عصمت سے وارد ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جب آئمہ طاہرین نے بعض مقامات، پر قرآن مجید کی بعض تاویلات کا ذکر فرمایا تو مطلب کی تہہ تک نہ پہنچ سکنے والوں نے غلط نظریے قائم کر لئے اور دین سے دُور ہو گئے۔

عن علی فی حدیث له اِنَّ ثُلُثَي الْقُرْآنِ فِيْنَا وَفِيْ شِيْعَتِنَا فَمَا كَانَ فِيْ خَيْرٍ فَلَنَا وَلِشِيْعَتِنَا وَالثُّلُثُ الْبَاقِيْ اَشْرَكْنَا فِيْهِ النَّاسَ فَمَا كَانَ مِنْ شَيْءٍ فَلِعَدُوِّنَا الخبر

حضرت امیرالمومنینؑ سے ایک روایت میں وارد ہے کہ قرآن کا دو تہائی حصہ ہمارے اور ہمارے شیعوں کے حق میں ہے پس جہاں ذکر خیر ہے وہ ہمارے اور ہمارے شیعوں کے لئے ہے اور باقی تہائی میں اور لوگ ہمارے ساتھ شریک ہیں پس جو بھی ذکر شر ہے وہ ہمارے دشمنوں کے لئے ہے۔

اس مضمون کی بہت سی حدیثیں مع وجہ تطبیق ص۱۰۵ سے ص۱۱۲ تک بیان کی جا چکی ہیں۔

ان کو پڑھ سن کر بعض لوگ اس نظریہ پر پہنچے کہ عبادات کے جملہ الفاظ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ تاویل اور باطن کے اعتبار سے چونکہ ان سے مراد حضرات آئمہ اہلبیت ہیں اور بخلاف اس کے جملہ شرور و محرمات سے باطنی طور پر مراد دشمنان خدا اور رسولؐ و آئمہ ہیں تو پس نتیجہ یہ ہُوا کہ تمام عبادات کا خلاصہ ولایت آل محمدؐ کا اقرار ہے اور تمام معاصی و محرمات کا نچوڑ ان کے دُشمنوں سے بیزاری حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا ولائے آل محمدؐ حاصل ہو جانے کے بعد نماز روزہ وغیرہ جملہ عبادات ظاہریہ کی کوئی ضرورت نہیں اور دشمنانِ آل محمدؐ سے بیزار ہو جانے کے بعد چوری۔ زنا۔ شراب وغیرہ ہر قسم کی ظاہری بدکاریوں سے بچنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔

ایمان کے ساتھ عمل ضروری ہے

اس عقیدہ فاسدہ کے لوگ حضرات آئمہ طاہرین علیہ السلام کے زمانہ میں تھے اور رفتہ رفتہ یہ عقیدہ مستقبل میں سرایت کرتا ہُوا چلا آیا۔

چنانچہ دورِ حاضر میں متعدد مقامات پر اس قسم کے عقائد کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جو صرف آل محمد کی محبت اور ان کے دشمنوں سے بیزاری کو خدا کی خوشنودی و رضامندی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا نہ عباداتِ ظاہریہ کی بجا آوری کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ اعمال فاسدہ سے اجتناب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ انہی عقائد کے لوگوں کے متعلق آئمہ اطہارؑ کے بعض صحابہ نے آئمہ طاہرینؑ سے سوال کیا اور انہوں نے ان عقائد باطلہ کی پر زور تردید فرمائی۔ چنانچہ مقدمہ تفسیر مراۃ الانوار میں بصائر الدرجات سے بروایت مفضل بن عمر منقول ہے جس کا اختصار کے طور پر مرادی ترجمہ یہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے مفضل کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا۔ امابعد میں تجھے اللہ کے تقویٰ۔ اطاعت و پرہیزگاری، تواضع اجتہاد فرماں برداری۔ اس کے پیغمبروں سے حسن عقیدت، امور خیر میں سبقت اور خدا کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کی وصیت کرتا ہوں۔ تیرا خط پہنچا۔ میں نے اس کا مضمون سمجھا۔ تیری خیر و سلامتی پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ تو نے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ میں

ان کو جانتا ہوں۔ تجھے معلوم ہوا کہ وہ کہتے ہیں کہ دین معرفت ہی کا نام ہے اور معرفت حاصل ہو جانے کے بعد انسان کا جو جی چاہے کرتا پھرے۔ تو نے اپنے متعلق ذکر کیا ہے کہ میں بھی دین کی اصل معرفت ہی کو جانتا ہوں۔ خدا تجھے موفق کرے۔ تو نے ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وعمرہ، مسجد الحرام، بیت الحرام اور شہر الحرام سے مراد معرفت امام لیتے ہیں۔ اسی طرح طہر اور غسل وغیرہ سے مراد بھی معرفت امام لیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ تمام فرائض معرفت، (رجل) امام ہی ہے اور جو شخص ان کی معرفت رکھتا ہو اسے وہ کافی ہے۔ لہٰذا عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اس کی نماز بھی ہو گئی اور روزہ، حج، غسل، تعظیم حرمات اللہ اور تعظیم شہر الحرام وغیرہ سب اعمال اس کے ہو گئے گویا معرفت کے بعد یہ سب عبادات اس کی ہو گئیں اور نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام فواحش، مثلاً شراب، جُوا، سود اور قتل وغیرہ سب (معرفت) رجل (دشمن اہلبیت) کا نام ہے۔ پس جس نے ان سے نفرت کی تو اس نے گویا تمام برائیوں سے اجتناب کر لیا۔ ظاہری پرہیز کی کوئی ضرورت نہیں اس کے بعد تو نے سوال کیا ہے کہ آیا یہ باتیں درست ہیں یا غلط؟

لہٰذا اب میں تیرے لئے وضاحت سے بیان کرتا ہوں تاکہ تجھ پر کوئی اشتباہ نہ رہ جائے اور تو تاریکی میں نہ پڑا رہے اور تیرے لئے حلال و حرام کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہوں اور تجھے پہنچواتا ہوں تاکہ تو پہچان لے۔ اور انکار نہ کرے وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ میں تجھے متنبہ کرتا ہوں کہ جو شخص ایسا دین اختیار کرے جس طرح تو نے ذکر کیا ہے وہ میرے نزدیک مشرک باللہ ہے اس کے مشرک ہونے میں ذرّہ بھر شک نہیں۔ میں تجھے آگاہ کرتا ہوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک بات سُن لی اور اس کے اہل سے اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور اپنے من مانے قیاسات سے اس کی حدود مقرر کر دیں اور چیزوں کو جن حدوں پہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اُن حدوں پر نہ رکھا پس یہ چیز اللہ اور اس کے رسولؐ پر افترا ہے اور جھوٹ ہے نیز نافرمانی پر جرأت اور انتہائی درجہ کی جہالت ہے اگر وہ لوگ چیزوں کو اپنی مقررہ حدوں پر رکھتے اور قبول کر لیتے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن ان لوگوں نے تحریف کی اور حدود سے تجاوز کیا۔ لہٰذا انہوں نے غلط کیا اور خدا کے اوامر و نواہی کی توہین کی۔ میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ خدا نے اشیاء کی حدود اس لئے مقرر فرمائی ہیں۔ کہ ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔

پھر میں تجھے حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں کہ خدا نے اپنے دین اسلام کو پسند فرمایا۔ لہٰذا کسی شخص کا کوئی عمل بغیر اس دین کے قابل قبول نہیں۔ اسی دین کے لئے انبیاء و رسل بھیجے اور فرمایا کہ میں نے اس کو حق کے ساتھ بھیجا اور وہ حق کے ساتھ اترا۔ پس اف[illegible] دین رسولوں کی معرفت ہے اور ان سے ولایت اور ان کی اطاعت حلال ہے۔ پس وہی چیز حلال ہے جس کو وہ حلال کہیں اور وہی چیز حرام ہے جس کو وہ حرام کہیں۔

وہ دین کی اصل ہیں اور ان سے فروعات حلال نکلتی ہیں جو ان سے متشعب ہوتی ہیں اور ان کی شاخوں میں سے ہے ان کا اپنے شیعوں اور موالیوں کو حلال کا حکم دینا یعنی نماز، روزہ، حج، عمرہ اور تعظیم حرمات اللہ وغیرہ حتیٰ کہ

سب نیکیوں کے اعمال چنانچہ ارشاد فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔

تحقیق خدا انصاف، احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بدکاری، برائی اور سرکشی سے منع فرماتا ہے اور تمہیں نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

پس ان انبیاء کے دشمن حرام محرم ہیں اور ان کے دوست احباب وغیرہ بھی ان ہی کے حکم میں ہیں۔ پس وہی ظاہری و باطنی بدکاریاں ہیں۔ شراب، جوا، زنا وغیرہ سب وہی لوگ ہیں یعنی انبیاء کے دشمن حرام کی اصل ہیں اور وہی شر اور شر کی اصل ہیں۔ باقی تمام بدکاریاں اسی اصل کی شاخیں ہیں اور انبیاء کی تکذیب ان کے ادعیاء کا انکار فواحش کا ارتکاب اور تمام محرمات کی بجاآوری وغیرہ انہی کے فروعات ہیں جنہیں ۔ لہٰذا ان لوگوں کی اطاعت و محبت سے منع کیا گیا ہے۔

اب اگر میں کہہ دوں کہ بدکاری، شراب، جوا، زنا، میتہ اور خنزیر وغیرہ سب معرفت دجال (دشمن دین) کا نام ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ شخص دشمن دین ہونے کی حیثیت سے تمام حرام افعال کی اصل ہے اور مذکورہ بدکاریاں اور برائیاں سب اس کی شاخیں ہیں تو ایک اعتبار سے درست اور بجا ہے کیوں کہ خدا نے جس طرح اصل کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح اس کی فروعات بھی حرام کی ہیں اور اس کی ولایت بھی حرام اور ناجائز کی ہے۔ پس بجا ہے اگر میں کہہ دوں کہ ان تمام برائیوں سے مراد فلاں شخص ہے۔

پھر تجھے یہ بھی بتا دوں کہ دین اور دین کی اصل بھی ایک شخص کی معرفت ہے (یعنی امام امت اور امام زمان) جس نے اس کو پہچانا اس نے اللہ کو پہچانا اور اس کے دین کو پہچانا اور جس نے اس کو نہ پہچانا اس نے اللہ کو اور اس کے دین کو نہ پہچانا۔ پس اس کا جاہل اللہ کا اور اس کے دین کا جاہل ہے کیونکہ انسان اللہ کو اور اس کے دین کو اور حدود و احکام شرعیہ کو امام کی معرفت کے بغیر جان سکتا ہی نہیں اور یہ مقولہ کہ اللہ کا دین معرفت رجال کا نام ہے اس کا یہی مطلب ہے یہاں تک کہ آپ نے فرمایا اگر میں کہہ دوں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج و عمرہ وغیرہ حتیٰ کہ تمام اعمال صالحہ اور امور خیر اور جملہ فرائض سے مراد نبی علیہ السلام ہیں جو ان چیزوں کے لانے والے ہیں تو بالکل درست ہے کیونکہ آنجناب ہی ان تمام فروع کی اصل تھے اگر وہ نہ ہوتے تو یہ چیزیں کون جانتا اور سمجھاتا؟ پس وہ ہی اصل ہیں ان تمام امور خیر اور اعمال صالحہ کی اور سب اعمال صالحہ ہی ان کی فرعیں ہیں۔ پس بنا بریں تمام فروعات کو اگر اپنی اصل کے نام سے پکارا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ بالجملہ یہ ثابت ہو گیا کہ دین خدا اس کی اصل معرفت ہی کا نام ہے کیونکہ اگر وہ نہ ہوتی تو یہ ہرگز نہ پہچانے جاتے لہٰذا ان کا عارف دین کا عارف ہے اور ان کا جاہل دین خدا کا جاہل ہے۔ چونکہ دین خدا انہی انسانوں کے ذریعہ سے پہنچا ہے تو یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے کہ تمام فرائض و احکام شریعت شخصی معرفت کا نام ہے اور وہ معرفت امام ہے

من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ

لیکن وہ جو آپ نے ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ صرف معرفت ہی کو کافی جانتے ہیں اور اعمال کی ضرورت محسوس نہیں کرتے وہ بہر اعتبار غلطی پر ہیں کیونکہ فروعات کو چھوڑ دینے کے بعد اصل سے تمسک پکڑنے کا دعویٰ بالکل بے فائدہ ہے جس طرح لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اس کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ زبان پر جاری نہ کرے (کیونکہ توحید جب اصل ہے اور نبوت فرع ہے اور اصل کا اقرار بغیر اس کی فرع کے اقرار کے لغو اور بے فائدہ ہے) بس اسی طرح حضرت رسالتمآبؐ سے تمسک کرکے باقی فروعات اور اعمال صالحہ سے دست برداری اسی معنی میں ہے یعنی معرفت رجال باطن ہے اور اعمال صالحہ اس کا ظاہر ہیں اور ظاہر کو ترک کرکے باطن سے تمسک پکڑنا بالکل بے فائدہ ہے اور لغو ہے معرفت امام اصل اور جملہ عبادات فرع پایہ کہ معرفت امام باطن اور جملہ عبادات اس کا ظاہر ہیں پس فرع اور ظاہر کے بغیر اصل اور باطن سے تمسک کرنا سراسر غلط بلکہ شرک ہے

اور دشمن نبی اور دشمن امام تمام برائیوں کی اصل ہے اور تمام برائیاں اس کی فرع ہیں تو جو شخص اصل سے نفرت کرتا ہو اور برائیوں سے نفرت نہ کرے جو اس کی فروعات ہیں اور اسی اصل کی پیداوار ہیں تو وہ بالکل جھوٹا ہے کیونکہ دشمن امام سے نفرت اور بیزاری کرنا اصل اور باطن ہے اور تمام برائیوں سے نفرت کرنا اس کی فرع اور ظاہر ہے اور اصل کی پہچان فرع سے اور باطن کی پہچان ظاہر سے ہی ہوا کرتی ہے

ہاں یہ جملہ کہ معرفت حاصل کرلو اور جو جی چاہے کرو درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ امام کی معرفت حاصل کرلینے کے بعد جتنی نیکی کرو مقبول ہے خواہ کم ہو یا زیادہ اور بغیر معرفت کے کوئی نیکی نیکی ہی نہیں۔ الخبر

ع زاہد تیری نماز کو میرا سلام ہے ۔۔۔۔ بے حب اہلبیت عبادت حرام ہے

جامع قرآن کا حقیقی مفہوم و مصداق

جامع قرآن کے دو مطلب ہو سکتے ہیں

(۱) ظاہری اوراق و اجزاء کا اکٹھا کرنے والا

(۲) پورے مطالب قرآنیہ کو جاننے سمجھنے والا یعنی علوم قرآنیہ کا جامع

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ دونوں متذکرہ بالا معنوں میں قطعاً کوئی تلازم نہیں ہے کیونکہ جو ظاہری اوراق کا جامع ہو ضروری نہیں کہ وہ اس کے مطالب کا عالم بھی ہو یا جو اس کا عالم ہو ضروری نہیں کہ وہ اس کا جامع اوراق بھی ہو۔ صاحبان مطابع ہزاروں کتابیں شائع کرا دیا کرتے ہیں لیکن سوائے شاذ و نادر کے اکثر مطبوعہ کتب کے مطالب نہیں جان

سکتے۔ بلکہ مالک مطبع اگر ان پڑھ ہو تو تمام مطبوعات کے مندرجات سے براہِ راست قاصر الفہم ہوتا ہے۔ اسی طرح کاتب متفرق اور مختلف قسم کے مسودات کو خوشخط یکجا لکھ کر بہت علمی خدمات انجام دیتے ہیں لیکن وہ بھی عموماً لفظی جمع ہی کو جانتے ہیں۔

قرآن مجید کو جمع کرنے والے یعنی اجزاء و اوراق کو یکجا کرکے کتاب کی شکل میں لانے والے نے اللہ کی خوشنودی کے لئے اگر یہ کام کیا تو اس کو اللہ کی جانب سے بڑا اجر ملے گا کیونکہ جب تک اس کی خدمت کے آثار دنیا میں رہیں گے قرآن پڑھا جاتا رہے گا۔ اس پر عمل ہوگا تو اس کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ بلکہ اس کا یہ عمل اس کے نامۂ اعمال میں سب سے بڑی نیکی ہے کیونکہ یہ اسلام کا سرمایۂ حیات ہے اور شریعت کی اصل و اساس ہے اور یہ نہ صرف صدقۂ جاریہ ہے بلکہ دنیا بھر کے تمام امورِ خیر کا تاقیامت منبع ہے۔

اور اگر جمع کرنے والے نے رضائے خدا ملحوظ نہ رکھی ہو بلکہ محض ناموری یا اغراض دنیاوی ہی ملحوظ خاطر ہوں تاہم قیامت تک آنے والے مسلمانوں پر ناشر قرآن ہونے کی حیثیت سے اس کا احسان عظیم ہے عامۃ المسلمین کو ہر دو صورتوں میں اس کا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے ہمیں اس بحث میں دُور تک جانے کی ضرورت ہی نہیں اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ بلکہ قابل غور امر تو یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے یا اس پر عمل کرنے کے لئے بھی ہمیں آیا۔ جامع قرآن کے دروازہ پر جبہ سائی کی ضرورت ہے عام کتب میں تو یہ صورت ہوا کرتی ہے کہ کتاب حاصل کرنے کیلئے تو مطبع یا کاتب یا جامع کتب کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن کتاب فہمی کے لئے ان سے ربط قائم کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس غرض کی تکمیل کے لئے کتاب کے عالم و معلم کے ساتھ تعلقات قائم کرنا لازمی ہوا کرتا ہے بلکہ کتاب حاصل کرنے سے پہلے اس بات کا خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو پڑھائے گا کون؟ نیز کاتب و ناشر کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نہ سہی کوئی اور مل جائے گا لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کتاب دان نہ سہی تو اور کوئی طریقہ نکل آئے گا۔

پس اس مقام پر بھی ہم کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری اور فرض عینی ہے۔ لہٰذا اس کا حاصل کرنا بھی لازمی امر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے سیکھنے اور سمجھنے کے لئے اس کے عالمین اور معلمین سے تمسک پکڑنا اور پھر ان کے دروازہ پر دستک دینا بھی ضروری ہے۔

اگر جامع قرآن عالم قرآن بھی ہو تو دونوں مطلب ایک ہی جگہ سے پورے ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ ان ہر دو معنوں میں کوئی تلازم نہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ جس کو جامع اجزاء قرآن مانا جائے اس کو عالم قرآن بھی تسلیم کیا جائے پس ناشر قرآن ہونے کی وجہ سے اس کی احتیاج ہے لیکن نہ اس کا عالم ہونا ضروری ہے اور نہ اس کو عالم جاننا اور نہ اس کے واجب الاطاعت ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ کتاب کے کاتب ناشر جلد ساز یا کتب فروش وغیرہ کو عالم یا معلم کتاب تسلیم کرنا کوئی ضروری نہیں ہوا کرتا۔

قرآن پر ایمان لانا اور بات ہے اور اس کے جامع کو عالم ماننا یا تاجدارِ رسالتؐ کا صحیح قائمقام اس کو تسلیم کرنا اور بات ہے۔ لہٰذا یہ کہنا قطعاً بے جا اور خلافِ اصول ہے کہ جو جامع قرآن کی خلافت پر ایمان نہ لائے اس کا قرآن پر ایمان نہیں بلکہ علم قرآن یا خلافت تو درکنار اگر منصفانہ طور پر غور کیا جائے تو جمع قرآن اور اسلام میں بھی کوئی تلازم نہیں۔ بہت سے غیر مسلم بھی ناشر قرآن ہوا کرتے ہیں جس طرح کہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ ہاں تمسک کے لئے قرآن اور عالم قرآن میں تلازم ضروری ہے ان دونوں میں قطعاً افتراق محال ہے اگر قرآن کی ضرورت ہے تو عالم قرآن کی ضرورت بھی ساتھ ساتھ ہے اگر قرآن کے ساتھ تمسک ضروری ہے تو اس کے عالم کے ساتھ تمسک بھی ضروری ہے۔ پس اگر جامع قرآن سے مراد عالم قرآن ہو تو اس لحاظ سے جس طرح قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اس کے جامع پر ایمان لانا بھی ضروری ہے اور یہ کہنا بجا ہے کہ جس کا جامع قرآن پر ایمان نہیں درحقیقت اس کا قرآن پر ایمان نہیں کیونکہ اس صورت میں ان دونوں میں لازم و ملزوم کی حیثیت ہے اور اس کے حقیقی مصداق سوائے اہلبیت عصمت کے کوئی بھی نہیں لہٰذا قرآن حاصل کرنے اور اس کے سیکھنے سمجھنے کے لئے ان ہی کے دروازہ پر دستک دینے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہے نہ وہ قرآن سے جُدا ہیں اور نہ قرآن ان سے جُدا ہے۔ گذشتہ فصول میں اس مطلب پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مزید توضیح کے لئے اس مقام پر بھی چند احادیث کا ذکر خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

عن ربیع الابرار للزمخشری - استاذن ابو ثابت مولیٰ علیؑ علیٰ ام سلمۃ رضی اللہ عنھا فقالت مرحبا بک یا ابا ثابت اَیْنَ طَارَ قَلْبُکَ حِیْنَ طَارَتِ الْقُلُوْبُ مَطَارَھَا ؟ قَالَ تَبِعَ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ قَالَتْ وُفِّقْتَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ یَقُوْلُ عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْقُرْآنِ وَالْحَقُّ وَ الْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ وَلَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ۔[1]

زمخشری کی ربیع الابرار میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ کے غلام ابو ثابت نے اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ سے اجازت لی اور اندر داخل ہوا پس (اُمّ سلمہ نے) کہا مرحبا تجھے اے ابو ثابت! بتا تیرا دل کہاں پرواز کر گیا تھا جبکہ لوگوں کے دل اِدھر اُدھر پرواز کر چکے تھے؟ ابو ثابت نے جواب دیا کہ (میرا دل) علیؑ بن ابی طالبؑ کے نقشِ قدم پر رہا تو (اُمّ سلمہؓ) نے کہا خدا تجھے موفق رکھے مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں نے رسول اللہؐ سے سُنا ہے فرماتے تھے علیؑ حق اور قرآن کے ساتھ ہے اور حق و قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس اکٹھے وارد ہوں گے۔

عن ام سلمۃؓ قال رسول اللہ علیٌّ مع القرآن والقرآن معہ لا یفترقان حتی یردا علیَّ[2]

ام سلمہ سے روایت ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے یہ دونوں آپس سے جُدا نہ ہونگے یہانتک کہ

---

[1] الغدیر ج طبع ۲ ص ۱۷۷ [2] الغدیر ج عن المستدرک والصواعق وتاریخ الخلفاء وغیرھا ف عن اسنی المطالب وغیرھا

الحوض — میرے پاس حوض کوثر پر اکٹھے پہنچیں گے

اس مضمون کی احادیث کتب فریقین میں تواتر سے وارد ہیں جن کا مطلب یہی ہے کہ قرآن اور علیؑ میں لازم و ملزوم کی سی حیثیت ہے بعض روایات میں قرآن و علیؑ کی لفظیں ہیں اور بعض میں حق و علیؑ کا ذکر ہے اور بعض میں قرآن و عترت اہلبیت کا تذکرہ ہے مطلب سب کا ایک ہے اور حدیث حدیث ثقلین کے نام سے زبان زد عام ہے۔

اس کی رُو سے علیؑ کا منکر قرآن کا منکر اور قرآن کا منکر علیؑ کا منکر ہے یا اہلبیت کا دشمن قرآن کا دشمن اور قرآن کا دشمن اہلبیت کا دشمن ہے اور یہی وجہ ہے کہ علیؑ کے ساتھ دشمنی رکھنا اور بغض و کینہ رکھنا نفاق ہے چنانچہ اکابر صحابہ نے خود اسکا اعتراف کیا ہے

۱۔ ابوذر غفاریؓ قَالَ كُنَّا نَعْرِفُ الْمُنَافِقِيْنَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ بِثَلَاثٍ بِتَكْذِيْبِهِمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالتَّخَلُّفِ عَنِ الصَّلٰوةِ وَبُغْضِهِمْ عَلِيَّ ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ

حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ عہد رسالت میں ہم منافقین کو تین چیزوں سے پہچان لیا کرتے ہیں ۱۔ خدا اور رسولؐ کی تکذیب ۲۔ نماز سے پیچھے رہ جانا ۳۔ علی بن ابی طالب کے ساتھ بغض رکھنا۔

۲۔ ابوسعید خدری قَالَ كُنَّا نَعْرِفُ الْمُنَافِقِيْنَ نَحْنُ مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ بِبُغْضِهِمْ عَلِيًّا۔

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ ہم گروہ انصار منافقین کو بغض علیؑ سے پہچان لیا کرتے تھے

۳۔ جابر بن عبداللہ انصاریؓ۔ قال ماکنا نعرف المنافقین الا ببغض او ببغضهم علی ابن ابی طالب (لفظه او لاختلاف الفاظ الروایة)

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ہم منافقین کو صرف حضرت علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کے بغض سے پہچان لیتے تھے۔

۴۔ ابوسعید محمد بن ہشیم۔ قال انا کنا نعرف المنافقین نحن معشر الانصار ببغضهم علی ابن ابیطالب

ابوسعید محمد بن ہشیم فرماتے ہیں کہ ہم گروہ انصار منافقین کو البتہ صرف حضرت علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کے بغض سے ہی پہچان لیتے ہیں

۵۔ ابودرداءؓ قال انا کنا نعرف المنافقین معشر الانصار ببغضهم علی بن ابیطالب

حضرت ابودرداؓ فرماتے ہیں کہ ہم گروہ انصار منافقین کو صرف علیؑ کے بغض سے پہچان لیا کرتے ہیں

۶۔ امّ سلمہؓ۔ قالت کان رسول الله یقول لا یحب علیا منافق ولا یبغضه مومن

حضرت امّ سلمہؓ فرماتی ہیں۔ کہ جناب رسالتمآبؐ فرمایا کرتے تھے کہ منافق علیؑ سے محبت نہ کرے گا اور مومن علیؑ سے بغض نہ کرے گا۔

۷۔ ابن عباسؓ۔ قال نظر رسول اللّٰہ الی علی فقال لا یحبك الا مومن ولا یبغضك الا

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسالتمآبؐ نے علیؑ کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ تیرے ساتھ نہ محبت کرے گا مگر مومن اور تیرے ساتھ نہ بغض رکھے گا

---

[۱] عن الترمذی وغیرہ [۲] عن الاستیعاب وغیرہ [۳] عن اسنی المطالب [۴] عن الترمذی [۵] عن الترمذی [۶] عن مجمع الزوائد

منافق — مگر منافق

۸۔ علیؑ بن ابی طالب لعهد النبی الامی الیّ انه لا یحبنی الا مومن ولا یبغضنی الا منافق — حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہما السلام فرماتے ہیں نبی امی کا مجھ سے عہد ہے کہ میرے ساتھ مومن ہی محبت رکھے گا اور صرف منافق ہی میرے ساتھ بغض رکھے گا۔

او لعهد النبی الیّ لا یحبک الا مومن ولا یبغضک الا منافق — جناب رسالتمآبؐ کا مجھ سے عہد ہے کہ (یا علیؑ) تیرے ساتھ مومن ہی محبت کرے گا اور تیرے ساتھ منافق ہی بغض رکھے گا۔

او یا علی لا یبغضک مومن ولا یحبک منافق — فرمایا یا علیؑ تیرے ساتھ مومن بغض نہ کرے گا اور منافق محبت نہ کرے گا۔

او ان الله عز وجل اخذ میثاق کل مومن علی حبی ومیثاق کل منافق علی بغضی (عن شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید) — روز میثاق سے مومن نے میری محبت کا اور منافق نے میرے بغض کا اللہ کے سامنے عہد کیا ہے۔

ان کے علاوہ حدیث غدیر جس کا متواتر ہونا مسلم ہے ایک سو سے زائد صحابہ کرام نے اس کا قول رسول ہونا تسلیم کیا ہے اور علامہ امینی مدظلہ نے بترتیب حروف تہجی ان تمام صحابہ کرام کے نام مع الفاظ روایت ذکر کئے ہیں اور تا عہد حاضر اس حدیث کا تواتر کے ساتھ نقل ہونا ثابت فرمایا ہے۔ (الغدیر ج)

ان احادیث کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ علیؑ ہی چونکہ عالم قرآن ہے لہٰذا قرآن کے ساتھ ساتھ علیؑ کی محبت کے بغیر قطعاً انسان مومن نہیں بن سکتا اور گذشتہ فصول میں اس امر پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ جناب امیر المومنین علیہ السلام ہی عالم قرآن اور معلم قرآن ہیں اور ان کے بعد ان کی عترت طاہرہ کو یہ شرف تا قیامت حاصل ہے کیونکہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے۔ اب اس سلسلہ میں کتب امامیہ میں سے بعض اور احادیث ذکر کی جاتی ہیں تاکہ روح ایمان کے لئے صیقل کا کام دیں۔ چنانچہ مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار میں بصائر الدرجات سے بسند صحیح منقول ہے کہ حضرت صادق آل محمد امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ

(۱) ان الله علّم نبیه التاویل والتنزیل قال فعلّم رسول الله علیاً قال وعلّمنا والله الخبر — تحقیق اللہ نے اپنے نبیؐ کو تنزیل اور تاویل کا علم عطا فرمایا پس جناب رسالتمآبؐ نے علیؑ کو تعلیم فرمایا پھر فرمایا کہ خدا کی قسم ہم اس کو جانتے ہیں

(۲) قال رسول الله یا علی انت تعلّم الناس تاویل القرآن بما لا یعلمون فقال علی ما ابلغ رسالتک — جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا اے علیؑ تو لوگوں کو تاویل قرآن کی تعلیم دے گا کہ وہ نہیں جانتے ہوں گے۔ حضرت علیؑ نے عرض کی مولا میں آپ کی رسالت

لے عن الترمذی و مسند احمد و سنن ابن ماجہ و سنن نسائی وغیرہ۔ ایضاً عن الترمذی وغیرہ سے نہج البلاغہ

بعدك یا رسولَ الله قال تخبر الناس بما اشکل علیهم من تاویل القران ومافیه

کی تبلیغ آپ کے بعد کس طرح کروں ؟ تو آپ نے فرمایا۔ تاویلِ قرآن یا اس کے جملہ مطالب جو لوگوں پر حل نہ ہو سکیں تو ان کو ان سے خبردار کرنا

۳۔ راوی الصفار من ثقات اصحاب الصادق انه قال بعد ما اومی الی صدره علم الکتاب کله والله عندنا ثلثا

صفار نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ثقہ اصحاب سے روایت کی ہے کہ آپ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کر کے تین بار ارشاد فرمایا۔ کہ خدا کی قسم پوری کتابِ خُدا کا علم ہمارے پاس موجود ہے۔

۴۔ عنه باسناده عن یعقوب بن جعفر قال کنت مع ابی الحسنؑ بمکة فقال له رجل اِنَّكَ لتفسر من کتاب الله مالم نسمع به ؟ فقال ابوالحسنؑ علینا نزل قبل الناس ولنا فسر قبل ان یفسر فی الناس فنحن نعرف حلاله وحرامه وناسخه ومنسوخه وسفریه وحضریه وفی ای لیلة نزلت من ایة وفی من نزلت وفی ما انزلت الخبر

یعقوب بن جعفر سے روایت ہے کہ مکہ میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے ہمراہ میں موجود تھا کہ آپ کی خدمت میں آکر ایک شخص کہنے لگا آپ قرآن کی ایسی تفسیر بیان فرماتے ہیں جو ہم نے سنی نہ ہو تو آپ نے فرمایا کہ قرآن لوگوں سے پہلے ہم پر نازل ہُوا۔ اور لوگوں سے پہلے ہم پر اس کی تفسیر کھلی پس ہم ہی اس کے حلال و حرام، ناسخ و منسوخ، سفری و حضری کو جانتے ہیں اور ہم ہی جانتے ہیں کہ کون سی آیت کس رات میں کس شخص کے بارے میں اور کس باب میں اتری ہے۔

۵۔ فی الکافی۔ عن ابی جعفرؑ قال ما یستطیع احد ان یدعی ان عنده علم جمیع القرآن کله ظاهره وباطنه غیر الاوصیاء

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سوائے اوصیاء کے کسی کو جرأت نہیں کہ یہ دعویٰ کرے کہ میں پورے قرآن کا اس کے ظاہر و باطن کا علم رکھتا ہوں

۶۔ وفی روایة اُخری عنهٗ قال ما ادعی احد انه جمع القرآن کله کما انزل الاکذاب وما جمعه وحفظه کما انزلُ الا علی بن ابی طالب والائمة من بعده

ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ لوگوں میں سے جو بھی جامع قرآن ہونے کا دعویٰ کرے جس طرح اترا ہے وہ جُھوٹا ہے کیونکہ جس طرح اترا ہے اس طرح اس کے جمع اور حفظ کرنے والا سوائے علی بن ابی طالب اور اس کے قائمقام آئمہ کے اور کوئی بھی نہیں۔

۷۔ عن تفسیر العیاشی قال انا اهل بیت لم یزل الله یبعث فینا من یعلم کتابه من اوله اِلی آخره

بروایت تفسیر عیاشی حضرت صادقؑ سے مروی ہے کہ ہم اہلبیت میں سے خدا ہمیشہ ایک ایسا شخص بھیجتا رہا ہے جو قرآن کا اوّل سے لے کر آخر تک عالم ہوا کرتا ہے۔

۸۔ وفی روایة ان من علم ما اوتینا تفسیر القرآن واحکامه لو وجدنا اوعیة او مستراحًا

ایک روایت میں ہے فرمایا ہمارے علوم وہبیہ میں سے قرآن کی تفسیر بھی ہے اور اس کے احکام کا علم بھی ملے کاش ہمیں اس کے ظرف اور

لَقُلْنَا واللہ المستعان — حال ملتے تو ہم بیان کرتے۔

۹۔ عن قوۃ القلوب ۔ قال علی لوشئت — حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں اگر میں چاہوں تو صرف سورہ فاتحہ لاوقرت سبعین بعیرامن تفسیر فاتحۃ الکتاب — کی تفسیر سے ستر اونٹ بار کر سکتا ہوں۔

۱۰۔ ابو خالد واسطی روایت کرتا ہے کہ زید بن علیؑ سے مروی ہے حضرت امیر المومنین فرمایا کرتے تھے کہ عہد رسالت میں کبھی میرے سر میں اونگھ یا نیند نے جگہ نہیں لی۔ جب تک کہ میں نے حضرت رسالتمآبؐ سے اس دن میں جبرئیل کی لائی ہوئی آیات کے متعلق حلال و حرام، سنّت اور امر و نہی اور مقصد نزول اور شان نزول دریافت نہ کر لیا ہو۔ راوی کہتا ہے کہ باہر جاکر ہم نے معتزلیوں سے ملاقات کے موقعہ پر اس چیز کو پیش کیا تو انہوں نے اس پر فوراً اعتراض کر دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ بعض اوقات وہ دونوں (رسالتمآبؐ اور حضرت علیؑ) ایک دوسرے سے بہت دُور دُور ہوا کرتے تھے۔ پس وہ کس طرح جناب رسالتمآبؐ سے سب باتیں دریافت کر سکتے تھے۔ معتزلیوں کا یہ اعتراض واپس آکر ہم نے زید سے بیان کیا تو زید نے جواب دیا کہ وہ تاریخیں نوٹ کر لی جاتی تھیں اور پھر جب بھی ملاقات ہوتی تھی تو جناب رسالتمآبؐ تاریخ وار آیات سُنا دیا کرتے تھے اور ان کے جملہ گوشوں کے متعلق ارشاد فرما دیا کرتے تھے اور اس طریقہ سے ملاقات کے روز تک کی کمی پوری ہو جایا کرتی تھی۔ بس اسقدر روایات اس بارہ میں کافی قرار دیتا ہوں اور ضمنی طور پر اس مضمون کی دوسری روایات اپنے اپنے مقام مناسب پر ذکر ہوتی رہیں گی۔ انشاء اللہ العزیز

میں شروع میں ذکر کر چکا ہوں کہ جامع اوراق اور عالم مطالب مندرجہ میں فرق ہے۔

اصل کتاب اور جامع ظاہری میں کوئی تلازم نہیں۔ لیکن تمسک کے لئے کتاب اور عالم کتاب میں تلازم ہے لہٰذا عالم قرآن کی معرفت اور مودّت کے بغیر صرف قرآن یا اس کے جامع اجزاء ظاہریہ کے ساتھ تمسک پکڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے گذشتہ احادیث نے ثابت کر دیا کہ علیؑ کا منکر قرآن کا منکر ہے کیونکہ علیؑ ہی قرآن کے جملہ علوم کے عالم و معلم ہیں۔

نتیجہ یہی ہوا کہ اگر جامع قرآن سے مراد جامع اوراق اور صرف ناشر ہے تو قرآن کی محبّت کے ساتھ اس کی محبّت کے وجوب کا کوئی تلازم نہیں۔ لہٰذا اس پر ایمان نہ لانے سے ایمان بالقرآن میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی اور اگر جامع قرآن سے مراد جامع علوم قرآنیہ ہو تو قرآن کی محبّت اور جامع علوم قرآنیہ کی محبت میں قطعی طور پر تلازم ہے۔ ان میں سے ایک کا منکر دوسرے کا منکر ہوگا اور جامع علوم قرآنیہ علیؑ اور ان کی اولاد طاہرینؑ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ پس قرآن اور ان کی مودّت میں یقیناً تلازم ہے۔ ان دونوں میں سے ایک سے نفرت کر کے دوسرے کے ساتھ ایمان کا دعویٰ بے بنیاد ہے

ـلـه فی ثالث البحار عن علی اوتیت فہم الکتاب وفصل الخطاب وعلم القرون والاسباب واستودعت الف مفتاح یفتح کل مفتاح الف باب یفضی کل باب الی الف الف عہد (البحر)

جمع قرآن میں اختلاف

جمع قرآن کے متعلق اہل سنّت کے علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں تفصیلی روشنی ڈالنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے چنانچہ مستدرک حاکم سے بروایت زید بن ثابت نقل کیا ہے کہ پہلی بار قرآن مجید عہد رسالت میں جمع ہوا تھا اور بیہقی نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ جمع قرآن سے مراد اس روایت میں جمع آیات قرآنیہ ہے یعنی آیاتِ قرآنیہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر مختلف حالات و واقعات کے متعلق نازل ہوا کرتی تھیں تو جناب رسالتمآب نے سُورتوں کی حدود معین فرمائی اور اس کے بعد جب کوئی آیت اترتی تھی تو آپ فرما دیا کرتے تھے کہ اس کو فلاں سورہ میں شامل کر دو اور پھر اس طریقہ سے تمام نازل شدہ آیات کو حضرت رسالتمآب نے خود ہی علیحدہ علیحدہ سورتوں میں جمع فرما دیا تھا۔ لیکن سورتیں سب یکجا نہ تھیں۔ بعض پتھروں پر بعض درختوں کے پتّوں اور بعض چمڑوں پر تحریر تھیں (جن کو بعد میں جمع کیا گیا)

اس کے بعد بروایت بخاری حضرت ابوبکر کو جامع اوّل قرار دیا۔ اور زید بن ثابت نے ان کے حکم سے جمع کیا لیکن خوشی اور رضامندی سے نہیں بلکہ جبر و اکراہ سے۔ چنانچہ سیوطی نے اس کی نقاب کشائی یوں کی ہے۔

وفی موطا ابن وھب عن مالک عن ابن شھاب عن سالم بن عبداللہ بن عمر قال جمع ابوبکر القرآن فی قراطیس وکان سئل زید بن ثابت فی ذالک فابی حتی استعان علیہ بعمر

موطا ابن وہب میں مالک سے اُس نے ابن شہاب سے اُس نے سالم بن عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ ابوبکر نے قرآن کو کاغذوں میں جمع کیا چنانچہ انہوں نے زید بن ثابت سے اس کی خواہش کی تھی تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے خلاف حضرت عمر سے مدد لی گئی

نیز بروایت ابن شہاب یہ بھی نقل کیا ہے فکان ابوبکر اوّل من جمع القرآن (یعنی ابوبکر ہی پہلا جامع قرآن ہے نیز ابن داؤد سے روایت کی ہے کہ حضرت علی نے فرمایا۔ ابوبکر کتاب اللہ کا پہلا جامع ہے۔

اسی ضمن میں سیوطی نے بروایت ابن سیرین یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے یہ بھی فرمایا۔

لما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آلیت ان لا آخذ ردائی الا لصلوٰۃ الجمعۃ حتی اجمع القرآن فجمعتہ

کہ جناب رسالتمآب نے رحلت فرمائی تو میں نے قسم اٹھائی کہ دوش پر سوائے نماز جمعہ کے ردا نہ لوں گا۔ جب تک قرآن کو جمع نہ کر لوں گا۔ پس میں نے قرآن کو جمع کر لیا۔

اس پر ابن حجر نے بغض و حسد کی بھڑاس یوں نکالی ہے کہ حضرت علیؑ کی پہلی روایت یعنی جس میں حضرت ابوبکر کو جامع اوّل

قرار دیا گیا ہے درست اور صحیح ہے لیکن دوسری روایت جس میں حضرت علیؑ نے اپنا جامع قرآن ہونا ذکر فرمایا ہے ضعیف ہے اور اگر بالفرض صحیح بھی تسلیم کر لی جائے تو ان کے جمع کرنے کا مقصد حفظ کرنا ہے۔

پھر سیوطی نے ابن ابی داؤد سے بروایت حسن حضرت عمر کا پہلا جامع قرآن ہونا ذکر کیا ہے۔

اور نیز بروایت ابن بریدہ حضرت ابوحذیفہ کے غلام سالم کے جامع اوّل ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

ان تمام روایات کے جمع کرنے کے بعد حارث محاسبی کی رائے یوں نقل کی ہے۔

المشھور عند الناس ان جامع القرآن عثمان ولیس کذالك انما حمل عثمان الناس علی القرأۃ بوجه واحد علی اختیار وقع بینه وبین من شهدہ من الانصار والمهاجرین

لوگوں میں مشہور ہے کہ قرآن کا جامع عثمان ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ انہوں نے تو لوگوں کو صرف ایک قرأت پر متفق ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ جن کو اپنے حاضر دربار مہاجرین و انصار کے مشورہ سے منتخب کیا۔

چنانچہ صحیح بخاری کے اردو ترجمہ میں مرزا حیرت دہلوی یوں تحریر فرماتے ہیں (ترجمہ صحیح بخاری ج۲ ص۶۶۷ حدیث ۱۰۸۹)

انس بن مالک سے مروی ہے کہ حذیفہ بن یمان حضرت عثمان کے پاس آئے اور ان دنوں حضرت عثمان اہل شام اور اہل عراق دونوں کو ساتھ ملا کر فتح آرمینیہ بائیجان میں جہاد و جنگ کر رہے تھے اور حضرت حذیفہ بھی ان میں شریک تھے حضرت حذیفہ کو شامیوں اور عراقیوں کی اختلاف قرأت نے گھبرا دیا۔ تو حضرت عثمان سے آکر کہا کہ ان آدمیوں کی خبر لیجئے اس سے پہلے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب اللہ میں اختلاف نہ کریں تو حضرت عثمان غنی نے حضرت حفصہؓ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا کہ اپنا قرآن بھیجدو تاکہ اس سے ہم اور نقل کر لیں اور پھر اصل آپ کے پاس واپس بھیج دیں گے حضرت حفصہؓ نے اس کو ان کے پاس بھیجدیا۔ اور یہاں اس کی چند نقلیں کی گئیں اور حضرت زید بن ثابت انصاریؓ و عبداللہ بن زبیرؓ و سعید بن العاصؓ و عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کو لکھنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمانؓ نے ان تینوں آدمیوں (قریشیوں) سے کہا۔ کہ جہاں تمہارا زید بن ثابت (انصاری) سے اختلاف ہو تو وہاں قریشی زبان میں لکھنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قریشی زبان میں قرآن شریف نازل کیا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بہت سے قرآن شریف لکھ لئے اور پھر اصل کو حضرت عثمانؓ غنی نے حضرت حفصہؓ کے پاس بھیجدیا اور ہر اسلامی شہر میں ایک ایک نقل بھیج دی اور پہلے کے جو مختلف قرآنی مسودات تھے ان کو جلا دینے کا حکم فرما دیا۔ (انتہی موضع الحاجۃ)

اس بات میں اختلاف ضرور ہے کہ پہلا جامع قرآن کون شخص ہے؟ گذشتہ تفصیل سے جناب رسالتمآبؐ کے بعد پانچ شخصوں کے نام لئے گئے ہیں کہ یہ قرآن کے جامع ہیں (۱) حضرت ابوبکر (۲) حضرت عمر (۳) حضرت عثمان (۴) حضرت سالم غلام ابوحذیفہ (۵) حضرت علیؑ

بہرکیف ہمیں قرآن ہی سے واسطہ ہے جامع خواہ کوئی ہو۔ حضرت عثمان کے جامع قرآن ہونے کے متعلق توجو

رائے حارث محاسبی نے قائم کی ہے۔ بخاری کی متذکرہ بالا روایت کے پیشِ نظر تو وہی بالکل درست اور مطابق واقع معلوم ہوتی ہے کیونکہ بنا بر روایت بخاری حذیفہ نے شامیوں اور عراقیوں کی اختلافِ قرأت کا ہی شکوہ کیا تھا اور اسی اختلاف کو رفع کرنے کے لئے حضرت عثمان نے یہ سب اہتمام کر کے ایک ہی قرأت کو شائع کرا دیا اور اطرافِ مملکت میں اسکی نقول بھیج دیں۔ حضرت سالمؓ اور حضرت علیؑ ان کے جمع شدہ قرآن چونکہ ہر دو منظر عام پہ نہ آسکے۔ لہٰذا معلوم نہیں ہوسکتا کہ اسی موجودہ قرآن کی قرأت و ترتیب کے موافق تھے یا نہ۔ ان ہر دو کو جامع قرآن اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ حکومت وقت نے ان کی جامعیت کو نامعلوم وجوہ کی بنا پہ کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

حضرت سالمؓ تو خیر تھے ہی غلام ان کی کون سنتا تھا؟ لیکن حضرت علیؑ کی جمع کو موردِ التفات کیوں نہ قرار دیا گیا۔ اس کو خود خدا جانتا ہے یا وہی جانتے ہیں جن سے معاملہ تھا۔ ابنِ حجر نے بقول سیوطی، حضرت علیؑ کی جامعیت والی روایت کو ٹالنے کی خوب کوشش کی۔ اولاً تو کہہ دیا کہ حضرت علیؑ کے جامع ہونے کے متعلق جو روایت ہے وہ قابلِ اعتماد نہیں ضعیف ہے۔ اب بات چونکہ خلاف واقع تھی، طبیعت میں اطمینان کیسے آتا؟ سند روایت کی پختگی کو بھانپ کر خجالت محسوس کی لیکن حضرت علیؑ کی فضیلت کا اعتراف بھی تو منشائے تعصب کے خلاف تھا۔ فوراً بینترا بدلا اور کہہ دیا۔ چلو روایت درست ہی سہی۔ تاہم حضرت علیؑ کے جمع کرنے سے مراد حفظ کرنا ہے۔

حضرت علیؑ پہلے حافظِ قرآن تھے

کہتے ہیں (دروغ گو را حافظہ نباشد) اب ذرا کوئی پوچھے کہ جب حضرت علیؑ کے جمع کرنے سے مراد حفظ کرنا ہی ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ پہلے حافظ قرآن تھے۔ پس اس صورت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے حافظ قرآن (حضرت علیؑ) کو چھوڑ کر غیر حافظ (زید بن ثابت) کو جمع قرآن پر کیوں مجبور کیا؟ حالانکہ بروایت بخاری اس نے بہت معذرت خواہی بھی کی اور بروایت موطا بن وہب اس نے صاف انکار کر دیا اور حَتّٰی اسْتَعَانَ عَلَيْهِ بِعُمَرَ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ حضرت عمر نے سختی سے اُسے جمع کرنے پر آمادہ کیا۔ کیونکہ قانون عربیت کے اعتبار سے لفظ علیٰ ضرر کے لئے ہوا کرتی ہے۔ قطعاً منت و مشورہ کے معنی میں نہیں ہوا کرتی۔

ترجمہ بخاری از مرزا حیرت دہلوی ج۲ حدیث نمبر ۲۰۰۸ ملاحظہ فرمائیے۔ زید نے کہا کہ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے مجھ سے کہا کہ تم عقلمند جوان آدمی ہو۔ تم پر ہم بھول یا جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکتے اور تم نبی صلعم کی وحی بھی لکھا کرتے تھے۔ (لہٰذا) تم ہی قرآن کو تلاش کر کر کے جمع کر دو۔ زید کہتے ہیں۔ کہ واللہ اگر مجھے پہاڑ کے اٹھانے کا حکم حضرت ابوبکرؓ فرماتے تو وہ مجھے اس جمع قرآن کے کام سے آسان معلوم ہوتا۔

بالفرض اگر زید پر سختی نہ بھی ہوئی ہو۔ تاہم ان کو یہ کام پہاڑ کے سر پر اٹھانے سے بھی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ تو ان کو تلاش کر کر کے جمع کرنے کی تکلیف دینے کی بجائے حافظِ قرآن (حضرت علیؑ) سے جمع کیوں نہ کروا لیا گیا۔ کیونکہ زید بن ثابت

خود حافظ تھا نہیں ۔ ورنہ نہ اس کام کو وہ خود پہاڑ سے سنگین تر سمجھتا ۔ بلکہ کار خیر سمجھ کر خود ہی خواہش کرتا اور نہ خلیفہ تلاش کر کر کے جمع کرنے کا اس کو حکم دیتے ۔

علاوہ ازیں دیگر مسائل مشکلہ میں تو حضرت علیؑ کی طرف وقتاً فوقتاً رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی تھی ۔ اور حضرت علیؑ کی مشکل کشائی کے بعد لولا علی لھلک عمر یا اس قسم کے دیگر اعترافی کلمات زبان سے نکل جایا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کی سبقت علمی کا اعتراف کرتے تھے تفصیل کے لئے صفحہ ۸۲ ملاحظہ ہو ۔ نیز جناب رسالتمآبؐ کا فرمان علی مع القرآن والقرآن مع علی (علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے) بھی زیر نظر تھا حوالہ صفحہ ۱۲۵ پر ملاحظہ ہو اور حدیث متواتر ثقلین جو تمام صحابہ کے گوش گذار ہو چکی تھی ۔ ابھی اتنی پرانی نہیں ہوئی تھی کہ کسی کو اس کا خیال نہ رہا ہو ہم اس کو گذشتہ عنوانات میں بالعموم اور ایک علیحدہ عنوان میں بالخصوص متعدد طرق سے بیان کر چکے ہیں اور ان سب کے علاوہ ابن حجر کی سابق تاویل کے پیش نظر حضرت علیؑ اوّل حافظ قرآن تو تھے ہی ۔ بایں ہمہ زید بن ثابت کے سر پہ پہاڑ سے گراں تر بھار رکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور حضرت علیؑ پر جمع کرنے کا اعتماد کیوں نہ کیا گیا ؟ نیز خود علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے عہد رسالت میں قرآن جمع کر کے جناب رسالتمآبؐ کے پیش بھی کیا تھا ۔ چنانچہ اُن کے حضرت علیؑ کی تعریف میں اصل الفاظ یہ ہیں ۔ واحد من جمع القرآن وعرضہ علی رسول اللہ یعنی علی ایک شخص ہے ۔ جس نے قرآن کو جمع کیا اور حضرت رسالتمآبؐ کے پیش بھی کیا ۔ اب انصاف سے فرمائیے کہ جب حضرت علیؑ کے پاس جناب رسالتمآبؐ کا مصدقہ قرآن موجود تھا تو اُسے چھوڑ کر ادھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے یا ہاتھ پاؤں مارنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کیا ان کے نزدیک جناب رسالتمآبؐ کی فرمائشات حدیث ثقلین یا دیگر اس قسم کی احادیث جن کو تواتر سے نقل کیا گیا ہے قابل اعتماد اور مبنی بر صحت نہیں تھیں ۔ یا آنحضرتؐ کا مصدقہ جمع شدہ قرآن جو علیؑ کے پاس تھا ۔ وہ ناکافی تھا ؟ جمع قرآن جیسے اہم دینی معاملہ میں حضرت علیؑ جیسی اہم شخصیت کو نظر انداز کرنا حالانکہ علم قرآن سب سے زیادہ علیؑ کو تھا کیا معنی رکھتا ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے ؟ دانا خود سوچیں اور منصفانہ طور پر اس کا جائزہ لیں کہیں دال میں کالا نہ ہو

لطیفہ ۔ جمع قرآن کے متعلق وارد شدہ اور دیگر متعلقہ روایات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ مذکورین میں سے سوائے علیؑ بن ابی طالبؑ کے ایک بھی حافظ قرآن نہ تھا ۔ کیونکہ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کے پاس سے صحف منگوا کر زید کو ایک مصحف میں جمع کرنے کا حکم دیا اور متعدد نسخے لکھوائے اور کہا کہ اختلافی مقامات پر قریش کی لغت کو ترجیح دینا کیونکہ قرآن اسی لغت میں اترا ہے اگر خود حافظ ہوتے تو حضرت حفصہ سے صحیفے منگوانے کی یا اختلاف قرأت کا خطرہ محسوس کر کے علاج معین کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اپنے حفظ سے ہی سب کچھ ہو سکتا تھا ۔ اسی طرح حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی اگر حافظ ہوتے تو زید کو تلاش کر کر کے جمع کرنے کی تکلیف نہ دیتے اپنے حفظ سے ہی لکھوا دیتے یا کم از کم امداد ضرور دیتے تاکہ اس کا بھار ہلکا ہو جاتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ زید خود بھی حافظ نہیں تھا ۔ ورنہ جمع قرآن جیسی اہم دینی خدمت سے ہرگز جی نہ چُراتا

اور معذرت پیش کرکے پہلو تہی کی کوشش نہ کرتا اور نہ اس کو پہاڑ سے گراں تر سمجھتا اور نہ اس کو تلاش کرنے کی فرمائش ہوتی بلکہ وہ اپنے حفظ سے سب کچھ کرلیتا۔

پس اس ساری فہرست میں سے ایک بھی حافظِ قرآن نہیں۔ ابن حجر بیچارے کو یہ خیال تک نہیں آیا ورنہ وہ حضرت علیؑ کو کیوں حافظ قرآن کہتا؟ روایت متعلقہ کی کوئی اور توجیہہ نکال لیتا۔ تاکہ حضرت علیؑ صحابہ کے مقابلہ میں ذرا نیچے معلوم ہوتے اس میں شک نہیں کہ شیعہ قوم میں حافظ کم ہیں۔ لیکن الحمدللہ بتصدیق ابنِ حجر شیعوں کا امام تو حافظ قرآن ہے مقتدی، حافظ نہ سہی، مقتدا تو حافظ ہے۔ مقتدی بوقتِ ضرورت ان کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔

رونا تو ان لوگوں کی حالت پہ آنا چاہیئے کہ مقتدی حافظ اور مقتدا سب کے سب بے بہرہ

ابن حجر نے حضرت علیؑ کے جامع قرآن ہونے پر حرف گیری کرتے ہوئے جمع کی تاویل حفظ سے کرکے حضرت علیؑ کے حافظ ہونے کا اعتراف کرلیا۔ لیکن ایک بات کا خیال نہ رہا۔ اگر کوئی سوال کرے کہ اگر قرآن پہلے جمع نہ تھا تو حضرت علیؑ حافظ کس چیز کے تھے اور حضرت علیؑ نے اگر حفظ کیا ہے تو بھی گھر پر کیونکہ متعلقہ روایت کے الفاظ ہیں کہ دوش پر عبا نہ لوں گا۔ جب تک قرآن جمع نہ کرلوں یعنی گھر سے باہر قدم نہ رکھوں گا جب تک جمع نہ کرلوں گا۔ یہاں تک کہ میں نے جمع کرلیا اور بقول ابنِ حجر معنی یہ ہوا کہ دوش پر عبا نہ ڈالوں گا۔ جب تک حفظ نہ کرلوں گا۔ یہاں تک کہ میں نے حفظ کرلیا سوچنے کے قابل ہے کہ اگر قرآن علیؑ نے جمع نہیں کیا تو پھر گھر بیٹھ کر حفظ کس چیز سے دیکھ کر کرتے رہے۔ پس اپنے ہاں جمع تھا تو حفظ کیا اور پہلے حفظ تھا تو جمع کیا کیونکہ نہ باہر گئے اور نہ کسی سے دریافت کیا اور نہ کوئی ضعیف سے ضعیف بھی ایسی روایت ملتی ہے کہ علیؑ نے کبھی کسی سے کوئی آیت دریافت کی ہو۔ پس یہی معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ کا حفظ رسالتمآبؐ سے تھا اور جمع حفظ سے بھی اور بروایت سابقہ تاریخ الخلفا علیؑ عہد رسالت سے جامع بھی تھے اور حافظ بھی۔ لسان وحی ترجمان سے سُن سُن کر حفظ بھی کرتے رہتے اور جمع بھی ہوتا رہا اور ان کے متعلق جمع کی وہ روایت جس کی ابنِ حجر نے حفظ سے تاویل کی ہے اس سے مراد صرف ترتیب اجزاء ہے اور بس۔

نتیجہ:- جامع قرآن حضرت سالم نہیں بلکہ وہ تو ایسی کس مپرسی کے عالم میں ہے کہ اس سلسلہ میں اس کا نام بھی کوئی نہیں لیتا۔ حضرت علیؑ کے جامع قرآن تسلیم کرنے سے طبیعت گھبراتی ہے حتّٰی کہ لفظ جمع کو حفظ سے مؤوّل کرلیا جاتا ہے گو حفظ خود بخود جمع کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اگر تاویل کرنے والا سوچتا تو قطعاً یہ تاویل نہ کرتا۔ کیونکہ جمع میں صرف ایک ہی فضیلت تھی اور حفظ میں دو فضیلتوں کا اظہار ہوتا ہے جمع بھی اور حفظ بھی (پہلے جمع نہ ہو تو لفظ حفظ لغو ہے۔

حضرت عثمان بھی جامع نہیں کیونکہ بروایت حارث محاسبی اور تائید روایت بخاری وہ تو صرف لوگوں کو ایک قرأت پر جمع کرنے والے ہیں۔ قرآن اُن سے پہلے جمع تھا۔ انہوں نے نقل کرکے اور قرأت ایک کرکے اطراف میں بھیج دیئے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی خود جامع نہیں وہ تو صرف حکم دینے والے ہیں حکم دینا اور بات ہے اور عمل کرنا اور شیئے ہے۔

اب رہا زید تو اس کے متعلق مستدرک حاکم کی روایت سُنیئے جس کو سیوطی نے الاتقان میں ذکر کیا ہے۔

اخرج بسند علی شرط الشیخین عن زید بن ثابت قال کنا عند رسول اللہ نؤلف القرآن من الرقاع

حاکم نے ایسی سند سے روایت کی ہے۔ جو شرط شیخین (بخاری ومسلم) کے موافق ہے زید بن ثابت کہتا ہے کہ ہم جناب رسالتمآبؐ کے پاس رہ کر قرآن شریف کو مختلف (چمڑے یا کاغذ وغیرہ کے ٹکڑوں سے جمع کر لیا کرتے تھے

مطلب صاف یہی نکلا کہ قرآن مجید عہد رسالت میں جمع ہو چکا تھا اور زید نے دوبارہ خلفاء وقت کے حکم سے ان کو نقل کر کے دیدیا گو بیہقی نے جامع قرآن کی اہمیت بڑھانے کے لئے اس روایت کی تاویل کر لی جو پہلے ذکر ہو چکی ہے لیکن واقعات اس تاویل کو قبول نہیں کرتے اور جناب رسالتمآبؐ کے دور میں جمع کرنے والوں میں سے ایک حضرت علیؑ بھی ہیں جس کو تاریخ الخلفاء میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کے جمع شدہ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جمع کے بعد حضورؐ نے اس کا ملاحظہ فرمالیا تھا۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مصدقہ جمع شدہ قرآن تھا۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر حکومت وقت نے اس کی ترویج مناسب نہ سمجھی اور نہ اس معاملہ میں حضرت علیؑ کو شامل کرنا مناسب سمجھا۔ اس تفصیل سے ایک طرف تو صحابہ کا باہمی شیر وشکر ہونا بھی ظاہر ہو گیا اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ ان سب ہی سے سوائے علیؑ کے نہ کوئی حافظ قرآن ہے نہ جامع بلکہ قرآن عہد رسالتؐ سے جمع تھا۔ حضرت علیؑ اس کے حافظ بھی تھے اور جامع بھی پس فرمان رسالتؐ کی تصدیق ہو گئی۔

علیؑ مع القرآن والقرآن مع علیؑ

ابتدائے نزولِ قرآن

اس میں اختلاف ہے کہ قرآن مجید کا سب سے پہلے نازل ہونے والا سورہ کون سا ہے۔ چنانچہ اس میں چار اقوال مشہور ہیں

۱۔ سورۂ اقراء سب سے پہلے نازل ہوا ہے۔

۲۔ بعض مفسرین نے سورہ مدثر کو پہلا نازل ہونے والا سورہ قرار دیا ہے۔

۳۔ بعض کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے اُترا ہے

۴۔ ایک روایت میں ہے کہ قرآن کا سب سے پہلے اترنے والا حصہ آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔

پہلا قول کرنے والوں نے ایک روایت کو اپنے قول کا مدرک قرار دیا ہے جس کو علامہ سیوطی نے الاتقان میں کتب صحاح سے نقل کیا ہے جس کی راویہ حضرت عائشہ ہیں کہ غار حرا میں جب پہلے پہل حضرت جبریل کا نزول ہوا تو اس نے حضرت رسالتمآبؐ سے خواہش کی کہ اِقْرَأْ یعنی پڑھو تو آپ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں تو جبریل نے آپ کو ڈھانپ

لیا اور خوب دبایا پھر چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو تو پھر آپ نے حسب سابق جواب دیا کہ میں پڑھا ہُوا نہیں ہوں چنانچہ پھر جبرئیل نے آپ کو ڈھانپ کر خوب دبایا اور جب چھوڑا تو کہا کہ پڑھو لیکن آپ نے پھر بھی وہی جواب دھرایا کہ میں پڑھا ہُوا نہیں ہوں پس جبرئیل نے تیسری دفعہ پھر ڈھانپ لیا اور خوب دبایا اور چھوڑنے کے بعد پھر پڑھنے کو کہا تو آپ نے پھر فرمایا کہ میں پڑھا ہُوا نہیں ہوں تو اب کی بار جبرئیل نے پڑھا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ سے مَالَمْ يَعْلَمْ تک اور حضورؐ نے اس کو دھرالیا۔ جبکہ آپ کے اعضاء میں کپکپی طاری تھی

دوسرے قول کا مدرک کتب صحاح سے الاتقان میں بروایت جابر بن عبداللہ انصاری منقول ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں غار حرا سے نکل کر وادی کے درمیان میں تھا کہ میں نے ہر چہار سو دیکھ کر آسمان کی طرف نظر بلند کی تو جبرئیل دکھائی دیا۔ پس میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ چنانچہ گھر میں پہنچ کر میں نے خدیجہ سے کہا دَثِّرُوْنِیْ یعنی میرے اوپر لحاف ڈال دو پس اللہ نے نازل فرمایا يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ الخ

اقول در شیعہ عقیدہ کی رُو سے حضرت رسالتمآبؐ کا نزول وحی کے وقت جبرئیل سے خوفزدہ ہونا بعید از عقل ہے اسی طرح ہر وہ روایت جس میں شان رسالت میں بے ادبی یا گستاخی کا پہلو ظاہر ہو وہ لائق تاویل یا قابل رد ہے پہلا قول سب سے زیادہ مشہور ہے اور روایاتِ اہلبیت میں اس کی تائید بھی موجود ہے۔

چنانچہ الاتقان میں حضرت امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ مکہ میں سب سے پہلا نازل ہونے والا سورہ اِقْرَأْ ہے جبکہ سب سے آخر اترنے والا سورہ المومنون ہے (بعضوں نے عنکبوت کہا ہے) اور مدینہ میں سب سے پہلے اترنے والا سورہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ہے اور آخری سورہ براءت اور بعض مفسرین نے مدینہ میں پہلا اترنے والا سورہ البقرہ اور بعض نے سورہ القدر قرار دیا ہے۔

اکثر قرآن مکہ و مدینہ میں اترا ہے لیکن چند آیتیں سماوی ہیں مثلاً سورۂ زخرف کی آیت وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا الخ اور سورۂ صافات کی تین آیتیں وَمَا مِنَّا اِلَّا الخ اور سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں اور سورہ مرسلات زمین کے اندر نازل ہوا جبکہ آپ غار ثور میں تشریف فرما تھے۔

شیعہ عقیدہ کی رُو سے چونکہ آیت مجیدہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سورہ برات کے علاوہ ہر سورہ کا جزو ہے لہذا جو سورہ بھی پہلے اترا اس کی ابتدا بسم اللہ سے ہوئی پس بسم اللہ کا سب سے پہلے نازل ہونا یقینی ہے۔

ترتیب نزول

بعض متعصب مزاج لوگ آل محمدؐ کے فضائل و مناقب پر پردہ ڈالنے کے لئے جہاں آیات کی تاویل میں ہیرا پھیری سے کام لے کر عوام کے دلوں میں شکوک و شبہات کے بیج بوتے ہیں۔ وہاں مکی و مدنی سورتوں میں خلط کر کے عوام کو آل محمدؐ

کے بارے میں نازل شدہ آیات کے مضامین سے مائل بانحراف کرتے ہوئے دل کی بھڑاس کو ٹھنڈا کرنے میں سرور محسوس کرتے ہیں چنانچہ سورۂ الدھر جو آلِ محمدؐ کی یتیم پروری مسکین نوازی اور اس پر رحمدلی کے ایثار پسندانہ جذبات کے مظاہر پر خالقِ کائنات کی طرف سے خراجِ تحسین و تشکر کی پیش کش اور اخروی انعامات و اکرامات کی محکم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس کے شانِ نزول کے انکار کرنے کے بہانہ سے سورۂ دھر کو مکی ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے اور دَورِ حاضر کے متعصب ترین مصنف جناب ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اسی اشعار کو اپناتے ہوئے اپنے مجتہدانہ ذہن کو اسی منہج پر لگا لیا اور سورہ مذکورہ کو مکی کہہ کر مذہب اہلبیت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔

میرے سامنے اس وقت علامہ جلال الدین سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن مطبوعہ مصر کا دوسرا ایڈیشن ہے جس کے جزو اوّل کے ص۲۵ پر انہوں نے مکی و مدنی سورتوں کی تفصیل بروایت جابر بن زید نقل کی ہے چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والے سوروں کی علی الترتیب فہرست یہ ہے۔

نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ
۱	اقراء	۱۵	الکوثر	۲۹	لایلاف	۴۳	الفاطر
۲	ن والقلم	۱۶	التکاثر	۳۰	القارعة	۴۴	مریم
۳	المزمل	۱۷	أرأیت	۳۱	القیامة	۴۵	طٰهٰ
۴	المدثر	۱۸	الکافرون	۳۲	ویل لکل همزة	۴۶	الواقعه
۵	الفاتحه	۱۹	الفیل	۳۳	المرسلات	۴۷	الشعراء
۶	تبت یدا	۲۰	الفلق	۳۴	ق	۴۸	النمل
۷	التکویر	۲۱	الناس	۳۵	البلد	۴۹	القصص
۸	الاعلیٰ	۲۲	قل هو الله احد	۳۶	الطارق	۵۰	بنی اسرائیل
۹	واللیل	۲۳	والنجم	۳۷	القمر	۵۱	یونس
۱۰	والفجر	۲۴	عبس	۳۸	ص	۵۲	هود
۱۱	والضحیٰ	۵	انا انزلنا	۳۹	الاعراف	۵۳	یوسف
۱۲	الم نشرح	۲۶	والشمس	۴۰	الجن	۵۴	الحجر
۱۳	والعصر	۲۷	البروج	۴۱	یٰسین	۵۵	الانعام
۱۴	والعادیات	۲۸	التین	۴۲	الفرقان	۵۶	الصافات

نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ
۵۷	لقمان	۶۵	الاحقاف	۷۳	النحل	۸۱	النازعات
۵۸	السباء	۶۶	الذاریات	۷۴	نوح	۸۲	الانفطار
۵۹	الزمر	۶۷	الغاشیہ	۷۵	الطور	۸۳	الانشقاق
۶۰	المومن	۶۸	الکہف	۷۶	المومنون	۸۴	الروم
۶۱	حم السجدہ	۶۹	الشوریٰ	۷۷	الملک	۸۵	العنکبوت
۶۲	الزخرف	۷۰	ابراھیم	۷۸	الحاقہ	۸۶	المطففین
۶۳	الدخان	۷۱	السجدہ	۷۹	المعارج		
۶۴	الجاثیہ	۷۲	الانبیاء	۸۰	عم یتساءلون		

یہ کل چھیاسی (۸۶) سورتیں ہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں اور تفسیر الاتقان میں ہے کہ سورہ النحل کی چالیس آیتیں مکہ میں اور باقی مدینہ میں نازل ہوئیں۔ ان کے بعد مدینہ میں اترنے والی سورتوں کی علی الترتیب فہرست یہ ہے۔

نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ	نمبر شمار	نام سورہ
۸۷	البقرہ	۹۴	اذا زلزلت	۱۰۱	البیّنہ	۱۰۸	الحجرات
۸۸	آل عمران	۹۵	الحدید	۱۰۲	الحشر	۱۰۹	التحریم
۸۹	الانفال	۹۶	محمدؐ	۱۰۳	اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللہ	۱۱۰	الجمعہ
۹۰	الاحزاب	۹۷	الرعد	۱۰۴	النور	۱۱۱	التغابن
۹۱	المائدہ	۹۸	الرحمٰن	۱۰۵	الحج	۱۱۲	الصف
۹۲	الممتحنہ	۹۹	الدھر	۱۰۶	المنافقون	۱۱۳	الفتح
۹۳	النساء	۱۰۰	الطلاق	۱۰۷	المجادلہ	۱۱۴	التوبہ

تاج کمپنی کے موجودہ طبع شدہ قرآن میں سورتوں کی تنزیل کے ترتیب وار نمبر درج ہیں جو نمبر ۶۱ حم السجدۃ تک روایت مذکورہ کے مطابق ہیں اور بعد میں قدرے اختلاف ہے چنانچہ وہ نمبر اس طرح ہیں۔

نمبر	نام سورہ	نمبر	نام سورہ	نمبر	نام سورہ	نمبر	نام سورہ
۶۲	الشوریٰ	۷۶	الطور	۸۹	الانفال	۱۰۳	الحج
۶۳	الزخرف	۷۷	الملک	۹۰	الاحزاب	۱۰۴	المنافقون
۶۴	الدخان	۷۸	الحاقہ	۹۱	الممتحنہ	۱۰۵	المجادلہ
۶۵	الجاثیہ	۷۹	المعارج	۹۲	النساء	۱۰۶	الحجرات
۶۶	الاحقاف	۸۰	النباء	۹۳	اِذَا زُلزِلت	۱۰۷	التحریم
۶۷	الذاریات	۸۱	النازعات	۹۴	الحدید	۱۰۸	التغابن
۶۸	الغاشیہ	۸۲	الانفطار	۹۵	مُحَمَّدٌ	۱۰۹	الصف
۶۹	الکہف	۸۳	الانشقاق	۹۶	الرعد	۱۱۰	الجمعہ
۷۰	ابراھیم	۸۴	الروم	۹۷	الرحمٰن	۱۱۱	الفتح
۷۱	نوح	۸۵	العنکبوت	۹۸	الدھر	۱۱۲	المائدہ
۷۲	الانبیاء	۸۶	المطففین	۹۹	الطلاق	۱۱۳	التوبہ
۷۳	النحل		**مدنی سورتیں**	۱۰۰	البیّنہ	۱۱۴	النصر
۷۴	المومنون	۸۷	البقرہ	۱۰۱	الحشر		
۷۵	السجدہ	۸۸	آل عمران	۱۰۲	النور		

موجودہ ترتیب مکی و مدنی

دورِ حاضر میں موجودہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب حسب ذیل ہے جو تاج کمپنی کے مطبوعہ قرآنوں میں موجود ہے

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی
۱	الفاتحہ	مکیہ	۵	المائدہ	مدنیہ	۹	توبہ	مدنیہ	۱۲	رعد	مدنیہ
۲	البقرہ	مدنیہ	۶	الانعام	مکیہ	۱۰	یونس	مکیہ	۱۳	ابراہیم	مکیہ
۳	آل عمران	〃	۷	الاعراف	〃	۱۱	ھود	〃	۱۴	الحجر	〃
۴	النسآء	〃	۸	الانفال	مدنیہ	۱۲	یوسف	〃	۱۵	النحل	〃

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی
۱۷	بنی اسرائیل	مکیہ	۴۱	حٰم السجدۃ	مکیہ	۶۵	الطلاق	مدنیہ	۸۹	الفجر	مکیہ
۱۸	الکہف	″	۴۲	الشوریٰ	″	۶۶	التحریم	″	۹۰	البلد	″
۱۹	مریم	″	۴۳	الزخرف	″	۶۷	الملک	مکیہ	۹۱	الشمس	″
۲۰	طٰہٰ	″	۴۴	الدخان	″	۶۸	القلم	″	۹۲	واللیل	″
۲۱	الانبیاء	″	۴۵	الجاثیہ	″	۶۹	الحاقہ	″	۹۳	الضحیٰ	″
۲۲	الحج	مدنیہ	۴۶	الاحقاف	″	۷۰	المعارج	″	۹۴	الانشراح	″
۲۳	المومنون	مکیہ	۴۷	محمد	مدنیہ	۷۱	نوح	″	۹۵	التین	″
۲۴	النور	مدنیہ	۴۸	الفتح	″	۷۲	الجن	″	۹۶	اِقْراء (العلق)	″
۲۵	الفرقان	مکیہ	۴۹	الحجرات	″	۷۳	المزمّل	″	۹۷	القدر	″
۲۶	الشعراء	″	۵۰	ق	مکیہ	۷۴	المدثر	″	۹۸	البیّنہ	مدنیہ
۲۷	النمل	″	۵۱	الذاریات	″	۷۵	القیامہ	″	۹۹	اذا زلزلت	″
۲۸	القصص	″	۵۲	الطور	″	۷۶	الدہر	مدنیہ	۱۰۰	العادیات	مکیہ
۲۹	العنکبوت	″	۵۳	النجم	″	۷۷	المرسلات	مکیہ	۱۰۱	القارعہ	″
۳۰	الروم	″	۵۴	القمر	″	۷۸	النباء	″	۱۰۲	التکاثر	″
۳۱	لقمان	″	۵۵	الرحمٰن	مدنیہ	۷۹	النازعات	″	۱۰۳	العصر	″
۳۲	السجدہ	″	۵۶	الواقعہ	مکیہ	۸۰	عبس	″	۱۰۴	الہمزہ	″
۳۳	الاحزاب	مدنیہ	۵۷	الحدید	مدنیہ	۸۱	تکویر	″	۱۰۵	الفیل	″
۳۴	سبا	مکیہ	۵۸	المجادلہ	″	۸۲	الانفطار	″	۱۰۶	لایلاف	″
۳۵	فاطر	″	۵۹	الحشر	″	۸۳	المطففین	″	۱۰۷	الماعون	″
۳۶	یٰس	″	۶۰	الممتحنہ	″	۸۴	الانشقاق	″	۱۰۸	الکوثر	″
۳۷	الصافات	″	۶۱	الصف	″	۸۵	البروج	″	۱۰۹	الکافرون	″
۳۸	ص	″	۶۲	الجمعہ	″	۸۶	الطارق	″	۱۱۰	النصر	مدنیہ
۳۹	الزمر	″	۶۳	المنافقون	″	۸۷	الاعلیٰ	″	۱۱۱	اللّٰہب	مکیہ
۴۰	المومن	″	۶۴	التغابن	″	۸۸	الغاشیہ	″	۱۱۲	الاخلاص	″

نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی	نمبر	نام سورہ	مکی یا مدنی
۱۱۳	الفلق	مکیہ	۱۱۴	الناس	مکیہ

روایت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ سورہ الدھر مدنی ہے اور موجودہ قرآنوں میں بھی اس کو مدنی کہا گیا ہے اور علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں سورتوں کی ترتیب نقل کرنے کے بعد اس میں نظر کا اظہار کیا ہے ۔ تاکہ اس کو ناقابل اعتماد قرار دیا جائے لیکن اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری روایت صحیحہ پیش نہیں کر سکا اور اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے عملی طور پر دبے انداز میں اس کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہو گیا ہے ہم نے تفسیر ہذا کی جلد ۱۴ میں سورہ دھر کی تفسیر کے ذیل میں مکی و مدنی سورتوں کی ترتیب نقل کی ہے ۔ بہرکیف آل محمدؐ کے فضائل کو گھٹانے یا دبانے یا مٹانے کے لئے روز اول سے حاسدانہ زبان و قلم کو استعمال کرنے کی سعی لاحاصل جاری ہے لیکن ؟

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ... پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

احراقِ قرآن کا مسئلہ

یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت عثمان نے باقی ماندہ قرآنوں کو جلا دینے کا حکم صادر فرمایا ۔ اس مقام پر مرزا حیرت دہلوی نے ترجمہ صحیح بخاری میں حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے کیونکہ بخاری کے الفاظ یہ ہیں وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق یعنی حضرت حفصہ کی طرف سے آئے ہوئے صحیفوں پر جس قدر قرآن درج تھا اس کو متعدد مصاحف میں نقل کروا لینے کے بعد وہ صحیفے تو حضرت حفصہ کو واپس بھیج دیئے لیکن اس قرآن کے علاوہ جس قدر قرآن دوسرے صحیفوں میں مرقوم تھا اس کو جلا دینے کا حکم دے دیا ۔ یہ فرق یاد رہے کہ باقی صحیفوں کو نہیں جلایا ۔ بلکہ ان صحیفوں میں جس قدر قرآن ماسوا اس قرآن کے تھا جو حضرت حفصہ کے صحیفوں سے نقل کیا گیا تھا ۔ اس کو جلانے کا حکم دیا بخاری کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے ۔

فارسل الی حفصۃ ان ارسلی الینا الصحف ننسخھا فی المصاحف ثم نردھا الیک فارسلت بھا حفصۃ الی عثمان فامر زید بن ثابت وعبداللہ بن زبیر و سعید بن العاص

پس حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ اپنے صحیفے بھیج دو تاہم ان کو اور مصاحف میں نقل کر لیں پھر اصل تمہیں واپس بھیج دیں گے ۔ حضرت حفصہ نے وہ حضرت عثمان کی طرف بھیج دیئے ۔ پس انہوں نے زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن

وعبدالرحمٰن بن الحارث بن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان للرهط القرشيين الثلاثه اذا اختلفتم انتم وزيد بن ثابت فی شیء من القرآن فاكتبوه بلسان قريش فانه انما نزل بلسانهم ففعلوا حتى اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصة وارسل الی كل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواه من القرآن فی كل صحيفة او مصحف ان يحرق۔

بن حارث بن ہشام کو حکم دیا کہ نقل کر لیں، پس انہوں نے متعدد نسخے لکھ لئے اور حضرت عثمان نے تینوں قریشیوں کو کہدیا کہ جب تمہارا اور زید کا قرأت میں سے کسی بات پہ اختلاف ہو جائے تو قریش کی لغت میں لکھنا کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہانتک کہ انہوں نے جب ان صحیفوں کو متعدد مصاحف میں لکھ لیا تو وہ صحیفے حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کو واپس بھیج دیئے اور ہر طرف انہی نقل شدہ مصاحف میں سے ایک ایک نسخہ بھیج دیا اور اس کے ماسوا جس قدر قرآن دیگر صحیفوں میں یا کسی اور مصحف میں تھا، اس کو جلانے کا حکم دے دیا۔

اس عبارت کا صاف طور پر یہ مطلب ہے کہ حضرت حفصہ کے پاس سے آئے ہوئے صحیفوں میں جس قدر قرآن تھا۔ صرف وہی متعدد مصاحف میں نقل کر لیا گیا اور باقی ماندہ صحیفوں میں اس کے ماسوا جس قدر قرآن تھا، سب کو جلا دیا گیا۔ باقی صحیفوں کو نہیں بلکہ ان میں جو قرآن حضرت حفصہ کے صحیفوں میں لکھے ہوئے قرآن کے علاوہ اور ماسوا تھا صرف اسی کو جلانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن مرزا حیرت مترجم بخاری نے اس آخری ٹکڑے کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ (پہلے پہلے کے جو قرآنی مسودات تھے سب کو جلا دینے کا حکم فرما دیا۔ صہ پر ملاحظہ ہو

مسودہ تو اس رف خاکہ کو کہا جاتا ہے جو دوسرے اصلی مقام پر نقل کر لینے کے بعد بے کار قرار دیا جائے اس لحاظ سے تو حضرت حفصہ کے صحیفے ہی مسودات سے تعبیر کئے جا سکتے ہیں لیکن انکو نہیں جلایا گیا۔ اور اسی طرح مسودہ سے تعبیر کیا جائیگا جس کو نقل کئے بغیر تلف کر دیا گیا ہو۔ البتہ اپنے تیار شدہ مضامین میں یہ گنجائش ہوا کرتی ہے کہ اس کی کاٹ چھانٹ کی جائے زائد رف کو ترک کر دیا جائے اور ناقص رف کی کمی کو پورا کر دیا جائے لیکن کلام اللہ تو اس قسم کا مسودہ نہیں تھا جس کی کاٹ چھانٹ کا اختیار کسی جامع قرآن کے ہاتھ میں ہوتا اگر ایسا تھا تو جناب رسالتمآبؐ خود بنفس نفیس اس کام کو سر انجام فرما کے جاتے وہ تو پوری امت کو تاکیدی حکم فرما گئے تھے کہ اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک اہل بیت دوسرے قرآن مجید اگر قرآنی مسودات میں جلائے جانے کے قابل کوئی رف زیادتی ہوتی تو اس کو حضور خود ہی تلف کر جاتے اور ہمیں اس سے تمسک کا حکم ہرگز نہ فرماتے۔

مترجم بخاری نے جلائے جانے والے قرآن کو مسودات سے تعبیر کر لیا لیکن جلال الدین سیوطی نے "الاتقان" ج آداب کتابت کے بیان کے اخیر میں یہ تاویل پیدا کر لی کہ اَحْرَقَ مَصَاحِفَ كَانَ فِیْهَا آیَاتٌ وَّقِرَاءَاتٌ مَنْسُوْخَةٌ

یعنی حضرت عثمان نے صرف وہ مصحف جلائے جن میں منسوخ آیتیں اور قرأتیں تھیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس قدر قرآن کو جمع یا نقل کرا کے اطراف مملکت میں روانہ کیا ان میں تو کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو چکی ہو۔ کتب تفسیر و آثار سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اس موجودہ قرآن میں بھی بہت سی آیات ایسی ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں۔

ناسخ و منسوخ

سیوطی نے الاتقان میں ناسخ و منسوخ کے باب میں لکھا ہے قال الآئمة لا یجوز لاحد ان یفسر کتاب الله - الا بعد ان یعرف منه الناسخ والمنسوخ - یعنی آئمہ نے کہا ہے کہ کسی شخص کے لئے قرآن مجید کی تفسیر کرنا جائز نہیں جب تک اس میں سے ناسخ و منسوخ کا علم نہ رکھتا ہو۔ چنانچہ اس کے بعد منسوخ آیات پر ایک طویل بحث کرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ میرے نزدیک کل منسوخ آیات کی تعداد بیس ہے جو اس موجودہ قرآن میں ہیں اور ان کو میں ایک نظم میں پیش کرتا ہوں۔

وقد اکثر الناس فی المنسوخ من عدد — وادخلوا فیه آیا لیس تنحصر

لوگوں نے منسوخ آیات کی بڑی تعداد بیان کی ہے — اور انہیں بہت کافی آیات داخل کر دی ہیں جو شمار سے باہر ہیں

وهاک تحریر آی لا مزید لها — عشرین حررها الحذاق والکبر

یہ لو بغیر کسی زیادتی کے آیاتِ منسوخہ کی تعداد — بیس ہے جس کو ماہرین بزرگواروں نے تحریر کیا ہے

آی التوجه[1] حیث المرء کان وان[2] — یوصی لاهلیه عند الموت محتضر

نماز کے وقت قبلہ کی طرف منہ پھیرنے کی آیات اور — بوقت احتضار مرنے والے کو وصیت کے حکم والی آیت

وحرمة[3] الاکل بعد النوم مع رفث — وفدیة[4] لمطیق الصوم مشتهر

[1] اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، جس طرف منہ کر لو اسی طرف ذاتِ خدا موجود ہے یہ منسوخ ہے اس آیت سے کہ فرمایا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اپنے منہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو [2] کُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (الآیۃ) تمہارے اوپر فرض ہے کہ مرنے کے وقت اپنے والدین اور اقرباء کے لئے وصیت کر جاؤ اس آیت کو وراثت والی آیت نے منسوخ کر دیا۔

[3] یہ حکم كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے مستفاد تھا کیونکہ پہلے جن امتوں پر روزے فرض تھے ان کے لئے رات کو سونے کے بعد کھانا پینا اور مجامعت ممنوع تھی۔ اب یہ آیتیں اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ ترجمہ تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے ہمبستری جائز ہے (الآیہ) اور كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمْ (الآیۃ) یعنی تم روزوں کی راتوں میں صبح کی سفیدی ظاہر ہونے تک کھا پی سکتے ہو، اس حکم کی ناسخ ہیں [4] وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ الآیۃ یعنی جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہیں یا یہ کہ مالی طاقت رکھتے ہیں ان کے لئے ہر روزہ کے لئے فدیہ دیدینا کافی ہے اور فدیہ دینے کی صورت میں ان پر روزہ معاف ہے اس کی ناسخ یہ آیت ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ یعنی جو شخص اسی ماہ میں حاضر ہو یعنی مسافر نہ ہو وہ روزہ ہی رکھے اس آیت نے واضح کر دیا کہ بیمار و مسافر کے علاوہ[4]

[4] ہر آدمی پر روزہ رکھنا واجب ہے اور فدیہ دینا کافی نہیں۔

ماہ رمضان میں سونے کے بعد کھانے پینے اور مجامعت کی منع — اور طاقت کے ہوتے ہوئے روزہ نہ رکھنا اور فدیہ دینا یہ دونو آیتیں

[۵] وحق تقواہ فی ما صح فی اشر — و فی الحرام[۶] قتال للاولی کفروا

اتقوا اللہ حق تقتہ یعنی اللہ سے ڈرو جسطرح ڈرنے کا حق ہے — اور ماہ حرام میں کافروں سے لڑنے کا حکم ۔ یہ دونو آئتیں

والاعتداد[۷] بحول مع وصیتہا[۸] — وان یبدان[۹] حدیث النفس والفکر

عورت کا سال تک عدت میں بیٹھنا اور اس کی وصیت — اور دل والی باتوں کا حساب لیا جانا ۔ یہ دونو آیتیں

والحلف[۱۰] والحبس[۱۱] للزانی وترك[۱۲] اولی — کفروا واشہادہم[۱۳] والصبر[۱۴] وا والنفر[۱۵]

[۱۰] حلف والی آیت زانی کے حبس کرنے والی آیت اور کفار کو چھوڑ دینے — [۱۲] کے حکم والی اور انکی شہادت کی قبولیت اور صبر فی الجہاد اور عمومی حکم جہاد

ومنع عقد الزانی اوالزانیۃ — وما علی المصطفٰی فی العقد محتظر

زانی اور زانیہ کے عقد کی ممنوعیت — اور وہ جو رسالتمآبؐ پر حکم منع تھا (عقد کے متعلق)

ودفع[۱۸] مہر لمن جاءت وایۃ[۱۹] نجوا — کذالك[۲۰] قیام اللیل مستطر

کفار سے آئی ہوئی عورتوں کے مہر اور آیت نجوی میں صدقہ — اور جناب رسالتمآبؐ کا عبادت کے لئے رات کا قیام

---

[۵] اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ یعنی اللہ سے ڈرو جس طرح تقویٰ کا حق ہے ۔ اس حکم کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا کہ فرمایا ۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جتنا کر سکتے ہو [۶] یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْہِ الایہ یعنی تم سے لوگ ماہ حرام میں لڑائی کے متعلق سوال کرتے ہیں تو ان کو جواب دیجئے کہ حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنا گناہ کبیرہ ہے اس حکم کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا چنانچہ فرماتا ہے قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً یعنی تمام مشرکوں سے لڑائی کرو [۷] جس عورت کا شوہر فوت ہو جاتا ہے اس کے لئے عدت ایک سال تھی وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ تا مَتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ یعنی جو لوگ مر جاتے ہیں ان کی عورتیں سال بھر تک انتظار کریں اور اپنے مرنے والے شوہر کے سوگ میں وقت گذاریں ۔ اب اس آیت کے حکم کو چار ماہ دس دن کی عدت بتانے والی آیت نے منسوخ کر دیا ۔ [۸] مطلقہ کے لئے مالی وصیت کا حکم وراثت والی آیت سے منسوخ ہے [۹] اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (دل کی بات ظاہر کرو یا چھپائے رکھو خدا ان سب کا حساب لے گا یہ آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا خدا وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا کی آیت سے منسوخ ہے [۱۰] وَالَّذِیْنَ عَاقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ جو لوگ تمہارے ساتھ ہم قسم ہیں ان کو اپنا حصہ دو یہ ایک دستور جاہلی تھا کہ ہم قسم لوگ ایک دوسرے کی وراثت سے حصہ لیا کرتے تھے قرآن مجید میں پہلے اس کی اجازت تھی اور بعد میں اولوا الارحام والی آیت سے یہ حکم منسوخ ہوا [۱۱] زانی کے حبس کرنے والی آیت حکم رجم سے منسوخ ہوئی [۱۲] ولا الشہر الحرام والی آیت اباحتِ قتال سے منسوخ ہو گئی [۱۳] آخَرَانِ مِنْ غَیْرِکُمْ (دو گواہ غیر مسلم لے لو) وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ (دو مسلم عادل گواہ قائم کرو) سے منسوخ ہو گئی [۱۴] تم میں سے بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ میں صبر کر کے اور جم کر لڑیں یہ آیت اس کے بعد والی آیت سے منسوخ ہو گئی [۱۵] اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا جہاد کیلئے چلو خواہ تندرست ہو یا بیمار یہ لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ والی آیت سے منسوخ ہو گئی [۱۶] وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ والی آیت سے منسوخ ہے [۱۷] لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْۢ بَعْدُ

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۴۵ پر)

و زبد آیۃ الاستیذان[۱۱] من ملکت   و آیۃ للقسمۃ[۱۲] الفضلی لمن حضروا
غلاموں کا نکاح میں اجازتِ آقا کا محتاج ہونا (بعض نے منسوخ کہا ہے)   اور حاضرین پر پست مال کی تقسیم کا حکم (اسکو بھی بعضوں نے منسوخ کہا ہے)

یہ فہرست ہے ان آیات کی جن کو منسوخ قرار دیا گیا ہے اور آیات اب تک قرآن میں موجود ہیں ان میں سے بعض کے منسوخ ہونے میں اختلاف بھی ہے چنانچہ آخری دو نو علامہ سیوطی کے نزدیک منسوخ نہیں ہیں بلکہ محکم ہیں۔ الاتقان ص۲۳ ج۲

بتائیے جب جامع القرآن نے آیات منسوخہ کو جلا دیا تھا تو یہ آیات کیوں بچائی گئیں؟ اگر آیات منسوخہ کو جلانا ضروری تھا تو ان کا بچانا کیسے جائز ہوا اور اگر ناجائز تھا تو ان کو کیوں جلایا گیا؟ شائد حضرت عثمان کے قرآن جلانے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے یہ آیات خیال شریف سے اتر گئیں۔ بہرکیف خواہ بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی جائے یا آیاتِ منسوخہ کا بہانہ بنایا جائے واقعات و حقائق پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا رہی اس بارہ میں آگے جانے کی ضرورت نہیں ارباب دانش اپنے ذوق سلیم سے یہ معمہ حل کر سکتے ہیں۔

ثقلین (قرآن اور عترتِ طاہرہ) سے امت کا سلوک

جناب رسالتمآب نے ثقلین کے ساتھ تمسک پکڑنے کا انتہائی تاکید کے ساتھ جو حکم فرمایا تھا۔ اہل اسلام نے اس پر خوب عمل کیا۔ قرآن مجید کا جو حشر ہوا اسے گذشتہ عنوان میں بیان کر دیا گیا ہے اور عترتِ طاہرہ کے ساتھ تمسک کا جو حال ہوا۔ وہ سرکار رسالت کی اکلوتی شہزادی خاتونِ دوجہاں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی حالت زار سے صاف ظاہر ہے۔ صحیح بخاری کتاب الخمس میں حضرت عائشہ روایت فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ نے رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر سے رسول اللہ کے مال فئی سے بچے ہوئے مال کی وراثت کا سوال کیا تو حضرت ابوبکر نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہمارا کوئی وارث نہیں ہم جو کچھ چھوڑ کر جائیں وہ صدقہ ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد بخاری شریف کے الفاظ بعینہٖ یہ ہیں۔

فَغَضِبَتْ فَاطِمَۃُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰہِ فَھَجَرَتْ اَبَا بَکْرٍ فَلَمْ تَزَلْ مُھَاجِرَتَہٗ حَتّٰی تُوُفِّیَتْ

پس فاطمہ بنت رسول اللہ ناراض ہو گئیں اور ابوبکر سے بائیکاٹ (قطع تعلق یا قطع کلامی) کر لی اور ہمیشہ اس سے بائیکاٹ میں رہیں یہاں

اُوپر عورتیں حلال نہیں یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ اس آیت سے انا احللنا لک ازواجک تیری زوجات ہم نے تیرے لئے حلال کی ہیں[۱۰] یہ آیت غنیمت کے ساتھ منسوخ ہو گئی[۱۱] اس کے بعد والی آیت اس کی ناسخ ہے[۱۲] سورت کا آخر اس کا ناسخ ہے۔
[۱۱][۱۲] استیذان اور قسمت والی آیت علامہ سیوطی کے نزدیک منسوخات سے نہیں ہیں۔

وَعَاشَتْ بَعْدَ رَسُولِ اللّٰہِ سِتَّۃَ اَشْھُرٍ (الحدیث) تک کہ وفات پاگئیں اور رسول اللہؐ کے بعد کُل چھ مہینے زندہ رہیں (الحدیث)

مترجم بخاری نے غَضِبَتْ کا معنی کیا ہے (ناخوش ہوگئیں) کیونکہ ناخوشی کی لفظ عام طور پر بیماری کے معنی میں ہوتی ہے مترجم نے ناراضگی کو چھپانے کیلئے یہ لفظ رکھ لی تاکہ صرف اُردو پڑھنے سمجھنے والا یہ سمجھتا رہے کہ اس فیصلہ کے بعد بی بی ناخوش ہوگئیں (بیمار ہوگئیں) اور پھر باہمی مکالمہ کا موقعہ ہی نہ رہا اور اسی اثنا میں ان کی رحلت ہوگئی۔ ترجمہ سے عوام کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن بخاری کے اصل الفاظ کو بدلنا قدرے مشکل ہے۔ غضبت کی صاف و صریح لفظ بتلاتی ہے کہ بی بی اتنی سخت ناراض ہوگئیں کہ مرتے دم تک ان سے دوبارہ کلام کرنا روانہ رکھا۔

نیز بخاری شریف کے باب غزوہ خیبر میں اس سے بھی زیادہ وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ ہی سے روایت ہے

فابی ابوبکر ان یدفع الی فاطمۃ منہا شیئًا فوجدت فاطمۃ علی ابی بکر فی ذلك فھجرتہ فلم تکلمہ حتی توفیت وعاشت بعد النبیؐ ستۃ اشھر فلما توفیت دفنہا زوجہا علی لیلًا ولم یؤذن بہا ابابکر وصلی علیہا وکان لعلی من الناس وجہ حیاۃ فاطمۃ فلما توفیت استنکر علی وجوہ الناس

پس ابوبکر نے فاطمہؓ کو اس میں سے کچھ بھی دینے سے صاف انکار کردیا چنانچہ فاطمہ ابوبکر پر اس بات سے ناراض ہوگئیں پس ان سے قطعاً کلام کرنا بھی ترک کردیا اور بائیکاٹ کرلی یہانتک کہ ان کی وفات ہوگئی اور کل چھ ماہ نبی علیہ السلام کے بعد زندہ رہیں۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے شوہر حضرت علیؑ نے ان کو رات کے وقت دفن کیا اور ابوبکر کو شمولیت کی اجازت نہ دی اور نماز جنازہ بھی خود ہی پڑھی اور حضرت فاطمہؑ کی زندگی میں لوگوں کے درمیان حضرت علیؑ کی آبرو تھی جب اُن کی وفات ہوئی تو علیؑ[۱] سے لوگوں کے رُخ پھر گئے۔

مترجم بخاری اردو ترجمہ میں حدیث نمبر ۱۲۷۶ حاشیہ پر یوں رقمطراز ہیں۔

حضرت فاطمہ کا دعویٰ بربنائے وراثت تھا ان کو یہ حدیث معلوم نہ تھی کہ انبیاؑ کا قبضہ مالکانہ نہیں ہے نہ وہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ان کا کوئی وارث ہوسکتا ہے اس میں کچھ عجب نہیں ہے کہ فاطمہؑ زہرا کو اس حدیث سے واقفیت نہ تھی، بہت سے امور خانہ داری کے بارے میں جو ازواج کو علم تھا غیر کو نہ تھا پس حضرت فاطمہؑ کو جب اس کا اطمینان ہوگیا تو حضرت ابوبکر صدیق سے راضی ہوگئی تھیں اور محض بلاوجہ کا فی ناراض ہونا کوئی موجب نقصان نہیں ہے۔

اب ذرا بخاری شریف سے جناب فاطمہ زہراؑ کی منزلت ملاحظہ ہو۔ باب مناقب قرابت رسولؐ میں ہے۔

قَالَ النبیؐ فاطمۃ سیدۃ نساءِ اھل الجنۃ وعن المسورؓ مخرمہ ان رسول اللّٰہ قال فاطمۃ بضعۃ منی فمن اغضبھا اغضبنی

فاطمہؑ جنت میں جانے والی عورتوں کی سردار ہے مسور بن مخرمہ سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا۔ فاطمہؑ میرا پارہ گوشت ہے جو اسے غصہ دلائے گا۔ اس نے مجھے غصہ دلایا۔

---

[۱] حضرت علیؑ کے ساتھ امتِ رسول کا سلوک دیکھئے اور پھر ان کے شیر و شکر ہونیکا جائزہ لیجئے۔ ...... (منہ)

باب مناقب فاطمہؓ میں مرزا حیرت نے اسی کا ترجمہ یوں کیا ہے فاطمہؓ میرا پارہ گوشت ہے جس نے اسے رنجیدہ کیا اس نے مجھے رنجیدہ کیا
اور فاطمہ سیدۃ نساء اہل الجنۃ والی حدیث کو مرزا حیرت نے اپنے ترجمہ میں بالکل حذف کر دیا ہے نہایت حیرت وافسوس
کا مقام ہے کہ مسلمانوں کو۔ فاطمہؓ کو جہالت کی طرف منسوب کرنے میں ذرہ بھر جھجک محسوس نہیں ہوتی اور عذر یہ ہے کہ (اس
میں کچھ عیب نہیں کہ فاطمہ زہرا کو اس حدیث سے واقفیت نہ تھی بہت سے امور خانہ داری کے بارہ میں جو ازواج کو علم تھا
غیر کو نہ تھا) عجیب الٹی منطق لڑائی، مثال تو درست دی لیکن نتیجہ الٹا اخذ کیا جن لوگوں کا بعض خاص امور سے خاص تعلق
ہوا کرتا ہے ان کے متعلقہ مسائل میں ان کو ہی زیادہ واقفیت حاصل ہوتی ہے امور خانہ داری کا تعلق ازواج سے ہے لہذا
آنحضرتؐ نے ازواج کی ان کے متعلقہ مسائل میں رہبری فرمائی نہ ان مسائل کا دیگر صحابہ سے تعلق تھا نہ ان کے سامنے بیان ہوئے
بلکہ بعض شوہر و بیوی کے درمیان خصوصی مسائل کو صرف بیوی تک محدود رکھا جاتا ہے پھر دوسری عورتوں تک پہنچانا ان کا کام ہوا کرتا ہے
اس مقام پہ یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ اگر جناب رسالتمآبؐ نے انبیاء کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کی بنا پہ اپنی لڑکی کو محروم کرنا
تھا تو اس مسئلہ کا تعلق تو حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ سے ہی تھا۔ لہذا ان دونوں کو پہلے سمجھا دیا ہوتا تاکہ آئندہ والے اختلافات
اور رنجشوں کا سدباب ہو جاتا۔ سابقہ مثال میں عقلمندی سے بعید ہے کہ مسئلہ کا تعلق امور خانہ داری سے ہو اور زوجات کو نہ سمجھایا
جائے اسی طرح بعینہٖ یہاں بھی بعید از عقل ہے کہ مسئلہ کا تعلق وراثت سے ہو اور سمجھایا جائے غیر وارثوں کو۔

جس بی بی کو اہل جنت کی عورتوں کا سردار فرما رہے تھے یا اپنے پارہ گوشت سے تعبیر فرما رہے تھے اگر آپ ان کو فرما دیتے
تو یقیناً وہ سر تسلیم خم کر لیتیں اور حضرت علیؑ بھی آنحضرتؐ کی وصیت کی ذرہ بھر خلاف ورزی نہ کرتے پھر اگر کسی مصلحت کی بنا پر
وارثوں کو بتانا مناسب نہ سمجھا اور صحابہ کے بتا دینے پر اکتفا کر لیا تو جس شخص کو (بقول آپ کے) رسولؐ نے صدیق کا لقب دیا
ہوا تھا اس کی نقل پہ بی بی کو اطمینان کیوں نہ ہوا؟ اور مرتے دم تک ناراض کیوں رہیں؟

نیز عائشہ تو یہ فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہؑ نے مرتے دم تک حضرت ابوبکر سے کلام نہ کی (ناراض ہی رہیں) اور مرزا حیرت
فرماتے ہیں کہ اطمینان ہو جانے کے بعد راضی ہو گئیں یہ فیصلہ خود فرما لیجئے کہ حضرت عائشہ سچ فرماتی ہیں یا آپ سچ فرما رہے ہیں؟

نیز یہ بات بھی غور طلب ہے کہ آیا خبر واحد آیات قرآنیہ کی ناسخ ہو سکتی ہیں؟ قرآن میں وراثت کا اولاد کے لئے ہونا
بالعموم ثابت ہے حتیٰ کہ انبیاء کی وراثت کا تذکرہ بھی قرآن میں موجود ہے

وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ۔ حضرت سلیمان حضرت داؤد کے وارث تھے حضرت ذکریا نے طلب فرزند کے لئے دعا کی تو
"یَّرِثُنِیْ" کے لفظ کی تصریح کی۔ یعنی میرے اللہ مجھے وہ فرزند عطا کر جو میرا وارث ہو۔ جب قرآن مجید میں وراثت
کا قانون بالعموم تمام افراد انسانی پر حاوی ہے تو خبر واحد نے اس حکم کی تردید کیوں کر دی؟

نیز مرزا حیرت فرماتے ہیں کہ ان کا بلاوجہ کافی ناراض ہونا موجب نقصان نہیں ادھر رسولؐ فرماتے ہیں جس نے فاطمہ
کو رنجیدہ کیا۔ اس نے مجھے رنجیدہ کیا جو اسے غصہ دلائے گا اس نے مجھے غصہ دلایا۔ لفظیں سب روایات میں غضبت

کی ہیں خواہ ترجمہ میں رنجیدگی یا غصہ یا ناراضگی جو بھی مراد لیا جائے تو ان احادیث کی رُو سے معلوم ہوا کہ بی بی کی ناراضگی رسولؐ کی ناراضگی کی موجب ہے آپ کا یہ فرمانا کہ بی بی کی کافی ناراضگی نقصان دہ نہیں۔ اس کا یہی مطلب ہوا کہ رسولؐ کی کافی ناراضگی بھی موجب نقصان نہیں (العیاذ باللہ)

ایک طرف حضرت عائشہ کے قول کی تردید وہ فرماتی ہیں کہ بی بی مرتے دم تک راضی نہ ہوئیں اور آپ فرماتے ہیں کہ اطمینان ہو جانے پر راضی ہو گئیں اور دوسری طرف حضرت فاطمہؑ پر اتہام اور تیسرے (فاطمہ کی ناراضگی جو رسولؐ کی ناراضگی کو مستلزم ہے) کو غیر موجب نقصان کہہ کر۔ کہاں سے کہاں چلے گئے۔ اپنے گریبان میں نظر ڈالئے؟

بالجملہ:۔ قرآن کو جلانا اور عترت کو رلانا حدیث ثقلین پر عمل کرنے کا نتیجہ رہا۔

شیعوں پر بہت الزام اور اتہام بلکہ بہتان عظیم ہے کہ شیعہ صحابہ کرام کو اچھا نہیں مانتے حالانکہ شیعہ مذہب کی رُو سے صحابہ رسول کی عزت کرنا اور نقش قدم پر چلنا واجب ہے جس کے دل میں صحابہ کی عزت نہیں گویا اس کے دل میں جناب رسالتمآبؐ کی فرمائشات کی وقعت نہیں لیکن صحابہ وہ جو جناب رسالتمآبؐ کے فرمانبردار اور عترت رسول کے قدر دان تھے۔ یعنی جن کا قرآن اور آل رسول دونوں سے تمسک تھا جن پر خدا و رسول بھی راضی اور عترت طاہرہ بھی خوشنود تھی پس ہم ان کی غلامی کو فخر اور ان کی محبت کو ایمان سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ آثار و واقعات کی روشنی میں ہم صحابہ رسول میں یکسانیت کے قائل نہیں۔ رسولؐ اور آل رسولؐ کے دوست کو دوست سمجھتے ہیں اور ان کے دشمن سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں اور بس۔

یہ دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے کہ جناب رسولخداؐ کے تمام صحابی یکساں طور پر مومن اور واجب الاتباع تھے۔ ذرا صحیح بخاری اور دیگر کتب احادیث و سیر کا مطالعہ فرمایئے یہ چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ بہت سے صحابہ ایسے تھے جو جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے۔

بخاری شریف کتاب المغازی باب غزوہ حدیبیہ

عن العلاء بن المسیب عن ابیہ قال لقیت البراء بن عازبؓ فقلت طوبیٰ لک صحبت النبیؐ وبایعت تحت الشجرۃ فقال یا ابن اخی انک لا تدری ما احدثنا بعدہ

وفی تفسیر سورۃ المائدہ عن ابن عباسؓ فی حدیث عن رسول اللہؐ ان اول الخلائق ابراھیم یکسیٰ یوم القیامۃ الا وانہ یجاء

ترجمہ مرزا حیرت دہلوی جلد۲۔ حدیث نمبر ۱۳۱۶

علاء بن مسیب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں میں نے براء بن عازب سے مل کر کہا تم کو مبارک ہو کہ تم رسولخداؐ کی صحبت میں رہے اور آنحضرت سے درخت کے نیچے بیعت کی (از راہ عجز و انکساری) انہوں نے جواب دیا اے بھتیجے تمہیں نہیں معلوم ہم نے رسولخداؐ کے بعد کیا کیا خرابیاں کی ہیں۔

ترجمہ:۔ حدیث نمبر ۱۷۲۸۔ ابن عباسؓ سے اسی حدیث کے ذیل میں ہے کہ آپ نے فرمایا سب سے پہلے ابراہیم کو کپڑے پہنائے جائیں گے اور ہوشیار ہو کہ چند آدمی میری امت کے لائے جائیں گے اور فرشتے

رجال من امتی فیؤخذ بھم ذات
الشمال فاقول یارب اصیحابی فیقال انک
لاتدری ما احدثوا بعدک (الی ان قال)
فیقال ان ھؤلاء لم یزالوا مرتدین
وفیہ فی کتاب الفتن عن ابی وائل قال
قال عبد اللہ قال النبیؐ انا فرطکم علی
الحوض لیرفعن الیّ رجال منکم حتی اذا
ھویت لاناولھم اختلجوا دونی فاقول
ای ربّ اصحابی فیقول لاتدری ما
احدثوا بعدک۔

ان کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے اس وقت میں کہوں گا۔ اے رب
یہ تو میرے صحابی ہیں (اللہ کی جانب سے) ندا آئے گی تو نہیں جانتا انہوں نے
تیرے بعد کیا کیا کیا۔ یہانتک کہ فرمایا" پھر اللہ کی جانب سے ندا ہوگی
کہ یہ لوگ تیرے (محمدؐ کے) جدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے۔
ترجمہ بخاری مرزا حیرت ج۲ حدیث نمبر ۱۹۲۲۔ عبداللہ (بن مسعود)
سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں حوض (کوثر پر)
تمہارا پیش خیمہ ہوں گا اور تم میں سے چند لوگ میرے پاس لائے جائیں
گے۔ یہانتک کہ جب میں ان کو (کوثر کا پیالہ) دینا چاہوں گا تو وہ لوگ
میرے پاس سے کھینچ لئے جائیں گے میں عرض کروں گا کہ اے میرے
پروردگار (یہ لوگ تو) میرے اصحاب ہیں۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا۔ تم نہیں جانتے
ہو کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا بدعتیں کی ہیں۔

پہلی حدیث کے ترجمہ میں تو مترجم نے صحابہ سے معیار ہلکا کرنے کی خاطر بریکٹ دے کر عجز و انکساری کی راہ نکال لی
لیکن پچھلی دو حدیثوں میں یہ راہ پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ نہ ان کو دوزخ میں لے جایا جانا ان کی انکساری ہے اور نہ ان کے مرتد ہونے
میں عجز و انکساری کی راہ پیدا ہو سکتی ہے۔ اور نہ ان کا حوضِ کوثر سے کھینچ لیا جانا ازراہِ انکساری تھا۔

موطا امام مالک۔ باب الشہداء جناب رسالتمآبؐ نے شہداء احد کی تعریف کی۔ تو حضرت ابوبکر نے عرض کی۔ کہ ہم نے
بھی جہاد کیا اور ان لوگوں کے ساتھ شریک رہے تو آپ نے فرمایا تمہیں کیا معلوم میرے بعد کیا کیا بدعتیں کرو گے

پس جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے بعد جو صحابہ کرام آنحضورؐ کی تعلیمات پر ثابت قدم رہے ان کی خاک پا ہمارے
لئے سرمۂ چشم اور احادیث بخاری و سیر و احادیث کی روایات کے پیشِ نظر جو جو لوگ ثابت قدم نہ رہ سکے۔ ہم ان سے
بیزار ہیں ہمیں یہ تعین کرنے کی ضرورت نہیں کہ کون ثابت قدم رہے اور کون بخاری کی سابقہ حدیث کے پیشِ نظر مرتد ہو گئے۔
فرمانِ نبوی موجود۔ حدیث ثقلین موجود۔ قرآن و اہلبیت موجود۔ کتب حدیث و سیر موجود۔ تاریخی حقائق و واقعات موجود صحاح ستہ
موجود عقل و دماغ موجود، **بشرطیکہ** تعصب و عناد اور جنبہ داری مفقود ہو اور انصاف موجود ہو تو ہر صاحب دانش سوچ
سمجھ کر فیصلہ پہ پہنچ سکتا ہے۔ کسی صاحب اقتدار کے بڑے نام سے مرعوب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

صحابہ کرام میں علم قرآن

اس باب میں ہم اہل سنت کے مشہور مفسر و محدث علامہ جلال الدین سیوطی کی تحقیق انیق پیش کرکے ان کے انصاف کش رویہ اور عدل سوز فیصلہ کو منظر عام پر لاکر حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ چنانچہ الاتقان فی علوم القرآن کی دوسری جلد طبقات المفسرین کے بیان میں رقم طراز ہیں۔

اشتهر بالتفسير من الصحابة عشرة الخلفاء الاربعة وابن مسعود وابن عباس وابی بن کعب وزید بن ثابت و ابو موسیٰ الاشعری وعبدالله بن الزبیر - اما الخلفاء فاكثر ما روی عنه منهم علی بن ابی طالب والرواية عن الثلاثة نزرة جدا وكان السبب فی ذلك تقدم وفاتهم كما ان ذلك هو السبب فی قلة رواية ابی بکر رضی الله عنه للحديث ولا احفظ عن ابی بکر رضی الله عنه فی التفسير الا آثارا قليلة جدا لاتكاد تجاوز العشرة واما علی فروی عنه الكثير وقد روی معمر عن وهب بن عبدالله عن ابی الطفيل قال شهدت عليا يخطب وهو يقول سَلُونِی فَوَاللهِ لَا تَسْأَلُونِی عَنْ شَیْءٍ اِلَّا اَخْبَرْتُكُمْ وَ سَلُونِی عَنْ كِتَابِ اللهِ فَوَاللهِ مَا مِنْ آيَةٍ اِلَّا وَ اَنَا اَعْلَمُ اَبِلَيْلٍ نَزَلَتْ اَمْ بِنَهَارٍ اَمْ فِی سَهْلٍ اَمْ فِی جَبَلٍ

صحابہ میں سے مشہور مفسر قرآن دس آدمی ہیں خلفائے اربعہ اور (عبداللہ) بن مسعود، (عبداللہ) ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر۔ لیکن خلفاء پس ان میں سب سے زیادہ (تفسیر) علیؑ بن ابی طالب سے ہی مروی ہے اور پہلے تینوں سے (تفسیر قرآن) بہت کم مروی ہے۔ شاید ان کا پہلے وفات پا جانا ہی اس کا موجب ہو جس طرح کہ ابوبکر سے روایاتِ حدیث کا کم منقول ہونا اسی سبب سے تھا۔ اور مجھے تو ابوبکر سے تفسیر قرآن کے متعلق بہت کم روایات دستیاب ہو سکی ہیں۔ جن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں البتہ علیؑ سے اس بارہ میں زیادہ روایات لی گئی ہیں۔ چنانچہ معمر نے وہب بن عبداللہ سے انہوں نے ابوالطفیل سے روایت کی ہے کہ علیؑ کو ایک خطبہ میں فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ پوچھ لو مجھ سے خدا کی قسم مجھ سے تم جس چیز کا سوال کرو گے۔ بتاؤں گا اور مجھ سے قرآن شریف کے متعلق پوچھو پس اللہ کی قسم کوئی آیت ایسی نہیں جس کو میں نہ جانتا ہوں۔ خواہ رات میں اتری ہو یا دن میں زمین پر نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

واخرج ابو نعيم فی الحلية عن ابن مسعود قال ان القرآن انزل علی سبعة احرف ما

اور ابو نعیم نے حلیہ میں ابن مسعود سے نقل کیا ہے۔ کہ تحقیق قرآن سات حرفوں[1] پر اترا ہے۔ جن میں سے ہر حرف کا ظاہر بھی ہے

[1] حروف سے مراد قرأت یا قسم یا لغت ہے قرأتوں کے بیان میں تحقیق گذر چکی ہے (منہ)

منها حرف الا وله ظهر وبطن وان علی
بن ابی طالب عنده منه الظاهر والباطن
واخرج ایضا من طریق ابی بکر بن عیاش
عن نصیر بن سلیمان الاحمسی عن ابیه
عن علی قال والله ما نزلت آیة الا وقد
علمت فیما انزلت واین انزلت ان
ربی وهب لی قلبا عقولا ولسانا سئولا

اور باطن بھی اور تحقیق علیؑ بن ابی طالب کے پاس اس کے ظاہر
و باطن سب کا علم موجود ہے۔
نیز ابو نعیم نے بطریق ابوبکر بن عیاش ۔ رجال سند کا ذکر کرتے ہوئے
حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا خدا کی قسم کوئی
آیت ایسی نہیں اتری جس کا مجھے علم نہ ہو کہ کس کے بارے میں اتری
اور کہاں اتری ۔ تحقیق میرے اللہ نے مجھے قلب فہیم اور
زبان گویا عطا فرمائی ہے۔

دعوت فکر

علامہ سیوطی نے جامعین قرآن، حضرات اصحاب ثلاثہ کو عالم قرآن ثابت کرنے کی سعی بلیغ میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن چونکہ واقعات و تاریخی حقائق اس کے موید نہ تھے بلکہ برعکس تھے تو عجیب منطق لڑانے کی سوجھی کہ ایک طرف تو عوام کالانعام کی آنکھوں میں دھول جھونک دی اور دوسری طرف دھیمی آواز میں حقیقت کے چہرے سے نقاب بھی الٹ دی۔

پہلے پہل بڑے زور و شور سے نعرہ لگا دیا کہ صحابہ میں سے مشہور مفسر قرآن دس آدمی تھے اور پہلے نمبر پر خلفائے اربعہ کا نام لے لیا۔ عوام بالکل مطمئن ہوگئے اور دل میں پختہ عقیدہ جما لیا کہ واقعی چاروں خلیفے مشہور مفسر قرآن تھے اور یہ چیز رسوخ میں ان کے دل و دماغ پر کالنقش علی الحجر ہوگئی کیونکہ عوام بیچاروں کا دستور ہے کہ جو بات مولوی صاحب نے کہہ دی انہوں نے فوراً تسلیم کر لی۔ انہیں دلیل طلب کرنے کی مزید ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مولوی صاحب کا فرمان ان کے لئے اٹل فیصلہ اور برہان قاطع ہوا کرتا ہے اور پھر بجائے عام مولوی کے علامہ اور وہ بھی سیوطی جیسا جسے نویں صدی کا مجدد بھی کہا جاتا ہو اگر بات کہہ دے تو عوام کے لئے ان کے قول سے بڑھ کر اور کون سی دلیل کی ضرورت باقی رہ رہ جاتی ہے لیکن پڑھا لکھا سنجیدہ طبقہ مولوی لوگوں کی اس قسم کی قلابازیوں میں مشکل سے پھنستا ہے۔ علامہ سیوطی کو محسوس ہونے لگا کہ عوام سے داد تحسین مرحبا واہ واہ کا صلہ حاصل کرنے کے لئے تو صرف پہلا فقرہ ہی کافی ہے کہ وہ مشہور مفسر قرآن تھے لیکن مبادا کوئی سمجھدار پڑھا لکھا آدمی اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے دلیل طلب کرے تو حقیقت چونکہ اس کے خلاف ہے جواب میں شرمساری ہوگی۔ لہذا دس آدمیوں کے نام گنوانے کے فوراً بعد کہہ دیا والروایة عن الثلاثة نزر جدا۔ کہ پہلے تینوں حضرات خلفاء سے تفسیر قرآن بہت کم مروی ہے۔

دروغ گو را حافظہ نباشد۔ پہلے کہہ دیا کہ مفسر مشہور تھے اور ایک منٹ کا وقفہ کئے بغیر بول اٹھے کہ ان سے آثار تفسیر بہت ہی کم منقول ہیں۔ علامہ کہلانے والے شخص سے اس قسم کی تضاد بیانی ایک اعجوبہ یا اضحوکہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے بعد ایک اور عذر دماغ میں سوجھا کہ کہیں یہ تضاد بیانی رفع ہو جائے لیکن بقولے عذر گناہ بدتر

ارشاد فرماتے ہیں شاید ان کی تقدم وفات ہی اس کا سبب ہے۔ یعنی تفسیر قرآن کے بیان کرنے کا ان کو موت نے موقعہ نہ دیا گویا وہ مشہور مفسرین کی فہرست میں شامل بھی رہے اور ان سے آثار تفسیر کا کم منقول ہونا بھی بلاوجہ نہیں۔

عالی جاہ! مان لیا کہ موت پہلے آگئی اور ان کی دل کی بات دل میں رہی لیکن کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو ان کے مشہور مفسر قرآن ہونے کا علم کیسے ہوگیا؟ جب موت نے ان کو علم قرآن کے ظاہر کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ آپ نے ان کی کون سی علمی تحقیق یا مشکلاتِ قرآن کے حل کی تصدیق پالی؟ کہ یقین کرکے بیٹھ گئے اور ساتھ دعویٰ بھی کردیا کہ مشہور مفسر قرآن تھے۔ بے شک وہ مفسر قرآن ہوں ہمیں اس بات میں خوشی ہے لیکن کیا صرف آپ کے کہنے سے ہم بھی کہہ دیں کہ ہاں! بے شک تھے نہ انہوں نے کچھ سنایا نہ بیان کیا۔ نہ مشکلات قرآن کا حل بتایا۔ نہ تاویل وتنزیل کے متعلق کچھ سمجھایا تو دریں حالات کوئی کس منہ سے کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ جی وہ تھے اور ضرور تھے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ آپ کو کسی طرح کا الہام ہوا اور کہہ گذرے ہم کسی شہرت کے پیچھے کیوں جائیں۔ جب تحقیق اس کے خلاف ہو۔ رُبَّ شُهْرَةٍ لَا أَصْلَ لَهَا۔ (بعض شہرتیں بے بنیاد ہوا کرتی ہیں) ہم جرأت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ خدا بھی اگر خدائی کے آثار ظاہر نہ کرتا تو خدا نہ مانا جاتا۔ کیونکہ بجز آثار کے نہ کوئی پہچانتا نہ مانتا۔ اسی طرح ایک نبی اپنی امت میں ہزاروں برس گو گذار دے۔ لیکن جب تک علم نبوت کو ظاہر نہ کرے گا۔ نہ اس کی نبوت پہچانی جائے گی اور نہ اسے نبی مانا جائے گا۔

اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا عالم لاکھوں کروڑوں داناؤں کے مجمع میں بیٹھا رہے اور کچھ دیر کے بعد بغیر کچھ سنائے کے اٹھ کر چلا جائے۔ میرے خیال میں تو اسے نہ کوئی عالم سمجھے گا اور نہ کہے گا۔ وعلی ہذا القیاس۔ ہر صاحب فن کی یہی حالت ہے

پس جب بغیر آثار کے خدا نہیں پہچانا جاسکتا۔

ہزاروں برس کسی امت میں رہ کر بغیر علم نبوت کے اظہار کے نبی کی تصدیق نہیں ہوسکتی۔

پاس بیٹھنے والا مجمع بغیر اظہار علم کے کسی کو عالم ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کو عالم کہنے والا بیوقوف سمجھا جاتا ہے تو نہ معلوم نو سو برس کے بعد آنے والا شخص غائبانہ طور پر نہ شکل دیکھی نہ صورت نہ علم دیکھا نہ اثر کس عقل ونقل سے نظریہ قائم کرسکتا ہے کہ صرف مفسر نہیں بلکہ مشہور مفسر قرآن تھے؟ بریں عقل ودانش بباید گریست۔

پہلے مفسر کے متعلق فرماتے ہیں کہ مجھے بہت کم آثار مل سکے ہیں۔ جو دس سے زیادہ نہیں چلو۔ دس ہی سہی۔ گویا وہ دس لفظوں کی تشریح ہوگی یا زیادہ سے زیادہ دس آیات کی تفسیر ہوگی۔ خود سیوطی نے الاتقان میں باب عدد الآیات میں بقول ابن عباس کل آیات قرآنیہ کی تعداد چھ ہزار چھ سو سولہ (۶۶۱۶) بیان کی ہے اور اس سے کم وبیش کے اقوال اور بھی ہیں۔

اب جو مشہور مفسر قرآن کی علم تفسیر میں شہرت عامہ کے ساتھ ان کی طرف سے آثار منقولہ پر نگاہ دوڑائی تو تعجب ناک بلکہ انتہائی حسرتناک صورت حال سامنے آئی۔ خیال تھا کہ مشہور مفسر سے علوم قرآنیہ کے بہت بڑے ذخائر برآمد ہوں گے لیکن جب کل قرآن کے مقابلہ میں ان کی علمی تحقیقات کو سامنے کیا تو ۶۶۱۶ آیات میں سے صرف دس آیتوں کے متعلق ہی ان کا علم ثابت ہوسکا

لہٰذا باقی ہر دو مشہور مفسرین کی علمی تحقیقات کے پیچھے پڑنے کی جرأت نہ ہوئی اور ممکن ہے کہ ان کے اقوال کی تلاش بھی کی ہو، لیکن پہلے کی بہ نسبت یہاں طبیعت زیادہ سیر ہوگئی ہو۔ کیونکہ ان کے متعلق بھی اگر دس تک اقوال دستیاب ہو جاتے تو مقامِ فخر تھا۔ ذکر کرنے میں ہرگز بخل نہ کرتے۔ لہٰذا ان کی لفظی شہرت کے ڈھنڈھورا پیٹنے پر اکتفا کر لی اور آگے قدم رکھنا مناسب نہ سمجھا۔

میرے خیال میں تو یہ سب کمزوری ناقلانِ حدیث کی ہے کہ جب انہوں نے صحابہ کرام کے فضائل میں حدیثوں کے طومار لکھ دیئے اور یہ خیال تک نہ کیا کہ ہمارے یہ سب طومار بیکار ہیں۔ جب اصل ہی نہیں ہے۔ مرید کہاں تک کسی کو اڑائیں گے جب پیر میں اڑنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔

کسی کو عالم کہنے سے وہ عالم نہیں بنا کرتا۔ اسی طرح اگر کوئی عالم ہو تو اس کو عالم نہ کہنے سے اس کا علم چلا نہیں جاتا۔ ایسے کسی کو بہادر کہنے سے وہ بہادر ہو نہیں جاتا۔ اور بہادر کو بہادر نہ کہنے سے اس کی بہادری ختم نہیں ہو جایا کرتی۔ اگر آپ کسی کو عالم کہیں گے تو ہم ضرور اس کے علمی آثار دیکھیں گے صرف آپ کا دعوائے شہرت بلا دلیل و حجت ہرگز قابلِ تسلیم نہیں ہوگا۔ اسی طرح آپ مشہور کر دیں کہ فلاں بہت بڑا بہادر تھا تو اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے اس کے آثارِ شجاعت دیکھیں گے۔ بات اگرچہ موضوع سے خارج ہے لیکن عرض کر دوں کہ فتوحاتِ اسلامیہ دلیل شجاعت نہیں۔ ہاں دلیل سیاست ضرور ہیں۔ فوج و لشکر بھیج کر کسی ملک کا فاتح بننا اور بات ہے اور سپاہی مردِ میدان بن کر معرکۂ کارزار پر چھا جانا اور شجاعانِ زمانہ و آزمودہ کارانِ حرب و ضرب کو تہِ تیغ کر کے میدان جیتنا اور بات ہے اور یہ صرف حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ ہی کا حصہ ہے۔ بس یوں کہئے کہ نام نام ہے اور کام کام ہے۔

موضوع زیرِ بحث میں سیوطی صرف بڑا نام سن کر اور بڑے چرچے اور ہاؤ ہو سے متاثر ہو کر ان کی شہرتِ علمِ تفسیر کا دعویٰ کر بیٹھا۔ لیکن جب مقامِ اثبات میں آیا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ۔

بقولِ شاعر: بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ۔۔۔ جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

اگر پورے قرآن مجید میں سے پچاس ساٹھ فیصدی علمِ تفسیر ثابت ہو جاتا۔ تو بہت غنیمت شمار ہوتا۔ لیکن یہاں تو دس فیصدی کیا۔ دس فی ہزار ایک فی صدی بھی نہیں۔ فرماتے ہیں پورے قرآن میں سے دس قول یعنی ۱۰/۶۶۶۶ گویا ۱/۶ فیصدی سے بھی کم اقوال مجھے دستیاب ہو چکے ہیں۔

حالانکہ جانشین رسالتؐ کے لئے قرآن کا سو فیصدی علم ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہرگز مسندِ رسالت پر قدم نہیں رکھ سکتا اور وہ سوائے علی ابن ابی طالبؑ کے صحابۂ رسولؐ میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ کے متعلق اسی بیان کی ابتداء میں اور گذشتہ متعدد مقامات پر جناب رسالتمآبؐ کی تصریحات سے قطع نظر۔ خود صحابہ کرام کے اعترافی الفاظ گذر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی انشاء اللہ بیان ہوں گے۔ ملاحظہ ہو ص ۸۲ و ص ۱۵۰

صاحب اتقان نے اچھا کیا کہ باقی دو حضرات کی علمی تحقیقات کے پیچھے پڑ کر وقت ضائع نہیں کیا اور صرف بنا بر شہرت کے ان کا مشہور مفسر کہہ دینے پر اکتفا کی۔ خواہ حسد و تعصب اس امر کے اظہار کی اجازت دے یا نہ دے یہ اور بات ہے لیکن اپنے اندر یہ نظریہ ضرور قائم کر لیا ہوگا کہ رب شہرۃ لا اصل لہا (بعض مشہور باتیں بے اصل ہو جایا کرتی ہیں)

نیز ان سے آثار حدیث کے کم منقول ہونے کا بھی یہی عذر قرار دیا کہ تقدم وفات کی وجہ سے وہ حدیث بھی زیادہ نہ روایت کر سکے کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ کیا جناب فاطمہؑ زہرا بنت رسول اللہؐ کو فدک یا وراثت سے محروم کرنے اور ان کو غضبناک کرنے کے لئے ہی صرف موت نے ان کو مہلت دی اور حدیث یاد آگئی (نحن معشر الانبیاء لا نورث ولا نورث) یعنی ہم گروہ انبیاء نہ کسی کے وارث ہم ہیں اور نہ ہمارا کوئی وارث ہے اور اس کے بعد اڑھائی سال تک موت سے ہراساں رہے؟ وہ تو مسند رسالت پر قابض تھے ان کو بیان کرنے کا اب حق تھا۔ لوگ آتے ہوں گے۔ پوچھتے ہوں گے۔ اگر ہر نماز کے بعد ایک ایک مسئلہ بھی بیان کیا ہوتا تو بہت کافی ہو جاتا۔ صرف عترت طاہرہ کے رُلانے کا ہی ڈھنگ تھا اور بس؟ معتقدین کو بھی موقعہ مل گیا کہ تقدم وفات کی وجہ سے وہ بیان کچھ نہ کر سکے ورنہ علم میں کمی نہیں تھی۔ اور تعجب یہ کہ حضرت عمر سے تفسیر قرآن کم بیان ہونے کی وجہ بھی تقدم وفات ہی کو بیان کیا۔ حالانکہ وہ جناب رسالتمآبؐ کے بعد بارہ برس سے زیادہ زندہ رہے۔ اتنی لمبی چوڑی فتوحات ملکیہ اور دیگر کارہائے حکومت جو نمایاں حیثیت کے حامل ہیں ان سب کا موقعہ ملا اور صرف تفسیر قرآن شریف کا موقعہ دستیاب نہ ہو سکا۔ موت نے مہلت نہ دی اگر زیادہ زندہ رہتے تو بیان کر جاتے۔ یہ معلوم رہے کہ اس زمانہ میں علم حدیث و تفسیر کتابوں میں نہیں تھا۔ تاکہ کہا جائے کہ ان کو مطالعہ کا وقت نہیں مل سکتا تھا۔ دورِ اول میں علوم شرعیہ فقہ و حدیث و تفسیر وغیرہ سب صحابہ کے سینوں میں تھا۔ بس جس جس کے سینہ میں کچھ تھا وہ ہی بیان کرتا تھا۔

بارہ تیرہ برس کے عرصہ میں تو کم از کم بھی روزانہ بیان ہوا کرتا۔ تو پوری تفسیر قرآن پر عبور ہو سکتا تھا۔ چل پھر کر بیان کر سکتے تھے خطبات جمعہ و عیدین میں بیان ہو سکتا تھا۔ ہر تقریر میں کچھ نہ کچھ بیان کیا جا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ میدان جنگ میں بھی بیان کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ آخر مسائل جہاد کی ضرورت ہوگی۔ خود ہی انصاف فرمایئے کہ تقدم وفات صرف قرآن سے ہی مانع تھا؛ صاف کہہ دیجئے کہ قرآن حفظ نہ تھا۔ تفسیر معلوم نہ تھی۔ بس سیاست ملکیہ میں خوب ماہر تھے۔

اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ حضرت عثمان کے متعلق بھی تقدم وفات کا عذر ہے۔ حالانکہ حضرت رسالتمآبؐ کے بعد پورے پچیس برس زندہ رہے۔ گویا اتنا طویل عرصہ تک قرآن مجید کی تفسیر کے متعلق خاموش رہے اپنے دورِ خلافت میں صرف یہ کیا کہ کاتبوں سے متعدد نسخے لکھوا کر اطراف مملکت میں بھیج دیئے اور بس۔

سیوطی کو تقدم وفات کا عذر مبارک رسالتمآبؐ کے بعد کوئی شخص دو اڑھائی برس یا بارہ یا پچیس برس تک زندہ رہے چونکہ اس سے کوئی علمی بات منقول نہیں ہوئی۔ لہٰذا بہانہ سب میں یکساں پیش کر دیا۔ یہی خیال ہوگا کہ عوام

سن کر خاموش ہو جائیں گے ۔ باقی کون پوچھتا ہے؟ بس ضد ہے جس کو علیؑ کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا ہے ۔ اب اسے عالم بھی ضرور کہنا ہے خواہ واقعات و حقائق اس کی تائید کریں یا نہ کریں۔

اب ذرا علامہ سیوطی کی تاریخ الخلفا میں تفسیر قرآن کے متعلق حضرت ابوبکر سے نقل شدہ اقوال کا ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) عن ابی ملیکۃ قال سئل ابوبکر عن آیۃ فقال ای ارض تسعنی و ای سماء تظلنی ان قلت فی کتاب اللہ ما لم یرد اللہ۔

ابو ملیکہ سے مروی ہے کہ ابوبکر سے ایک آیت کا معنی پوچھا گیا تو فرمایا کہ مجھے کونسی زمین جگہ دے گی اور کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا اگر میں اللہ کی کتاب میں وہ بات کر بیٹھوں جو خدا کی مراد کے خلاف ہو (یعنی مجھے اس کا معنی یاد نہیں)۔

(۲) سئل ابوبکر عن قولہ تعالیٰ وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا فقال ای السماء تظلنی و ای ارض تقلنی ان قلت فی کتاب اللہ ما لم اعلم

حضرت ابوبکر سے خدا کے قول وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا کا معنی پوچھا گیا تو جواب دیا کہ میں کس آسمان کے سایہ میں اور کس زمین کے اوپر بسوں گا ۔ اگر میں قرآن کا وہ معنی بتاؤں جو میں نہیں جانتا۔

(۳) انہ سئل عن الکلالۃ فقال انی ساقول فیہا برایی فان یکن صوابا فمن اللہ و ان یکن خطاءً فمنی و من الشیطان ۔ اراہ ماخلا الولد والوالد فلما استخلف عمر قال انی لاستحی ان ارد شیئاً قال ابوبکر

ان سے کلالہ کا معنی پوچھا گیا تو کہا کہ میں اپنی رائے سے بیان کروں گا اگر درست ہوا تو اللہ کی جانب سے (سمجھنا) اور اگر غلط ہوا تو میری اور شیطان کی جانب سے سمجھنا ، میری رائے میں تو اس کا معنی باپ اور بیٹے کے علاوہ جو رشتہ دار ہیں ۔ ہے ۔ پھر جب عمر خلیفہ ہوا تو اس نے کہا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ ابوبکر کے قول کی تردید کروں۔

(۴) عن ابی بکر الصدیق فی قولہ تعالیٰ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۔ قال النظر الی وجہ اللہ تعالیٰ

حضرت ابوبکر نے خدا کے فرمان (احسان کرنیوالوں کے لئے بدلہ میں احسان اور زیادتی ہوگی) کے متعلق فرمایا کہ زیادتی سے مراد خدا کے چہرہ[1] کی طرف نظر کرنا ہے

(۵) حضرت ابوبکر نے بعض صحابہ سے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ۔ ان ہر دو آیتوں کا معنی دریافت فرمایا ۔ تو انہوں نے جواب دیا ۔ کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دین پر مضبوط ہو گئے اور کوئی گناہ نہ کیا اور اپنے ایمان کو خطاکاری سے بچالیا ۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ تم نے بے جا کہا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رب ہمارا اللہ ہے اور اس پر مضبوط ہو گئے اور اس کے بعد کسی اور خدا کی عبادت کی طرف نہ جھکے اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کی ملاوٹ نہ کی۔

لے پہلے دو تو سوالوں کے جواب میں بہت محتاط رہے اور تفسیر بالرائے سے گریز کرتے رہے ۔ لیکن اب دیکھا کہ اگر تفسیر بالرائے نہ کروں تو لوگ روز روز ایک دو دن نہیں بلکہ نت نئے مسائل وارد ہوں گے پس دل میں ٹھان لی کہ آئے یا نہ آئے کہنا ضرور ہے۔ (منہ)

[1] خدا فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ کوئی نگاہ اس کا ادراک کر ہی نہیں سکتی وہ سب کا ادراک کر سکتا ہے ۔ اب ذرا خلیفہ صاحب کے معنی کو اس آیت سے مطابق کیجئے۔ (منہ)

(۶) ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت کا ترجمہ آپ سے یہ بھی منقول ہے کہ جنہوں نے کلمہ (رَبُّنَا اللہ) کہا اور مرتے دم تک اس پر ثابت رہے وہ ہی مستقیم ہیں۔

یہ ہیں سب وہ اقوال جن کے متعلق علامہ سیوطی نے الاتقان میں کہا تھا کہ حضرت ابوبکر سے تفسیر قرآن کے متعلق بہت کم آثار وارد ہیں۔ جو دس سے زیادہ نہیں۔ اقوال کلیہ چھ ہیں۔ اب دس سے کم کہتے ہوئے ذرا شرم محسوس ہوئی کہ ادھر دعویٰ مشہور مفسر کا اور ادھر اقوال کل دس سے بھی کم۔ لہٰذا دس سے کم کہنا بارگاہ خلافت میں توہین کا موجب سمجھا اور عوام کے اغرا بالجہل میں اور دس تک کے اشتباہ میں شاید خلافت مآب کی عزت افزائی سمجھی خیر! کل چار کا فرق ہے اتنی بڑی بات نہیں

اب ذرا ان چھ اقوال کا تجزیہ کیجئے (۱) پہلے قول میں تو قصہ بالکل صاف ہے آیت کا معنی دریافت کیا گیا تو جواب دیا کہ میں کیسے ایسی بات کہوں کہ مبادا منشائے خدا کے خلاف ہو اور اس صورت میں زمین و آسمان کے درمیان میں رہنے کے قابل نہ رہوں

(۲) دوسرا قول فَاكِهَةً وَّأَبًّا۔ کا معنی دریافت کیا گیا تو مثل سابق جواب دیا۔ ان دونوں کا مطلب اپنی لاعلمی کے اظہار کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے حالانکہ ہر عربی دان اس کا معنی کتب لغت کی ورق گردانی کئے بغیر سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس کے فوراً بعد ہے (مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ) یعنی فاکہ اور اب تمہارے اور تمہارے چوپاؤں کی منفعت کے لئے ہیں لف و نشر مرتب کے دستور کے مطابق ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ فاکہہ (میوہ) کا تعلق انسان سے ہے اور اب کا تعلق چوپائے سے ہے تو اس سے مراد یقیناً گھاس ہی ہوگا۔

(۳) تیسرا قول کلالہ کے معنی میں تفسیر بالرائے سے کام لے کر جرأت کا اظہار کیا پہلے دونوں کے جواب میں اپنی لاعلمی کو سکوت کے لباس میں ملبوس رکھا۔ لیکن اس مقام پر زمین و آسمان کے درمیان بسنے کے قابل نہ رہنے کے خطرہ کو خدا معلوم کیوں دُور کر دیا۔ حالانکہ صورت حال پہلے جیسی ہے اور وہی لاعلمی کا اظہار اس جرأت سے بدرجہا بہتر تھا فرماتے ہیں۔ مجھے آتا بھی نہیں اور کہنا بھی ضرور ہوں لیکن میری رائے اگر دُرست تو اللہ سے اور غلط تو مجھ سے اور شیطان سے۔ کلالہ کا معنی مَا خَلَا الْوَلَدَ وَالْوَالِدَ (باپ بیٹے کے علاوہ باقی رشتہ دار) اب اہل علم معنی کرنے والے کی علمی قابلیت کا خود اندازہ فرما لیں کیونکہ معنی بیان کرنے والا مشہور مفسر قرآن بھی ہے اور لوگ اس کو تاجدار رسالت کا جانشین بھی جانتے ہیں اور خود ان کو قرآن کے لفظی ترجمہ میں دقت ہو رہی ہے اور طرہ یہ کہ اس کے بعد ہونے والے خلیفہ حضرت عمر نے باوجودیکہ ان کی غلطی کو محسوس کر لیا۔ تاہم اس غلطی کا ازالہ کرنا خلیفہ اول کی توہین سمجھا فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ حضرت ابوبکر کے قول کی تردید کروں اب اندازہ فرمائیے کہ قرآن کی توہین ہو اس کی پرواہ نہیں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ حضرت ابوبکر کو کوئی جاہل سمجھ بیٹھے (ماشاءاللہ بڑی احتیاط سے کام لیا گیا)

خلاصہ یہ ہوا کہ کل پانچ آیتوں میں سے تین آیتوں کے معنی نہ آئے۔ پہلے دو کے متعلق خوف خدا سے لاعلمی کا اظہار کر کے متقی بن بیٹھے۔ اور تیسری آیت میں اپنی جرأت کا مظاہرہ فرمایا اور لاعلمی کا اعتراف کرنے کے باوجود معنی کیا۔ باقی رہ گئیں

دو آیتیں ایک کا ایک معنی اور دوسری کے متعلق ان سے دو معنی نقل کئے گئے۔

یہ ہے مفسر قرآن خلیفۂ رسولؐ کی ساری کی ساری قرآن دانی اور علمی پونجی۔ اور یہ ہیں باقی دونوں میں سے زیادہ عالم اور مسندِ رسالت کے پہلے حقدار۔

اب سیوطی بیچارہ پھنس گیا۔ ان کو عالم کہتا ہے تو حقیقت اس کے خلاف ہے اور واقعات جھٹلاتے ہیں اور اگر جاہل کہتا ہے تو خلافت کی ناؤ بھنور میں آتی ہے۔ جو شخص تفسیر و تاویل تو درکنار صرف تحت اللفظی ترجمہ نہ کر سکتا ہو اس کے متعلق مشہور مفسرِ قرآن ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے کے بعد تقدم وفات کا عذر نہ کرتا تو اور بیچارہ ہی کیا تھا؟

چھ ہزار چھ سو سولہ ۶۶۱۶ آیات بقول ابن عباس میں سے صرف تین آیات کا تحت اللفظی ترجمہ اور مفسرِ قرآن مشہور (العجب) الاتقان کے اشتباہی الفاظ سے تو یہ اندازہ کر لیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ان کو ½ فیصدی قرآن کا علم تھا۔ لیکن تاریخ الخلفاء کے تفصیلی بیان سے معلوم ہوا کہ ۳/۶۶۱۶ یعنی کل قرآن کا ½ فی صدی علم ان کو تھا۔ یعنی ہم تک ان کا علم اس سے زیادہ نہیں پہنچ سکا۔

مسندِ خلافت کیلئے ایسے ہی علمائے قرآن کا انتخاب شایانِ شان تھا کیونکہ علیؑ کو تو پیچھے ہٹانا ہی ہے خواہ نتیجہ جو بھی ہو؟

اپنا اعتراف حضرت ابوبکر خود اپنے متعلق جو نظریہ قائم فرماتے ہیں۔ کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں اہل سنت کے علامہ ابن قتیبہ دینوری تحریر فرماتے ہیں:

قال فی خطبۃ اعلموا ایھا الناس انی لم اجعل لھذا المکان ان اکون خیرکم ولوددت ان بعضکم کفانیہ ولئن اخذ تمونی بما کان اللہ یقیم بہ رسولہ من الوحی ما کان ذالک عندی وما انا الا کاحدکم فاذا رایتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زغت فقومونی واعلموا ان لی شیطانا یعترینی	آپ (ابوبکر) نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ لوگو! جان لو کہ میں اس خلافت کے مقام کے لئے اس لئے منتخب نہیں ہوا ہوں کہ میں تم سے بہتر ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی آدمی یہ کام سنبھال لے اور اگر تم مجھ سے وہ کام چاہو جس کے لئے خدا نے اپنے رسولؐ کو بذریعہ وحی کھڑا کیا تھا تو میرے پاس وہ بات نہیں ہے میں تو تم ہی جیسا آدمی ہوں۔ پس جب مجھے ٹھیک چلتا ہوا دیکھو تو میرے پیچھے چلو اور اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر لیا کرو اور یقین جانو کہ میرے لئے ایک شیطان ہے جو مجھ پر غالب آجاتا ہے۔

گذشتہ تاریخ الخلفاء کے حوالہ میں کلالہ کی تفسیر کرتے ہوئے بھی آپ نے یہی فرمایا تھا کہ اگر غلط مطلب بیان کروں تو سمجھ

ۂ اس کے مقابلہ میں حضرت علیؑ کا اپنے متعلق نظریہ ۸۳ ص ۱۱۱ ص ۱۲۹ پر ملاحظہ فرمائیے اور جناب رسالتمآبؐ کی فرمائشات سے تطبیق کیجئے (منہ)

ۂ یعنی مجھ سے احکام شریعت کی تبلیغ اور مقاصد رسالت کی ترویج (جس طرح کہ جناب رسالتمآبؐ فرماتے تھے) کی امید نہ رکھنا میں خود تم جیسا ایک بے علم آدمی ہوں۔ اگر دیکھو ٹھیک چل رہا ہوں تو خیر ورنہ مجھے تم خود ٹھیک کر لینا (منہ)

لینا کہ میری اور شیطان کی مشترکہ رائے سے ہے۔

مدعی سست اور گواہ چست

حضرت ابوبکر خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اس خلافت کا اہل نہیں ہوں اور نہ مجھ سے اس بات کی توقع رکھو۔ جس کے لئے خدا نے رسولؐ کو بھیجا تھا۔ غلط کرنے یا درست کرنے میں یا شیطان کے پھندے میں آجانے کے اعتبار سے میں تم جیسا ایک انسان ہوں۔

حضرت علیؑ کا مقام

اب ذرا چشم انصاف سے حضرت علیؑ کے کلمات کا مطالعہ کیجئے۔ اور ابن قتیبہ دینوری کی زبانی سنئے (الامامۃ والسیاسۃ)

ثم ان علیا کرم الله وجهه اتی به الی ابی بکر وهو یقول - انا عبد الله واخو رسوله فقیل له بایع ابابکر فقال انا احق بهذا الامر منکم لا ابایعکم اخذتم هذا الامر من الانصار واحتججتم علیهم بالقرابة من النبی صلی الله علیه وسلم وتاخذونه منا اهل البیت غصبا

الستم زعمتم للانصار انکم اولی بهذا الامر منهم لما کان محمد منکم فاعطوکم المقادة وسلموا الیکم الامارة وانا احتج علیکم بمثل ما احتججتم به علی الانصار نحن اولی برسول الله حیا ومیتا فانصفونا ان کنتم تومنون والا فبؤوا بالظلم وانتم تعلمون فقال له عمر انك لست متروکا حتی تبایع فقال له علی احلب حلبا لك شطره واشدد له الیوم امره یردده علیك غدا ثم قال - والله یا عمر لا اقبل قولك ولا ابایعه فقال له ابوبکر فان لم تبایع فلا اکرهك فقال ابو عبیدة بن جراح لعلی کرم الله وجهه یا ابن عم

پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت ابوبکر کے پاس لایا گیا تو آپ کی زبان سے یہ لفظ جاری تھے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کے رسولؐ کا بھائی ہوں پس آپ سے ابوبکر کی بیعت کے لئے کہا گیا۔ تو فرمایا میں تم سے خلافت کا زیادہ حقدار ہوں۔ لہٰذا تمہیں میری بیعت کرنا چاہیئے۔ میں تمہاری بیعت نہیں کرتا۔ تم نے جناب رسالتمآبؐ کی قرابت کو پیش کرکے انصار سے امر خلافت لیا ہے اور ہم اہلبیت سے اب خود غصب کرکے لے رہے ہو۔ (قرابت دار تو ہم تم سے زیادہ ہیں) کیا تم نے انصار کو یہی نہیں کہا کہ چونکہ جناب رسالتمآبؐ ہم میں سے تھے لہٰذا اس امر خلافت کے ہم ہی حقدار ہیں۔ پس انصار نے تمہاری اطاعت کرلی اور تمہیں حکومت دیدی۔ میں بعینہٖ وہی دلیل تمہارے اوپر پیش کرتا ہوں جو تم نے انصار پر پیش کی تھی ہم جناب رسالتمآبؐ کے زیادہ قریبی ہیں۔ زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی پس اگر تم میں ایمان ہے تو ہمارے ساتھ انصاف کرو۔ ورنہ دیدہ دانستہ ظالم بنے رہو۔ عمر نے کہا تمہیں چھوڑا نہیں جائے گا جب تک بیعت نہ کرو گے۔ پس حضرت علیؑ نے فرمایا تو یہ دودھ دوہ لے کیونکہ تیرا اس میں حصہ ہے۔ آج اس کے معاملہ کو مضبوط کرلے کیونکہ کل وہ اس کو تیری طرف پلٹا دے گا۔ پھر فرمایا خدا کی قسم اے عمر میں تیری بات نہ مانوں گا اور اس کی بیعت نہ کروں گا۔ پس ابوبکر نے کہا کہ اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کرتا پس

انك حديث السن وهولاء مشيخة قومك
ليس لك مثل تجربتهم و معرفتهم بالامور
ولا اری ابابکر الا اقوی علی هذا الامر
منك واشد احتمالا واضطلاعا به فسلم
لابی بکر هذا الامر فانك ان تعش ویطل
بك بقاء فانت لهذا الامر خلیق وبه حقیق
فی فضلك ودینك وعلمك وفهمك و
سابقتك ونسبك وصهرك فقال علی
کرم الله وجهه - الله الله یا معشر المهاجرین
لا تخرجوا سلطان محمد فی العرب عن
داره وقعر بیته الی دورکم وقعود بیوتکم
ولا تدفعوا اهله عن مقامه فی الناس
وحقه فوالله یا معشر المهاجرین لنحن
احق الناس به لانا اهل البیت ونحن
احق بهذا الامر منکم ما کان فینا القارئ
لکتاب الله - الفقیه فی دین الله - العالم
بسنن رسول الله - المضطلع بامر الرعیة
الدافع عنهم الامور السیئة - القاسم
بینهم بالسویة والله انه لفینا فلا تتبعوا
الهوی فتضلوا عن سبیل الله فتزدادوا من
الحق بعدا - فقال بشیر بن سعد الانصاری
لو کان هذا الکلام سمعته الانصار منك
یا علی قبل بیعتها لابی بکر ما اختلف علیك
اثنان قال: وخرج علی کرم الله وجهه یحمل
فاطمة بنت رسول الله صلی الله علیه وسلم

ابو عبیدہ بن جراح نے حضرت علیؑ کو کہا اے چچا کے بیٹے تم
نوجوان آدمی ہو اور یہ لوگ تیری قوم کے عمر رسیدہ ہیں۔ تیرے
پاس ان جیسا تجربہ اور معاملہ فہمی نہیں ہے اور میں ابوبکر کو اس
معاملہ میں تجھ سے زیادہ مضبوط اور صاحب برداشت اور حوصلہ مند
سمجھتا ہوں۔ پس اس معاملہ (خلافت) کو ابوبکر کے لئے چھوڑ دو پس
اگر تم زندہ رہے اور تمہاری حیاتی طویل ہوئی۔ تو تم اس (خلافت) کے
بوجہ فضل، دین، علم و فہم، سبقت الی الاسلام۔ قرابت داری
اور دامادی رسول کے سزاوار اور حقدار ہو۔ پس حضرت علیؑ نے
فرمایا۔ اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو اے گروہ مہاجرین حضرت
محمد مصطفےٰ کی حکومت کو عرب میں اس کے گھر اور مکان سے
نکال کر اپنے گھروں اور مکانوں کی طرف نہ لے جاؤ اور اس کے
اہل بیت کو اس کے مقام اور حق سے نہ ہٹاؤ۔ جو لوگوں میں معلوم ہے
پس خدا کی قسم اے گروہ مہاجرین۔ بہ نسبت اور لوگوں کے ہم رسالتمآب
کے زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ ہم اہل بیت ہیں اور ہم ہی اس امر (خلافت)
کے تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ ہمیشہ ہم میں قاری قرآن اللہ کے دین
کا فقیہ۔ جناب رسالتمآب کی سنتوں کا عالم، امور رعایا میں واقف کار
ان سے آمدہ مصائب کے دفع کرنے والا موجود ہے۔ اللہ کی قسم
وہ صرف ہم میں ہی ہے۔ پس خواہشات کے پیچھے نہ جاؤ۔ ورنہ اللہ
کے رستہ سے گمراہ ہو جاؤ گے اور حق سے دور تر ہوتے جاؤ گے
پس بشیر بن سعد انصاری نے کہا کہ یا علیؑ اگر آپ کا یہ کلام انصار نے
ابوبکر کی بیعت کرنے سے پہلے سن لیا ہوتا تو تیرے خلاف دو آدمیوں
کی آواز بھی نہ اٹھتی کہتا ہے (اس کے بعد) حضرت علی
کرم اللہ وجہہ چلے گئے اور ہر رات حضرت فاطمہ بنت
رسول اللہ کو سواری پر بٹھا کر انصار کے گھروں میں جا کر (احتجاجاً)
ان سے اپنے حق کی نصرت کا سوال کرتے۔ وہ بی بی کو یہ جواب

لہ حضرت ابوبکر کے سابق اعتراف اور ان کے وکیل ابوعبیدہ بن جراح کے بیان میں ٹھنڈے دل سے مطابقت پیدا کیجئے وہی بات ہی ہے۔ مدعی سست اور گواہ چست۔ (منہ)

علی دابۃ لیلاً فی مجالس الانصار تسئالهم النصرۃ، فکانوا یقولون یا بنت رسول اللّٰہ قد مضت بیعتنا لھذا الرجل ولو ان زوجك وابن عمك سبق الینا قبل ابی بکر ما عدلنا بہ فیقول علی کرم اللّٰہ وجھہ افکنت ادع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی بیتہ لم ادفنہ واخرج انازع الناس سلطانہ؟ فقالت فاطمۃ: ما صنع ابوالحسن الا ما کان ینبغی لہ ولقد صنعوا ما اللّٰہ حسیبھم وطالبھم (الامامۃ والسیاسۃ الجزء الاول مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲)

دیتے تھے کہ اے بنت رسولؐ اب تو ہم اس شخص (ابوبکر) کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر تیرا شوہر و چچا زاد (علیؑ) ہمارے پاس ابوبکر سے پہلے پہنچ جاتا۔ تو ہم اس سے روگردانی نہ کرتے۔ پس حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے تھے کہ کیا میں جناب رسالتمآبؐ (کی میت) کو ان کے گھر میں بغیر دفن کئے چھوڑ آتا اور لوگوں کے ساتھ حکومت (خلافت) کا جھگڑا کرتا؟ پس حضرت فاطمہؑ فرماتی تھیں کہ جو کچھ ابوالحسن (علیؑ) نے کیا ہے انہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا اور البتہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا خدا ان سے حساب لے گا اور مطالبہ کرے گا۔

موازنہ

اب حضرت ابوبکر کے کلام اور حضرت علیؑ کے کلام کا موازنہ کیجئے۔

حضرت ابوبکر فرماتے ہیں اس مقام خلافت پر میں اس لئے نہیں لایا گیا کہ تم سے بہتر ہوں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔ نَحْنُ اَحَقُّ بِھٰذَا الاَمْرِ ہم اس امر خلافت کے تم سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ اور تم غاصب ہو۔

حضرت ابوبکر۔ میں تم جیسا عام انسان ہوں اگر مجھ سے بھول چوک ہو جائے تو مجھے سیدھا کر دینا (میری رہبری کرنا)

حضرت علیؑ۔ ہم اہل بیت رسول۔ قرآن کے قاری ہم۔ دین خدا کے فقیہہ ہم اور سنّتِ رسولؐ کے عالم ہم ہیں۔

حضرت ابوبکر۔ ان لی شیطانا یعترینی میرے ساتھ ایک شیطان ہے، جو مجھے راہ حق سے بھٹکاتا ہے (مجھ پر اس کا غلبہ ہے)

حضرت علیؑ۔ ہمارا ساتھ چھوڑنے سے گمراہی ہوگی اور راہ حق سے دُوری نصیب ہوگی۔

حضرت ابوبکر۔ قرآن کے علم میں سے ½ فیصدی ترجمہ ہم جانتے ہیں (جہاں تک سیوطی کی دسترس ہے) اور دو آیتوں کے متعلق تو انہوں نے خود بھی صاف کہہ دیا اگر میں اپنی طرف سے کوئی بات کہہ دوں تو ممکن ہے منشار ایزدی کے خلاف ہو اور زمین اور آسمان کے درمیان بسنے کے قابل نہ رہوں اور ایک آیت کا ترجمہ اپنی رائے سے کیا بھی تو حضرت عمر نے غلطی کا اسی میں احساس کیا۔ گو ذہن سمجھتے ہوئے تردید نہ کر سکے۔

حضرت علیؑ۔ تمام علمِ قرآن کو جانتے ہیں۔ چنانچہ اس فصل کے تمہیدی بیان صفحہ ۱۵۱ پر ملاحظہ ہو۔ نیز بفرمانِ رسولؐ عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ صفحہ ۱۲۵ پر ملاحظہ ہو۔ اِنِّی تَارِكٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْن حدیث نبوی پوری تفصیل سے گذر چکی ہے عَلِیٌّ وِعَاءُ عِلْمِی۔ علیؑ میرے علم کا ظرف ہے۔ کفایۃ الکنجی و شمس الاخبار سے پیش کی جا چکی ہے۔

انا مدینۃ العلم وعلی بابھا حدیث مشہور صفحہ ۸۲ و صفحہ ۱۶۴ پر ملاحظہ ہو۔

حضرت ابوبکر۔ بقول ابوعبیدہ بن الجراح صرف سن رسیدگی کی وجہ سے خلیفہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ کسی ملکہ فاضلہ میں اس کو امتیاز نہ تھا
حضرت علیؑ ۔ بقول ابوعبیدہ بن الجراح فضل، علم، فہم، دین قرابتِ رسولؐ، سبقت فی الاسلام اور دامادیٔ پیغمبر سب کمالات سے ممتاز تھے۔ نوجوان کہہ کر ان کو ہٹا دیا گیا اور حضرت علیؑ کے فرمان کے مطابق صرف خواہشاتِ نفسانیہ کی وجہ سے ان کو پیچھے کیا گیا۔

حضرت ابوبکر۔ ابن قتیبہ کی آخری عبارت کے پیش نظر جناب رسالتمآبؐ کے کفن و دفن میں شریک نہ ہوئے اور جلدی سے خلافت کے معاملہ میں پڑ گئے۔ ورنہ جس طرح بشیر بن سعد انصاری کی بات سے معلوم ہوتا ہے اگر رسولؐ کے دفن و کفن میں شرکت کرتے اور حضرت علیؑ کا احتجاج پہلے پیش ہو جاتا تو یقیناً خلافت ان کو نصیب نہ ہو سکتی۔

حضرت علیؑ ۔ بمطابق قول ابن قتیبہ جناب رسالتمآبؐ کی تجہیز و تکفین و تدفین میں مصروف رہے اور ان کی جزا و سزا کو اللہ کے سپرد کر دیا اور بعد میں بطور اتمام حجت ان پر احتجاج فرماتے رہے۔

حضرت علیؑ کی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور ابوعبیدہ بن جراح کے ساتھ باہمی گفتگو سے انعقاد خلافت کی صورت حال بھی معلوم ہو گئی۔ جب عمر نے حضرت علی جیسی شخصیت سے ان الفاظ میں بیعت کا مطالبہ کیا (انک لست متروکا حتی تبایع) آپ کو چھوڑا نہ جائے گا۔ جب تک بیعت نہ کرو گے اور صـ۱۲ پر ہے فقال ان انا لم افعل فمہ ؟ حضرت علیؑ نے فرمایا۔ اگر میں بیعت نہ کروں تو تم کیا کرو گے (قالوا اذا واللہ الذی لا الہ الا ھو نضرب عنقک) انہوں نے کہا خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم تم کو قتل کر دیں گے۔ خیر یہ تو حضرت علیؑ ہی تھے کہ فرما دیا واللہ یا عمر لا اقبل قولک ولا ابایعہ اے عمر تیری یہ بات نہ مانوں گا اور بیعت نہ کروں گا۔ اسلامی جمہوری راج اسی دھکم دھکا کا نام ہے۔

حضرت علیؑ کے علاوہ باقی لوگوں سے جو انداز برتا گیا ہوگا۔ وہ صاف ظاہر ہے۔

نیز انصار سے جس اشتباہ کے ماتحت بیعت لی گئی۔ وہ حضرت علیؑ کے سابق بیان اور بشیر بن سعد انصاری کے کلام سے صاف واضح ہے اس سے اگلی فصل میں انشاء اللہ اس پر قدرے مزید عرض کروں گا۔

عقیدت مند تو کہنے کو تیار ہو جائیں گے کہ حضرت ابوبکر نے اپنے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا۔ وہ سب کسر نفسی اور انکساری پر مبنی ہے کیونکہ اپنی خوش اعتقادی سے ان کو عالم کہہ جو دیا ہے تو اب ان کو عالم ماننا ہے (خواہ وہ عالم ہوں یا نہ ہوں) پیراں نمے پرند مریداں مے پرانند) پیر نہیں اڑتے مرید زوری ان کو اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے متعلق جن خیالات کا اظہار فرما رہے تھے وہ یقیناً مبنی بر صداقت ہے۔ انہیں اپنی علمی بے مائیگی کا احساس تھا اور یہی وجہ ہے کہ مرنے سے پہلے بھی انہوں نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ چنانچہ الامامۃ والسیاسۃ صـ۱۸ پر ملاحظہ ہو۔ مرنے سے قبل فرماتے ہیں۔

واللہ ما آسی الا علی ثلث فعلتھن لیتنی کنت   خدا کی قسم مجھے تین کاموں کے کرنے پر افسوس ہے۔ کاش نہ کئے ہوتے

تركتهن وثلث تركتهن لیتنی فعلتهن وثلث
لیتنی سألت رسول اللہ منهن فاما التی فعلتهن
ولیتنی لم افعلهن فلیتنی ترکت بیت علی
وان کان اعلن علی بالحرب ولیتنی یوم
سقیفہ بنی ساعدۃ کنت ضربت علی
ید احد الرجلین ابی عبیدہ او عمر فکان
هو الامیر وکنت انا الوزیر (الی ان قال)
فلیتنی سألته لمن هذا الامر من بعدہ؟
فلا ینازعه فیه احد ولیتنی کنت سألته
هل للانصار فیها حق؟ ولیتنی کنت سألته
عن میراث بنت الاخ والعمة فان فی
نفسی من ذلک شیئا۔

اور تین کاموں کے نہ کرنے کا افسوس ہے۔ کاش وُہ کئے ہوتے۔
اور تین کاموں کے متعلق کاش جناب رسولِ خدا سے پوچھ لیا ہوتا پس
وہ تین کام جو کئے اور کاش نہ کئے ہوتے (۱) کاش! علیؑ کے گھر کی
بے ادبی نہ کی ہوتی اگرچہ وہ کھلم کھلا میرے خلاف ہی تھے (۲) کاش!
سقیفہ بنی ساعدہ کے دن میں نے ابو عبیدہ یا عمر میں سے ایک کی بیعت
کرلی ہوتی پس وہ امیر ہوتا اور میں اس کا وزیر ہوتا۔ (اس کے بعد
بیان کو جاری رکھتے ہوئے آخری تین چیزوں کے متعلق فرمایا)
کاش! میں نے دریافت کیا ہوتا کہ ان کے بعد خلافت کا کون
حقدار ہے؟ تاکہ کوئی جھگڑا نہ کرتا۔ کاش پوچھا ہوتا کہ آیا انصار
کا بھی اس میں حق ہے؟ اور کاش بھتیجی اور پھوپھی کی میراث
کے بارے میں بھی دریافت کرلیا ہوتا۔ کیونکہ میرے دل میں اس
مسئلہ کے متعلق کچھ شک سا ہے۔

اس تقریر میں انہوں نے متعدد امور پر اظہار افسوس کیا۔ جس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ بیعت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے علیؑ کے گھر کی بے ادبی کی۔ چنانچہ اگلے بیان میں قدرے تفصیل آجائے گی۔[ل]

۲۔ حضرت علیؑ سے اچھی خاصی کشیدگی رہی (اعلن علی الحرب) کا صاف یہی مطلب ہے۔

۳۔ اپنے آپ کو خلافت کے لئے ناموزوں قرار دینے کے باوجود اڑھائی سال تک ڈٹے رہنے پر افسوس کا اظہار فرما رہے ہیں۔ کاش! اس دن عمر یا ابو عبیدہ میں سے کسی کی بیعت کرلی ہوتی اور خود اس مسند پر نہ بیٹھتا۔

۴۔ دل میں یقین تھا کہ میرا خلیفہ ہونا مرضی رسولؐ کے خلاف تھا۔ لہذا اب افسوس کر رہے ہیں کہ کاش! دریافت کرلیا ہوتا

۵۔ انصار کی حق تلفی کا احساس رہا اگر اپنی خلافت کے برحق ہونے کا یقین ہوتا تو انصار کی حق تلفی کا احساس فضول تھا۔

۶۔ مسائل میراث میں لاعلمی کا اظہار (البتہ مسائل میراث میں سے حق فاطمہؑ کو ضبط کرنے کے لئے ایک فرضی حدیث نبیوں کا کوئی وارث نہیں ہوتا بنالی۔ جو کہ صریح حکم قرآنی کے خلاف تھی اس کے علاوہ باقی میراث کے مسائل سے بے خبر تھے حتیٰ کہ کلالہ کے لفظی معنی بھی ان کو تو نہ آتے تھے۔ (جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا ہے۔

اب ذرا پیر و مرید کے نظریاتی اختلاف کا جائزہ لیجئے:

۱۔ پیر کہتا ہے مسائل میراث میں بالکل بے خبر ہوں۔ حتیٰ کہ بعض الفاظ کے معانی بھی نہیں جانتا۔ لیکن مرید کہتا ہے

[ل] اگلے بیان میں اس کے متعلق صـ ۱۶۷ پر بیان ہوگا۔ (منہ)

نہیں جی وہ تو بڑے عالم تھے۔

۲۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآنی آیات کے معانی معلوم نہیں اگر اپنی طرف سے تفسیر بالرائے کر بھی دوں اور منشائے ایزدی کے خلاف ہو تو سمجھ لینا کہ وہ میری اور شیطان کی طرف سے ہے اور یہ کہتے ہیں نہیں جی وہ مشہور مفسر قرآن تھے۔

۳۔ وہ کہتے ہیں میں خلافت کے اہل نہیں ہوں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ وہ سچا طور پر خلیفۂ رسولؐ تھے۔

۴۔ وہ کہتے ہیں میرے ساتھ ایک شیطان ہے جو مجھے راہِ حق سے بھٹکاتا رہتا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں وہ تو بڑے نیک تھے

۵۔ وہ کہتے ہیں ہماری علیؑ سے دشمنی رہی اور ان کے گھر کی بے ادبی بھی ہم نے کی ہے اور یہ کہتے ہیں کہ وہ تو آپس میں شیر و شکر تھے

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ٥ پارہ ۲ قرآن مجید

یاد کرو جب برأت اور بیزاری کریں گے وہ لوگ جن کی (ناحق) اتباع کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے ان کی (ناحق) اتباع کی۔ اور عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے باہمی تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے دنیا میں ان کی اتباع کی تھی وہ کہیں گے کہ اے کاش! ہمارے لئے (ایک دفعہ دنیا میں دوبارہ) پلٹنا ہوتا تو ہم ان سے ایسے بیزار ہوتے جس طرح کہ وہ اب ہم سے بے زار ہو چکے ہیں اسی طرح (خدا) ان کو اپنے اعمال دکھائے گا جو ان کے لئے باعث حسرت ہوں گے اور وہ دوزخ سے نہ نکلنے پائیں گے۔

صراطِ مستقیم کی تلاش

ادھر اُدھر دُور جانے کی ضرورت نہیں اور نہ اندھی تقلید فائدہ مند ہے۔ تعصب اور جنبہ داری کے نظریہ سے بالاتر ہو کر ارشادِ خداوندی پر نظر ڈالئے فرماتا ہے۔ اِذْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ٥ جب تم کسی چیز میں نزاع کرو تو اس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر چھوڑ دو۔

اب ذرا جناب رسالتمآبؐ کی تصریحات کی طرف رجوع فرمائیے۔

۱۔ حدیثِ متواتر[1] ۔ اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَبَيْتِيْ (الحدیث) میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن اور دوسرے میرے اہلبیت یہ ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر اکٹھے وارد ہوں گے۔ اہل بیت کی تعیین کے متعلق صحیح ترمذی میں باب مناقب اہل بیت میں وارد ہے۔

عن عمر بن ابی سلمۃ نزلت آیۃ تطھیر فی بیت ام سلمۃ فدعا النبیؐ فاطمۃؑ وحسناً و

عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ آیتِ تطہیر حضرت ام سلمہ کے گھر اتری پس جناب رسالتمآبؐ نے فاطمہؑ، حسنؑ اور

[1] متعدد طرق سے ثقلین کے عنوان میں بیان کی جا چکی ہے۔ (منہ)

حسینا وعلیؓ خلف ظہرہ فجللہم بکساء ثم قال اللّٰھم ھؤلاء اھلبیتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا قالت ام سلمۃ وانا معھم یارسول اللہ قال انت الی مکانک وانت الی خیر	حسینؑ کو بلایا، حضرت علیؓ اُن کے پس پُشت بیٹھے تھے۔ پس ان سب کو چادر اڑھادی، اور دُعا کی کہ اے میرے اللہ یہ میرے اہلبیت ہیں۔ ان سے رجس کو دُور رکھ اور ان کو پاک رکھ جس طرح حق پاکیزگی ہے۔ اُمّ سلمہ نے عرض کی کہ یارسول اللہؐ! میں بھی ان کے ساتھ ہوں تو آپ نے فرمایا تو اپنے مکان پر رہ تو نیکی پر ہے۔
۱) أعلم أُمّتی مِنْ بَعْدِی عَلی بن اَبِی طالب	میرے بعد میری اُمّت کا بڑا عالم علیؓ بن ابی طالب ہے ص ۸۲ پر ملاحظہ ہو
۲) عَلِیٌّ وِعَاءُ عِلْمِی	علیؓ میرے علم کا ظرف ہے ص ۸۲
۴) عَلِیٌّ خَازِنُ عِلْمِی	علیؓ میرے علم کا خازن ہے ص ۸۲
۵) عَلِیٌّ باب عِلْمِی	علیؓ میرے علم کا دروازہ ہے ص ۸۲
۶) اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَعَلِی بَابُھَا	میں حکمت کا گھر اور علیؓ اس کا دروازہ ہے ص ۸۳
۷) انا مدینۃ العلم وعلی بابھا	میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔ ص ۸۲

اس مضمون کی احادیث جناب رسالتمآبؐ سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور اکابر صحابہ کا اعتراف ہے کہ حضرت علیؓ تمام اُمّت سے زیادہ عالم ہیں۔ ان ہی صفحات پر مذکور ہو چکا ہے اور اس بیان کی ابتدا میں خود علامہ سیوطی کا اعتراف اور حضرت علیؓ کی علمی سبقت کے متعلق بعض صحابہ کی تصدیق غیر مبہم الفاظ میں بیان ہو چکی ہے۔ نیز حضرت علیؓ کے حافظ قرآن ہونے کا ابنِ حجر جیسے متعصب کو بھی اعتراف ہے۔ نیز عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِی ص ۱۲۵ حدیث رسالتمآبؐ بھی ان کے ساتھ ملا لیجئے۔

اب چشمِ بصیرت سے آئینہ انصاف میں حضرات صحابہ کا اعتراف، علامہ سیوطی وابنِ حجر کی تصریحات خود سرکار رسالتؐ کی ہدایات اور واقعات و تاریخی حقائق کی شہادت کے ساتھ ساتھ جنبہ داری کے جذبات سے علیحدہ ہو کر عقل و خرد کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے ورنہ ایک واضح راستہ کو ترک کرکے ایک تاریک گڑھے میں پڑے رہنا دانائی نہیں۔

قرآن شریف کے سو فیصدی عالم، حافظ، قرین اور مفسّر کو محکوم و مفضول بنانا اور بقول خود کش و باستقراء سیوطی ۱/۲ ۲ فیصدی مفسّر کو حاکم و فاضل ماننا عقل و انصاف کا خون نہیں۔ تو اور کیا ہے؟ اس کے علاوہ باقی کمزوریاں جن میں سے مجمل طور پر بعض کا ذکر سیوطی وابنِ قتیبہ کی سابقہ عبارتوں میں گذر چکا ہے وہ بھی زیرِ نظر رکھ کر انصاف فرمالیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی کے عذر کی وضاحت اور اس کا پس منظر واضح کرنے کے لئے بحث میں طول دیا گیا ہے۔ جو خالی از فائدہ نہیں، مقصد یہ تھا کہ ان کے اشتباہی کلمات عوام پر اعزاء بالجہل کا سبب نہ ہوں اور حقیقت حال منظرِ عام پر آجائے۔ لِیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْ بَیِّنَۃٍ ورنہ جو مفسّرین علامہ موصوف نے مشاہیر سے شمار کئے ہیں اور وہ صرف اس

لئے کہ حضرت علیؑ کی امتیازی شان پر پردہ آجائے اور لوگ یہ سمجھ لیں۔ کہ وہ بھی حضرت علیؑ کی طرح ہی عالم تھے۔ اگر ان سب کے جزوی حالات و واقعات کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو کتاب موضوع سے خارج ہو جائے گی۔

مجھے اس کتاب میں خلفاء کے علم سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ علامہ سیوطی کی تحقیقات کے پیش نظر الاتقان و تاریخ الخلفاء کے مطالعہ سے مشہور مفسر اوّل کی علم قرآن میں دسترس جب معلوم ہو گئی (حالانکہ وہ باقیوں سے افضل قرار دیئے جاتے ہیں) تو دوسروں کی علمی استعداد خود بخود معلوم ہو گئی (بقول مشتے نمونہ از خروار) علامہ سیوطی نے بھی جب ان کی علمی تحقیقات کا جائزہ لیا تو طبیعت اتنی سیر ہوئی کہ باقیوں کے تذکرے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور سب کو تقدم وفات کے عذر میں معذور قرار دیکر عہدہ برآ ہو گئے۔

حضرت علیؑ کے متعلق صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ان سے تفسیر قرآن بہت زیادہ مروی ہے اور دو تین روایات بھی حضرت علیؑ کی علمی پوزیشن واضح کرنے کے لئے ذکر کر دیں۔ حالانکہ پہلے دو بزرگواروں یعنی حضرت عمر اور حضرت عثمان کے مقابلہ میں ان کا زمانِ خلافت نصف سے بھی کم ہے اور وہ بھی اس قدر پُر آشوب کہ حضرت علیؑ کو پورے دورِ خلافت میں آرام و اطمینان کی سانس لینے کا موقعہ نہ مل سکا۔ پہلے پہل حضرت امّ المومنین عائشہ نے فوج کشی کر کے بصرہ پر حملہ کر دیا اور حضرت علیؑ کو ان سے نپٹنا پڑا جس میں بروایت سیوطی تیرہ ہزار مسلمان قتل ہو گئے۔ یہ جنگ جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ آپ اونٹ پر سوار ہو کر جنگ میں فوج کی کمان کر رہی تھیں۔ اس کے بعد حضرت علیؑ مدینہ سے کوفہ میں تشریف لائے تو امیر شام معاویہ نے خونِ عثمان کے بہانہ سے جنگِ صفین کا آغاز کر دیا۔ تقریباً ستر لڑائیاں یا اس سے بھی زیادہ لڑی گئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان قتل ہو گئے اس کے بعد خوارج کے ساتھ جنگِ نہروان میں نبرد آزما رہے اور اسی دوران میں شہید کر دیئے گئے باایں ہمہ تفسیر قرآن اور علوم رسالت کے حقائق و دقائق اور رموز و اسرار کے جو نایاب ذخائر اس پاک وجود سے معرضِ ظہور میں آئے وہ انہی کا حصہ تھا۔ سچ ہے برتن سے وہی چیز برآمد ہو سکتی ہے جو اس میں ہو اور دروازہ سے وہی چیز خارج ہوتی ہے جو گھر میں ہو۔

لیکن تعصب کا بُرا ہو۔ جب دیکھا کہ خلفائے ثلثہ سے تو علم میں علیؑ کا پلّہ بھاری نظر آ رہا ہے لیکن کہیں منصف مزاج طبقہ اور حقیقت آشنا گروہ علی کو بنا بر اعلمیّت و افضلیّت کے خلافت بلا فصل کا حقدار نہ تسلیم کر لے۔ لہٰذا حضرت علیؑ کی علمی پوزیشن واضح کرنے کے بعد فوراً ابن مسعود کی فردی عنہ اکثر مما روی عن علی۔ (یعنی ابن مسعود سے (تفسیر قرآن کے متعلق) روایات علیؑ سے بہت زیادہ ہیں) اور آخر بیان میں ابی بن کعب سے بھی بہت کچھ تفسیر قرآن کے منقول ہونے کا اعتراف کر لیا۔ حالانکہ مفتاح السعادہ نے (حبر الامۃ) عبداللہ بن عباس کا قول منقول ہے کہ فرماتے ہیں صد ۸۲

ما علمی وعلم اصحاب محمدؐ فی علم علی الا کقطرۃ فی سبعۃ ابحر — میرا اور محمدؐ مصطفےٰ کے تمام صحابہ کا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسا کہ ایک قطرۂ آب سات سمندروں کے مقابلہ میں۔

یہ مخفی نہ رہے کہ بقولِ سیوطی ابی بن کعب کی وفات زمانِ خلافتِ حضرتِ عمرؓ میں ہوئی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی وفات زمانِ عثمان میں ہوئی۔

اب ایک دفعہ پھر پوچھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ تقدمِ وفات اگر خلفائے ثلٰثہ سے آثار تفسیر کے کم نقل ہونے کا سبب تھی۔ تو ابی بن کعب جس کی وفات حضرت عمر اور حضرت عثمان دونوں سے پیشتر ہے۔ ان سے تفسیر قرآن زیادہ کیوں منقول ہوئی اور اسی طرح ابن مسعود جس کی وفات حضرت عثمان سے پہلے ہوئی وہ حضرت علیؑ سے کیونکہ بڑھ گئے حالانکہ آپ کے تقدمِ وفات والے قاعدہ سے تو ان کو حضرت عثمان سے بھی پیچھے رہنا چاہیئے تھا یہ جائیکہ وہ علیؑ سے بھی سبقت کر جائیں۔

گویا ان کی پوری تگ و دو کا نتیجہ یہ رہا کہ

جہاں اصحاب ثلٰثہ کی علمی کم مائیگی کی خفت کو مٹانا چاہا تو تقدّم وفات کا بہانہ بنا لیا۔

اور جہاں علیؑ کو گھٹانا چاہا۔ تو ابن مسعود کو بڑھانے کے لئے وہ بات بھول گئے اور ان کا تقدم وفات نظر انداز کر دیا

حالانکہ ان دونوں متضاد بیانوں میں کلیہ آٹھ دس سطروں کا فاصلہ ہے۔ اتنا جلدی نسیان ! خدا کی پناہ !

اچھا اس کو جانے دیجئے آگے چل کر فرماتے ہیں۔

وقد ورد عن جماعة من الصحابة غير هولاء اليسير من التفسير کانس و ابی هريرة وابن عمر وجابر وابی موسیٰ الاشعری

ان صحابہ (دس گزشتہ) کے علاوہ باقی ایک جماعت صحابہ سے بھی معمولی تفسیر وارد ہوئی ہے۔ مثلاً انس، ابوہریرہ، ابن عمر، جابر اور ابوموسیٰ اشعری۔

ادھر مشہور مفسّرین میں دسویں نمبر پر ابوموسیٰ اشعری اور یہاں شاذ مفسّرین میں بھی آخری نمبر پر ابوموسیٰ اشعری نہ معلوم کس ہوش و حواس سے " الاتقان لکھ رہے ہیں۔ اتقان والی بات وہی ہوا کرتی ہے کہ جو منہ سے آئے کہتا جائے یہ خیال نہ کرے کہ پہلے کیا کہہ چکا ہوں اور اب کیا کہہ رہا ہوں (میں تو کہوں گا بغضِ علیؑ کا صلہ ہے۔) اچھا ممکن ہے کاتب کا سہو ہو۔ لیکن پھر بھی سوچنے کے قابل بات ہے۔ کہ یہ مفسّرین کو معمولی مفسّر کہا جا رہا ہے اگر تفاسیر کا جائزہ لیا جائے تو ان سے نقل شدہ آثار بہ نسبت اصحاب ثلٰثہ کے کہیں زیادہ ہیں۔ باایں ہمہ وہ عالم اور یہ ان کے مقابلہ میں کم علم۔ وہ مشہور مفسّر اور یہ شاذ راوی کیوں؟

وجہ یہ ہے کہ وہ چونکہ مسندِ اقتدار پر ہیں اور اکثریت کی ہاؤ ہو سے متاثر ہو کر بلا تحقیق ان کو خلافت کا اہل بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ اب واقعات موافق ہوں یا نہ ہوں۔ دلیل ساتھ دے یا نہ دے اس بات پہ اڑ گئے ہیں کہ ان کو عالم کہیں گے اور ضرور کہیں گے۔ کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ اکثریت اپنی ہے کسی کا کیا ڈر ہے؟

حالانکہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ حق کے جویا اور متبع اور اللہ کے شکر گزار تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں۔

صحابۂ رسولؐ کے دلوں میں عزّت و حرمت آلِ رسولؐ

گذشتہ صفحات میں چونکہ وعدہ کر چکا ہوں۔ لہٰذا اس حقیقت کو صرف اہلِ سنّت کے مشہور علاّمہ ابنِ قتیبہ دینوری کے الفاظ سے پیش کرتا ہوں، تاکہ مسئلہ انعقادِ خلافت کے ساتھ صحابہ کا اہلِ بیت سے برتاؤ ذرا زیادہ واضح ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ جناب رسالتمآبؐ کی بے حد سفارشات کے بعد صحابہ نے عترتِ رسولؐ کی حرمت کا کس حد تک لحاظ رکھا

چنانچہ علاّمہ موصوف نے کتاب الامامۃ والسیاسۃ مطبوعہ مصر کی جزء اوّل ص۱۲ سے بیان کو یوں شروع کیا ہے۔

کیف کانت بیعۃ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

وان ابابکرؓ تفقد قوما تخلفوا عن بیعتہ عند علی کرم اللہ وجہہ فبعث الیھم عمر فجاء فناداھم وھم فی دار علی فابوا ان یخرجوا فدعا بالحطب وقال والذی نفس عمر بیدہ لتخرجن اولاحرقنھا علی من فیھا فقیل لہ یا اباحفص ان فیھا فاطمۃ فقال وان، فخرجوا فبایعوا الا علیاً فانہ زعم انہ قال حلفت ان لا اخرج ولا اضع ثوبی علی عاتقی حتی اجمع القرآن فوقفت فاطمۃ رضی اللہ عنھا علی بابھا فقالت لاعھد لی بقوم حضروا اسوء محضر منکم ترکتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ

تحقیق حضرت ابوبکر نے ایک قوم کو نہ پایا جو ان کی بیعت سے کنارہ کش ہو کر حضرت علی علیہ السلام کے پاس جمع تھے۔ پس ان کی طرف عمر کو بھیجا چنانچہ وہ آیا اور ان کو آواز دی۔ درحالیکہ وہ حضرت علیؑ کے گھر میں تھے پس انہوں نے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ پس اس (عمر) نے لکڑیاں منگوائیں اور کہا مجھے قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے نکلو ورنہ میں اس گھر کو جلا دوں گا۔ ان آدمیوں سمیت جو اس کے اندر ہیں پس کہا گیا اے ابوحفص (عمر) اگر اس میں فاطمہؑ (بنتِ رسولؐ) ہو تو بھی؟ (عمر) نے جواب دیا۔ اگرچہ وہ بھی ہو۔ پس سب نکلے اور انہوں نے بیعت کی سوائے علیؑ کے کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ باہر نہ آؤں گا اور اپنے کندھے پر چادر نہ ڈالوں گا۔ جب تک قرآن شریف کو جمع نہ کر لوں گا (اس دوران میں) حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا دروازہ پر کھڑے ہو کر فرما رہی تھیں کہ ہمارے دروازہ پہ آنے والوں میں سے تم سے

لے آلِ رسولؐ کی عزّت و حرمت اسی کا نام ہے اور رسالتمآبؐ کی فرمائشات کی قدر دانی کا یہ طریقہ ہے اور ثقلین کے ساتھ تمسک پکڑنے کا یہ ہی کامیاب پہلو ہے اور یہ ہے آپس میں شیر و شکر ہونے کا مطلب الفاطمۃ بضعۃ منّی من آذاھا فقد آذانی) کو ملاحظہ فرمائیے ۲ے یہ تھا اسلام کا پہلا جمہوری طور پر ووٹوں سے حاصل شدہ منصفانہ طرزِ عمل۔ ڈرا دھمکا کر گھروں کو جلا دینے کی قسمیں کھا کر مسندِ رسالت پہ اسلامی تاجدار اور مقتدائے امّت کی حیثیت سنبھالنے کی عادلانہ روش (منہ) سے مرتے وقت حضرت ابوبکر اس بات کا افسوس کر رہے ہیں کہ کاش حضرت علیؑ کے گھر کی بے ادبی نہ کی ہوتی ص۱۶۴ پر ملاحظہ فرمائیے

وسلم جنازة[1] بين ايدينا وقطعتم امر
كم بينكم لم تستأمرونا ولم تردّ والنا
حقًّا۔ فاتى عمر ابابكر فقال له الا تأخذ
هذا المتخلف عنك بالبيعة فقال ابوبكر
لقنفذ وهو مولى له۔ اذهب فادع لى
عليا قال فذهب الى على فقال ما
حاجتك؟ فقال يدعوك خليفة رسولؐ
الله۔ فقال علىؑ لسريع ما كذبتم[2]
على رسول الله فرجع فابلغ الرسالة
قال فبكى ابوبكر طويلا فقال عمر الثانية
الا تمهل هذا المتخلف عنك بالبيعة
فقال ابوبكر رضى الله عنه لقنفذ عد اليه
فقل له امير المومنين يدعوك لتبايع فجاء
قنفذ فادّى ما امر به فرفع على صوته
فقال سبحان الله؟ لقد ادعى[3] ماليس له فرجع
قنفذ فابلغ الرسالة۔ فبكى ابوبكر طويلا؟
ثم قام فذ قوا الباب فلما سمعت اصواتهم
نادت باعلى صوتها: يا ابت يا رسولؐ الله
ماذا لقينا بعدك من ابن الخطاب وابن
ابى قحافة فلما سمع القوم صوتها وبكاءها
انصرفوا باكين وكادت قلوبهم تنصدع
واكبادهم تنفطر وبقى عمر ومعه قوم
فاخرجوا عليًّا فمضوا به الى ابى بكر فقالوا

زیادہ بدترین انسان آجتک ہمارے دروازہ پر کوئی نہیں آیا تم نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنازہ ہمارے پاس چھوڑ دیا اور اپنے درمیان معاملہ
(خلافت) طے کرلیا نہ ہم سے مشورہ لیا اور نہ ہمیں اپنا حق دیا۔ پس عمر ابوبکر کے
پاس آیا اور کہا کہ اس پیچھے رہے علیؑ سے تو بیعت کیوں نہیں لیتا۔ پس ابوبکر
نے اپنے غلام قنفذ کو حکم دیا کہ جا اور علیؑ کو بلا لا۔ پس اس کا غلام قنفذ،
علیؑ کے پاس آیا۔ تو آپ نے پوچھا کہ کیوں آیا ہے تو کہا کہ آپ کو رسولؐ
اللہ کا خلیفہ بلاتا ہے۔ پس حضرت علیؑ نے فرمایا کہ بہت جلد تم نے
رسول اللہ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ پس اس نے واپس آکر حضرت
علیؑ کا پیغام پہنچایا۔ پس ابوبکر بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر
عمر نے دوبارہ کہا کہ اس بیعت سے پیچھے رہے ہوئے (علیؑ کو)
مہلت نہ دو۔ پس ابوبکر نے قنفذ کو کہا کہ ان کے پاس دوبارہ جاؤ
اور کہو کہ آپ کو امیر المومنین بیعت کے لئے بلا رہے ہیں۔ پس
قنفذ واپس آیا اور علیؑ کا پیغام پہنچایا۔ پھر ابوبکر بہت دیر تک
روتا رہا۔ پھر عمر اٹھا اور ایک جماعت کو ہمراہ لے کر حضرت
فاطمہؑ کے دروازہ پر پہنچے۔ پس انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب بی بی
نے ان کی آواز سنی تو بلند آواز سے ندا دی۔ اے ابا جان اے رسولؐ اللہ
تیرے بعد ہم کو عمر بن خطاب اور ابوبکر بن ابی قحافہ سے کیا کیا
تکلیفیں پہنچی ہیں؟ جب لوگوں نے بی بیؑ کی آواز اور رونا سنا تو
روتے ہوئے واپس چلے گئے اور قریب تھا کہ ان کے دل پھٹ
جائیں اور جگر شگافتہ ہو جائیں اور عمر اس کے ساتھ چند آدمی کھڑے
رہے پس علیؑ کو انہوں نے باہر بلایا اور اپنے ہمراہ ابوبکر کے
پاس لے گئے۔ پس ان سے کہا کہ بیعت کرو۔ آپ نے فرمایا اگر میں نہ
کروں تو کیا کرو گے؟ تو کہنے لگے کہ

[1] جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنازۂ رسولؐ کو چھوڑ گئے تھے (منہ) [2] حضرت علیؑ کے نزدیک ان کا خلیفۂ رسولؐ کہلانا رسول پر بہتان تھا۔ (منہ) [3] حضرت علیؑ کے نزدیک ان کا امیر المومنین کہلانا ناجائز تھا۔

بایع فقال وان انا لم افعل فمه؟ قالوا اذا والله الذی لا الٰہ الا ھو نضرب عنقك قال اذا تقتلون عبداللہ واخا رسولہ قال عمر اما عبداللہ فنعم واما[1] اخو رسولہ فلا وابوبکر ساکت لا یتکلم فقال لہ عمر الا تامر فیہ فقال لا اکرھہ علی شیٔ ما کانت فاطمۃ الی جنبہ فلحق علی بقبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصیح ویبکی وینادی[3] یا بن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی

اس اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ، تیری گردن اڑا دیں گے ۔ آپ نے فرمایا ۔ کہ پھر اللہ کے بندے اور اس کے رسولؐ کے بھائی کو قتل کروگے ؟ تو عمر نے کہا کہ اللہ کا بندہ تو ہم مانتے ہیں لیکن اس کے رسول کا بھائی نہیں مانتے اور ابوبکر چپکے سے یہ باتیں سن رہا تھا ۔ اس کو عمر[2] نے کہا کہ تم اس کے متعلق کوئی حکم کیوں نہیں دیتے ہو ۔ پس اس نے کہا کہ جب تک اس کے پہلو میں فاطمہؑ زندہ ہے میں اسکو کسی بات کیلئے مجبور نہیں کرتا ۔ پس حضرت علیؑ روتے ہوئے اور نالہ و زاری کرتے ہوئے جناب رسالتمآبؐ کی قبر پر تشریف لے گئے اور (قبر کو سینے سے لگا کر) عرض کرنے لگے ۔ اے بھائی جان ! قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں ۔

[1] حضرت علیؑ نے جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ اخوت کا دعویٰ کیا جس کو عمر نے رد کر دیا ۔ اور کہا کہ ہم تم کو رسولؐ کا بھائی نہیں مانتے اب ذرا کتب اہل سنت میں سے اس کا جائزہ لیجئے ۔ اور جناب رسالتمآبؐ کی فرمائشات کے مقابلہ میں حضرت عمر کے قول کا حق بجانب ہونا یا مبنی بر تعصب و عناد ہونا خود سمجھئے

عن مسند احمد بن حنبل من عدۃ طرق ان النبیؐ آخی بین الناس وترك علیا حتی بقی آخرھم لا یری لہ اخ فقال یا رسولؐ اللہ آخیت بین اصحابك ترکتنی فقال انما ترکتك لنفسی انت اخی وانا اخوك فان ذکرك احد فقل انا عبد اللہ واخو رسولہ لا یدعیھا بعدك الا کذاب والذی بعثنی بالحق ما اخرتك الا لنفسی وانت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی وانت اخی ووارثی

مسند احمد بن حنبل سے متعدد طرق سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے لوگوں کے درمیان مواخات (بھائی چارہ) قائم کیا اور حضرت علیؑ کو چھوڑ دیا ۔ یہاں تک کہ یہ سب سے آخر تنہا رہ گئے اور کوئی باقی نہ تھا ، جن کے ساتھ ان کا بھائی چارہ قائم فرماتے تو حضرت علیؑ نے عرض کی یا رسولؐ اللہ ! آپ نے تمام صحابہ کے درمیان صیغہ اخوت جاری کیا اور مجھے چھوڑ دیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ تجھے میں نے اپنے لئے باقی چھوڑا ہے تو میرا بھائی ہے اور میں تیرا بھائی ہوں اگر کوئی تیرے ساتھ بات کرے تو تو کہہ دے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کے رسولؐ کا بھائی ہوں اور اس چیز کا دعویٰ تیرے علاوہ جو بھی کرے وہ جھوٹا ہے ۔ مجھے برحق نبی مبعوث کرنے والے خدا کی قسم تجھے میں نے صرف اپنے لئے ہی باقی رکھا ہے اور تیری مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کی موسیٰ سے تھی صرف فرق یہ ہے کہ میرے بعد نبی اور کوئی نہ ہوگا اور تو میرا بھائی بھی ہے اور وارث بھی ۔

وفی حدیث) قال مکتوب علی باب الجنۃ محمد رسولؐ اللہ علی اخو رسول اللہ قبل ان یخلق اللہ السموٰت بالفی عام

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا کہ خلقت آسمان سے دو ہزار برس پہلے سے جنت پر لکھا ہوا ہے محمد رسول اللہ وعلی اخو رسول اللہ (نقلاً از دلائل الصدق)

[2] پہلے اسلامی راج ، ہمارے امت کا حال دیکھئے اور انصاف کیجئے غالبا اس کا یہی مطلب ہوگا کہ وہ قتل کا حکم دے دے اور ہم اس پر عمل کریں (منہ)

[3] یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کی گوسالہ پرستی اور مرتد ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ کے سامنے کہے تھے قرآنی الفاظ ہیں ۔ ان الفاظ میں اس بات کا کنایہ ہے کہ حضرت علیؑ ان کو مرتد سمجھتے تھے ۔ (منہ) نوٹ حدیث مواخات ترمذی ۔ مستدرک و دیگر کتب صحاح سے بھی منقول ہے (منہ)

یہاں پر پہنچ کر بخاری شریف کے گذشتہ نوٹ سے تطبیق دیجئے۔

وکان لعلی من الناس وجہ حیاۃ فاطمۃ — فاطمہؑ کی موجودگی میں لوگوں کے درمیان کچھ نہ کچھ علیؑ کی عزت تھی۔

فلما توفیت استنکر علی وجوہ الناس — جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں کے چہرے علیؑ سے پھر گئے۔

حضرت ابوبکر بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ فاطمہ کے عین حیات علیؑ کو ہم مجبور نہیں کرتے دیکھیں دیکھا جائے گا۔ نتیجہ خود سمجھ لیں

اس کے بعد ابن قتیبہ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا حضرت فاطمہؑ سے معافی طلب کرنے کیلئے جانے کا تذکرہ کیا ہے۔

فلما قعدا عندھا حولت وجھھا الی الحائط — جب یہ دونو قریب جا کر بیٹھے تو بی بی نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔

فلما سلما علیھا فلم ترد علیھما السلام — پس انہوں نے سلام دیا تو بی بی نے ان کو جواب[1] سلام تک نہ دیا۔

پھر بی بی نے اپنی میراث کے متعلق احتجاج کیا اور فرمایا۔

ما بالک یرثک اھلک ولا نرث محمدا — کیا تیرے اہل تیرے وارث ہوں اور ہم محمدؐ کے وارث نہ ہوں۔

اس کا جواب اس فرضی حدیث سے دیا گیا کہ حضورؐ کا فرمان ہے ہمارا کوئی وارث نہیں ہوا کرتا۔ پس بی بی پاک نے فرمایا۔

ارأیتکما ان حدثتکما حدیثا عن رسول اللہ تعرفانہ وتفعلان بہ قالا نعم فقالت نشدتکما اللہ اما تسمعا رسول اللہ یقول رضا فاطمۃ من رضای وسخط فاطمہ من سخطی فمن احب فاطمہ ابنتی فقد احبنی ومن ارضی فاطمۃ فقد ارضانی ومن اسخط فاطمۃ فقد اسخطنی قال نعم سمعناہ من رسولؐ اللہ قالت فانی اشھد اللہ وملائکتہ انکما اسخطتمانی وما ارضیتمانی ولئن لقیت النبیؐ لاشکونکما الیہ

کیا میں اگر تم کو جناب رسالتمآبؐ کی حدیث سناؤں تو اس پر عمل کرو گے ان دونوں نے کہا۔ ہاں! پس آپ نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ کی قسم دیکر سوال کرتی ہوں کہ کیا تم نے رسولؐ اللہ! کو فرماتے ہوئے سُنا تھا کہ فاطمہؑ کی رضا میری رضا سے اور فاطمہؑ کی ناراضگی میری ناراضگی سے ہے۔ جس نے فاطمہؑ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی جس نے فاطمہؑ کو راضی کیا اس نے مجھے راضی کیا اور جس نے فاطمہؑ کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ دونوں نے کہا۔ ہاں! ہم نے رسولؐ اللہ سے ایسا ہی سُنا ہے۔ پس فرمایا کہ میں اللہ اور اس کے ملائکہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا اور رضامند نہیں کیا اور جب میں نبی سے ملاقات کروں گی۔ تو تم دونوں کی ان کو شکایت کروں گی۔

یہ سُن کر حضرت ابوبکر رونے لگ گئے اور سخت روئے اور بی بی آخر تک یہی فرماتی رہی کہ

واللہ لادعون اللہ علیک فی کل صلوۃ اصلیھا ثم خرج باکیا۔ الخبر — خدا کی قسم میں ہر نماز میں تیرے اوپر بددعا کرتی رہوں گی۔ اور وہ روتا ہوا باہر چلا گیا۔

[1] حالانکہ مسلمان کے سلام کا جواب واجب ہوا کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بی بیؑ کے نزدیک وہ اس قابل نہ تھے۔ منہ

احراق باب فاطمہؑ

ابن قتیبہ دینوری کے متذکرہ روایت کے علاوہ باقی کتب تاریخ میں بھی جناب خاتون جنت سلام اللہ علیہا کے دروازہ کے جلانے کی روایات موجود ہیں۔ مختصراً حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔

(۱) جناب فاطمہؑ نے ابن خطاب سے فرمایا۔ أَتُرَاكَ مُحْرِقًا عَلَيَّ بَابِي یعنی کیا تو میرا دروازہ جلانا چاہتا ہے؟ قَالَ نَعَمْ اس نے جواب دیا۔ ہاں! انساب الاشراف بلاذری جلد ۱ ص ۵۸۶

(۲) إِنَّ عُمَرَ قَالَ لِفَاطِمَةَ۔ مَا أَحَدٌ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِيكِ مِنْكِ وَمَا ذَالِكَ بِمَانِعِي إِنِ اجْتَمَعَ هٰؤُلَاءِ النَّفَرُ عِنْدَكِ أَنْ آمُرَهُمْ يُحْرِقُوا عَلَيْكِ الْبَابَ۔ یعنی حضرت عمرؓ نے فاطمہ سے کہا۔ میں جانتا ہوں کہ تیرے باپ (رسول اللہ) کو تجھ سے زیادہ محبوب کوئی نہ تھا (اور تو ہی اس کی محبوب ترین شہزادی ہے) تاہم مجھے کوئی پرواہ نہیں اگر یہ لوگ (بیعت نہ کرنے والے) تیرے پاس جمع رہے تو میں حکم دوں گا۔ کہ دروازہ کو جلا دیا جائے۔ کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۰

(۳) حضرت عمر خاتون جنت کا دروازہ جلانے کے لئے آ گئے۔ الریاض النضرہ ج ۱ ص ۱۶۷ حاشیہ تاریخ کامل ص ۱۱۲

(۴) قَالَتْ فَاطِمَةُ لَتَخْرُجُنَّ أَوْ لَأَكْشِفَنَّ شَعْرِي وَلَأَعِجَّنَّ إِلَى اللّٰهِ فَخَرَجُوا یعنی جناب فاطمہ نے لوگوں کے ہجوم سے فرمایا میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ میں سر کے بال پریشان کر کے اللہ کی بارگاہ میں فریاد (بددعا) کروں گی۔
تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۰۵

(۵) إِنَّ عُمَرَ ضَرَبَ بَطْنَ فَاطِمَةَ۔ يَوْمَ الْبَيْعَةِ حَتّٰى أَلْقَتْ مُحْسِنًا مِنْ بَطْنِهَا وَكَانَ يَصِيحُ أَحْرِقُوهَا بِمَنْ فِيهَا وَمَا كَانَ فِي الدَّارِ غَيْرَ عَلِيٍّ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ۔ یعنی عمر نے حضرت خاتون جنت کے شکم اطہر کو ایسی تکلیف پہنچائی بیعت کے دن کہ جناب محسن شکم اطہر سے ساقط ہو گئے اور وہ لگاتار چیخ رہا تھا کہ اس گھر کو گھر والوں سمیت جلا دو۔ حالانکہ گھر میں سوائے علیؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے اور کوئی مرد نہ تھا۔ الملل والنحل شہرستانی ج ۱ ص ۲۶

معرفتِ خدا

قال سبحانه في كتابه المجيد
إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ

اللہ سبحانہ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔
تحقیق آسمان و زمین کی پیدائش، شب و روز کا اختلاف لوگوں کی

اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

نفع رسانی کی خاطر دریاؤں میں کشتیوں کی آمد و رفت۔ اللہ کا آسمان سے آب باراں نازل کرکے مُردہ و بنجر زمینوں کو زندہ و آباد کرنا اور ہر قسم کے جانوروں سے اسے معمور کرنا ہواؤں کا چلانا اور آسمان و زمین کے درمیان بادلوں کا مسخّر ہونا ان تمام چیزوں میں دانشمند انسانوں کے لئے معرفتِ خُدا کے دلائل ہیں۔

(۲) أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ

کیا اپنے دلوں میں سوچ نہیں کرتے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں یا ان کے مابین جو اللہ نے خلق فرمایا۔ سب برحق اور بجا ہے۔

(۳) وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوْمِنِينَ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

یقین والوں کے لئے زمین میں اور خود تمہارے نفسوں میں (دلائلِ توحید) موجود ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

واقعاً اگر انسان تدبّر صحیح کرلے اور اپنے ذہن کو موجوداتِ عالم میں اور پھر اپنے جسم و رُوح کے مصالح و مفاسد کی طرف متوجّہ کرے تو جس طرح کوہ و جبل کا ہر کنکرہ، موجِ دریا کا ہر قطرہ، ریگِ صحرا کا ہر ذرّہ، وسعتِ زمین کا ہر چپہ اور شجر و نبات کا ہر پتہ اپنے خالقِ یکتا کا پتہ دیتا ہے۔ یا جس طرح آسمانوں کی بلندیاں، زمینوں کی وسعتیں، شب و روز کے اختلاف میں نور و ظلمات کا فرق، دریاؤں کی طغیانی اور ان کی موجوں پر کشتیوں کی روانی و نفع رسانی، آسمانوں سے برستا ہوا پانی اور اس کی بدولت زمینوں کی سرسبزی و شادابی اور اس پر ہر ذی رُوح کی آبادی اور فیض یابی، ہواؤں کی نگہت و صرصراہٹ اور سرعت و خفت میں فرمانبرداری اور آسمان و زمین کے درمیان بادلوں کی صف آرائی اور اطاعت شعاری، یہ سب چیزیں خالق کائنات کے وجود و حکمت اور علم و قدرت کی غماز ہیں اور ان کا نظام اتم و اکمل اس کی بے ہمتائی اور یکتائی کی براہین قاطع ہیں۔

اسی طرح خود وجودِ انسانی میں بدن کی رگ رگ خون کا قطرہ قطرہ اور جسم کا بال بال بھی خلاقِ عالم کے وجود اور اس کی حکمتِ کاملہ اور قدرتِ شاملہ کا از خود معترف ہے۔ بشرطیکہ سلامتِ ذہن و دماغ اور تدبّر صحیح سے جائزہ لیا جائے۔

اس بنا پر قبلۂ عارفین کعبۂ دینِ متین، امام المتقین حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ آلاف التحیۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں۔ (دیوانِ علیؑ)

وَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ وَفِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

تو اپنے آپ کو ایک چھوٹا سا جسم خیال کرتا ہے۔ حالانکہ تجھ میں ایک عالمِ اکبر پنہاں ہے

وَأَنْتَ الْكِتَابُ الْمُبِينُ الَّذِي بِأَحْرُفِهِ يَظْهَرُ الْمُضْمَرُ

تو وہ کتاب مبین ہے۔ جس کے حرفوں سے رازہائے پوشیدہ

منکشف ہیں۔ اثباتِ صانع کے لئے آنحضرتؐ سے سوال کیا گیا تو فرمایا (جامع الاخبار)

اَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَالرَّوْثَةُ تَدُلُّ عَلَى الْحَمِيْرِ وَآثَارُ الْقَدَمِ تَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ فَهَيْكَلٌ عُلْوِيٌّ بِهٰذِهِ اللَّطَافَةِ وَمَرْكَزٌ سِفْلِيٌّ بِهٰذِهِ الْكَثَافَةِ كَيْفَ لَا يَدُلَّانِ عَلَى اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ

اونٹ و گدھے کے فضلات خارجیہ ان کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اور نشانِ قدم کسی گذرنے والے کا پتہ دیتے ہیں تو عالم علوی اپنی لطافت کے ساتھ اور عالم سفلی اپنی کثافت کے ساتھ اپنے صانع حکیم جو صفتِ کمالِ لطف و کمالِ علم سے متصف ہے، پرکیونکر دلیل نہ ہوں گے۔

حضرت امیر المومنینؑ نے انسان کو عالم اکبر سے تشبیہہ دیکر معرفتِ خدا کا وہ درس دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر وجودِ صانع اور اس کی حکمت و علم و قدرت و وحدانیت کی کوئی اور دلیل ہو ہی نہیں سکتی اور قرآن مجید کی اس لفظ (وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ) کی ایسی جامع تفسیر علیحدہ علیحدہ ان دو گزشتہ شعروں میں سمو دی ہے کہ اس کے مقابلہ میں اس قدر جامع اور پُر از اسرار و رموز کلام کسی فردِ ممکن سے ممکن ہی نہیں۔

پہلے شعر میں عالم اکبر کے ظاہری وجود کے ساتھ انسان کے ظاہری جسم کو تشبیہہ دیکر اس کو عالم اصغر قرار دیا ہے۔

اور دوسرے شعر میں عالم اکبر کو استعارہ کے طور پر کتابِ اکبر اور جسم انسانی کو بنا بر تشبیہہ کے کتابِ اصغر قرار دیا ہے۔

وضاحت

شعرِ اول۔ انسان کا سر بمنزلہ عالمِ علوی اور باقی جسم بمنزلہ عالمِ سفلی کے قرار دیا گیا ہے۔ دو کان بمنزلہ قطبین دو آنکھیں بمنزلہ شمس و قمر، سر پر کثیر التعداد بال بمثل کثیر التعداد ستارگانِ آسمانی کے اور سر میں قوائے باطنہ و قوتِ سامعہ، باصرہ، شامہ و ذائقہ یا دیگر قوئ متخیلہ، واہمہ، عاقلہ، حافظہ وغیرہ بمنزلہ ملائکہ و قدسیین کے اور پھر دماغ اور اس کے پردے اور دیگر اجزائے متفرقہ کو عالم بالا کی قدسی مخلوق سے تشبیہہ حاصل ہے اور جسم کا دایاں۔ بایاں سامنے پیچھے اور اوپر نیچے یہ چھ طرفین جہاتِ ستہ (شمال جنوب، مشرق، مغرب فوق و تحت سے مشابہ ہیں۔

باقی جسم کا ظاہر بمنزلہ زمین کے اور اس کے بال بمنزلہ آبادیٔ نباتات وغیرہ کے، ہڈیاں بمثل پہاڑوں کے خون کی رگیں، نالیاں، دریاؤں اور نالوں کی مثل، قلب انسان مثل کعبہ جہاں کے وعلیٰ ہذا القیاس۔

تو جس طرح اس عالمِ اصغر یعنی وجود انسانی میں تمام اعضائے موجودہ کی زندگی کے لئے ایک قوت کی ضرورت ہے۔ جس کو رُوح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہاتھ ہلتے ہیں۔ قدم بڑھتے ہیں۔ آنکھ دیکھتی ہے۔ کان سنتے ہیں اور زبان بولتی ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔ سب اعضاء اپنی مخصوص ڈیوٹی میں مصروفِ کار رہتے ہیں۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کہ جبتک ان میں وہ قوتِ (روح) موجود ہے اگر وہ رخصت ہو جائے تو یہ سب کے سب بیکار محض ہو جایا کرتے ہیں اور دفن کر دینے کے یا بعض لوگوں کے نزدیک جلا دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ پس وہ حاکم ہے اور یہ سب اعضاء اس کے محکوم ہیں۔

بایں ہمہ وُہ (رُوح) ان تمام اعضاء کے ادراک سے باہر ہے۔ نہ اس کو آنکھ نے دیکھا، نہ اس کی آواز کبھی کان نے سُنی، نہ اُسے ان ہاتھوں نے کبھی محسوس کیا اور نہ ناک نے کبھی اس کی بُو کا ادراک کیا۔ صرف ان قوائے ظاہریہ تک ہی

محدود نہیں۔ بلکہ قوائے باطنہ کا بھی یہی حال ہے نہ وہم و گمان اس کی تعیین کر سکتا ہے اور نہ عقل و دماغ اس کی حد بندی کر سکتا ہے۔

اور ان تمام چیزوں کے باوجود وہ ہے اور ضرور ہے۔ دلیل اس کے (روح کے) وجود کی یہی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو یہ سب اعضاء بے کار ہو جاتے ہیں اور ان کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ان کا باکار اور زیر نظام ڈیوٹی کا انجام دینا اس (روح) کے وجود اور تدبیر کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

جسم کے باقی تمام اعضاء غیر شعوری طور پر اس کے وجود و تدبیر کے قائل اور زبان بے زبانی سے اس کے مدح سرا ہیں اور عقل اپنے شعور و احساس سے اس کے وجود و تدبیر کا قائل و ثناگر ہے۔ لیکن یہ بھی اس کی تحدید و تعیین کا خیال تک نہیں کر سکتا۔ صرف اس کے آثار و افعال سے اس کو جانتا ہے اور اس کی حسن تدبیر کا معترف ہے۔ یہ معلوم اسے نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا ہے اور کس نوعیت کا ہے؟ تاہم ہے ضرور کیونکہ اگر نہ ہوتا تو یہ تدبیر نہ ہوتی۔

پس ان تمام اعضاء کے کاروبار بعض شعوری طور پر اور بعض غیر شعوری طور پر اسی کے زیر حکم، محتاج فرمان اور تابع ارادہ ہیں۔ تو جب یہ چھوٹا سا عالم بغیر ایک مدبر کے نہیں رہ سکتا۔ جس کو نہ دیکھا۔ نہ سنا نہ سونگھا نہ چکھا اور نہ چھوا۔ بلکہ نہ وہم سے اس کا تصور ہوا اور نہ عقل و دماغ سے اس کا ادراک ہو سکا حالانکہ ہے پورے نظام کا مدبر اور ہے بھی ضرور۔ تو اتنا بڑا عالم جس کی وسعتوں کے تصور سے ہمارے عقول عاجز ہیں۔ اتنا بڑا آسمان بلکہ ایک نہیں کئی ہیں۔ اتنی وسیع زمین شمس کا اپنے مقام پر قمر کا اپنے محور پر گردش کرنا، دریاؤں کی روانی، بادلوں کی بارانی اور زمینوں کی آبادیاں۔ غرضیکہ تمام عالم اکبر کا وجود اور اس کے نظام اکمل کی بقاء بغیر ایک مدبر کے کیسے ہو سکتا ہے؟

پس معلوم ہوا کہ عالم اکبر کے وجود کے تمام اعضاء کا اپنی اپنی جگہ پر حس و حرکت کرنا اور اپنی اپنی مخصوص ڈیوٹیوں پر مصروف کار رہنا اس امر کی واضح اور ناقابل تردید برہان ہے کہ ان کا موجد اور مدبر ضرور موجود ہے۔ ورنہ ان کا وجود بیکار اور نظام درہم برہم ہو جاتا۔ نیز اس عالم میں بھی اکثر موجودات غیر شعوری طور پر اس کی ذات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ کناں اور مدح سرا ہیں۔ اور بعض موجودات (ذوی العقول) شعوری طور پر اس کا اعتراف کرنے اور اس کی حمد کرنے پر بے بس ہیں۔ تاہم اس عالم اکبر کے اعضاء و افراد میں سے بھی کسی کو مجال نہیں کہ اُسے دیکھ سکے یا اس کی آواز سُن سکے۔ یا دیگر آلات ظاہریہ اور حواس باطنہ سے اس کا ادراک کر سکے۔

جب اس عالم اصغر (وجود انسانی) کا مدبر حواس و مشاعر کے ادراک سے باہر ہے تو اس عالم اکبر کا خالق و مدبر کس طرح حواس و مشاعر کے ادراک میں آسکتا ہے؟ پس وہ عقل کا اندھا اور بے بصیرت ہے جو یہ کہے کہ خدا نظر آسکتا ہے دنیا میں یا قیامت میں وہ خود فرماتا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ۔ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔

جس طرح اس عالم اصغر (وجود انسانی) کا مدبر روح سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کے تلوے تک ہر ہر عضو کے ہر ہر

حصّہ میں موجود ہے لیکن حسی طور پر کسی جگہ کا پابند نہیں کہا جا سکتا اور وُہ اس عالمِ اصغر کی پُوری کائنات میں بستا ہے۔ کوئی جگہ ایسی نہیں۔ جہاں وُہ نہ ہو۔ ہاں! جس حصّہ میں وُہ نہ ہوگا، وُہ حصّہ جسم سے جُدا کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

اسی طرح عالمِ اکبر کے وجود میں عرشِ علیٰ سے تحت الثریٰ تک بلکہ عرش کے ماوراء سے فرش کے ماوراء تک تمام موجوات کے ہر ہر حصّہ میں اس کی ذات جلوہ گر ہے۔ لیکن تحدیدی طور پر اس کا کہیں بھی ادراک و احساس نہیں کیا جا سکتا۔ پس یہ کہنا بجا اور دُرست ہے کہ قدرت و حکمت کے اعتبار سے ہر جگہ موجود اور تحدید و تعیین کے اعتبار سے ہر جگہ سے دُور ہے قریب اتنا کہ شہ رگ سے بھی نزدیک تر۔ اور آنکھ کی پُتلی سے قریب تر اور بعید اتنا کہ نہ وہاں وہم و گمان کی رسائی اور نہ عقل و خرد کی منیح۔ حتیٰ کہ ذواتِ معصومہ بھی بول اٹھیں مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ معرفتِكَ۔

بحار الانوار جلد ۴ میں ہے۔ ایک شخص نے مولائے کائنات حلّالِ مشکلات حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے خدا کو دیکھا بھی ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کبھی ایسے خدا کی عبادت نہیں کی جسے دیکھا نہ ہو اس نے عرض کی کہ آپ نے کس طرح دیکھا ہے تو آپ نے فرمایا اس کو آنکھیں بصارتِ ظاہریہ سے نہیں دیکھ سکتیں۔ بلکہ اُسے دل بصیرتِ ایمانیہ سے دیکھتے ہیں یعنی آثارِ ظاہریہ اور افعالِ حکیمہ اس کے وجود، علم، حکمت، قدرت کے واضح کرشمے موجود ہیں جن کو دیکھ کر اس کی ذاتِ موصوف بہمہ صفات کے وجود پر اطمینان حاصل کر لیتا ہے۔

عن عبد الله بن سنان عن ابيه قال حضرت ابا جعفرؑ فدخل عليه رجل من الخوارج فقال له يا ابا جعفر اى شيئ تعبد قال الله تعالى - قال رأيته قال بل لم تره العيون بمشاهدة الابصار ولكن رأته القلوب بحقائق الايمان لا يعرف بالقياس ولا يدرك بالحواس ولا يشبه بالناس موصوف بالآيات معروف بالعلامات لا يجور فى حكمه ذالك الله لا اله الا هو فخرج الرجل وهو يقول الله اعلم حيث يجعل رسالته - یعنی راوی حدیث کہتا ہے میں ایک مرتبہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک خارجی نے آکر سوال کیا۔ آپ کس کی عبادت کرتے ہیں؟ فرمایا صرف اللہ کی۔ تو اس نے کہا کہ آپ نے اللہ کو کبھی دیکھا بھی ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ اس کو آنکھیں مشاہدے سے نہیں دیکھ سکتیں؛ البتہ اس کو دل حقائق ایمانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ نہ اس کو قیاس سے پہچانا جا سکتا ہے اور نہ اس کا حواس سے ادراک کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ لوگوں کے مشابہ ہے وہ اپنے افعال و نشانیوں سے موصوف ہے اور اپنی علامات سے پہچانا جاتا ہے وہ اپنے حکم میں ظلم نہیں کرتا پس وہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں ہے یہ سن کر وہ شخص یہ کہتا ہوا نکلا کہ اللہ ہی جانتا ہے جن کو رسالت دیتا ہے۔

اوّل مخلوق

جس طرح اس عالمِ اصغر میں ایک عقل موجود ہے جو مشاعر باطنہ اور حواس ظاہرہ سے روح کا تعارف کراتی ہے۔ عقل کے بغیر نہ تو حواس باطنہ واہمہ و متفکرہ و متخیلہ وغیرہ صحیح کام کر سکتے ہیں اور نہ حواس ظاہرہ میں ارتکاب صحیح و غلط کی تمیز ہوتی ہے بس اسی عقل ہی کی بدولت ظاہری و باطنی ہر دو طاقتیں راہ راست پر گامزن ہوتی ہیں

اسی طرح عالم اکبر میں عقل کُل یعنی نور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہی کام ہے کہ ادھر قدسیین عالم بالا میں ان کی رہبری کے (درس توحید میں) محتاج اور ادھر عالم سفلی میں یہ مخلوق فیوض روحانیہ میں ان کی دست نگر ہے۔

جس طرح عالم اصغر میں (وجود انسانی میں) اوّل مخلوق عقل ہے۔ یعنی بچے کی ترتیب خلقت میں علقہ۔ مضغہ کی منازل طے کرنے کے بعد جب انسانی ڈھانچہ پورا تیار ہو جاتا ہے اور روح کی آمد ہوتی ہے۔ تو پہلے پہل روح عقل و دماغ میں آتی ہے اور اس کے بعد باقی اعضاء میں پہنچتی ہے۔

اسی طرح وجود عالم اکبر میں مخلوق اوّل نور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے اور ان کے بعد باقی مخلوق کی تخلیق ہوئی۔ چنانچہ فرمایا اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ

کتاب جامع الاخبار باب فضائل نبی میں جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسالتمآبؐ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھے اور علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ اور باقی آئمہ کو ایک نور سے خلق فرمایا۔ اور پھر اسی نور سے ہمارے شیعوں[1] کے نور کو پیدا کیا۔ پس ہم نے تسبیح ادا کی تو ہمارے شیعوں نے ہماری اتباع میں تسبیح ادا کی۔ ہم نے اس کی تقدیس بیان کی تو ہمارے شیعوں نے ہم سے سُن کر اس کی تقدیس زبان پر جاری کی ہم نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ورد زبان کیا تو انہوں نے بھی ایسا کیا۔ ہم نے اس کی عظمت کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی ایسا کیا۔ ہم نے اس کی توحید کا اقرار کیا تو انہوں نے بھی اقرار کیا۔

پھر اس کے بعد خداوند کریم نے آسمانوں اور زمینوں کو خلق فرمایا اور فرشتوں کو پیدا کیا۔ پس فرشتے خلقت کے بعد ایک سو برس تک خاموش رہے۔ انہیں تسبیح و تقدیس و تمجید کا علم نہ تھا۔ پس ہم نے تسبیح ادا کی تو ہماری اقتدا میں ہمارے شیعوں نے اور فرشتوں نے تسبیح ادا کی۔

ہم نے تقدیس بیان کی تو ہمارے شیعوں اور ملائکہ نے ہماری تقدیس سن کر زبان پر تقدیس جاری کی۔

ہم نے اس کی عظمت و بزرگی کا ذکر کیا تو شیعوں اور ملائکہ نے ہم سے سُن کر اس کی عظمت کا ذکر زبان پر جاری کیا۔

ہم نے اس کی توحید بیان کی تو ہمارے شیعوں نے اور فرشتوں نے ہم سے سُن کر توحید بیان کی۔

اس سے پہلے ملائکہ کو تسبیح و تقدیس کا علم نہ تھا۔ پس ہم اس وقت سے خدا کی توحید بیان کرنے والے ہیں۔ تو جس طرح اس نے ہمیں اور ہمارے شیعوں کو یہ خصوصی شرف مرحمت فرمایا ہے۔ سزاوار ہے کہ ہمیں اعلیٰ علیّین میں جگہ کرامت فرمائے۔ نیز باب فضائل آئمہ میں بطریق آئمہ اہلبیتؑ جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ آئمہ میرے بعد بارہ ہوں گے۔ پہلا ان میں سے علیؑ بن ابی طالبؑ اور آخری ان کا حضرت قائمؑ ہوگا۔ یہ میرے جانشین اور اوصیاء و اولیاء

---

[1] واضح رہے کہ حضرت آدمؑ سے حضرت عیسٰیؑ تک تمام انبیاء آلِ محمد کے شیعان کے زمرہ میں داخل ہیں۔ اور اسی طرح ان کے اوصیاء بھی (منہ)

ہوں گے اور میرے بعد خدا کی طرف سے حجّت علی الخلق ہوں گے۔ ان کی امامت کا اقرار کرنے والا مومن اور انکار کرنے والا کافر ہوگا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ میری اہلبیت مثل ستارگانِ آسمان کے ہے جس طرح ستارے اہلِ آسمان کے لئے امان ہیں اسی طرح اہلبیت اہلِ زمین کے لئے باعثِ امان ہیں۔

ان روایات کے نقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ ساری خلقتِ ارضی وسماوی کے مدرس و معلّم ہیں جس طرح عالمِ اکبر کی قدسی مخلوق عالمِ انوار میں عقلِ کل اور مخلوقِ اوّل نور محمدؐ مصطفےٰ و آلِ محمدؐ کے انوارِ طاہرہ سے درس و توحید و تمجید اور تسبیح و تقدیس حاصل کرکے حمد و ثنائے ذاتِ خدا میں رطب اللسان ہوئی۔ اسی طرح عالمِ ظاہری میں بھی تاقیامت انہی کی ذواتِ طاہرہ ہادئ کل و حجتِ خدا ہیں۔

اوّل مخلوق کے متعلق جو روایات وارد ہوئی ہیں۔ بعض میں اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللہُ نُوْرِی یعنی سب سے پہلے سرکارِ رسالتؐ کے نور کو خلق کیا گیا وبعض میں ہے اوّلُ مَا خَلَقَ اللہُ الْعَقْلُ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوّل مخلوق عقل ہے دونوں قسم کی روایات کو جمع کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب وجودِ نوری سرکارِ رسالت کی جُدا جُدا تعبیریں ہیں یہی کائنات عالم کی عقل کل بھی ہیں اور نورِ اوّل بھی۔ لہٰذا کوئی منافات روائتوں میں نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات حضرت جبرئیلؑ خدمتِ سرکار رسالت میں موجود ہوتے اور حضرت علیؑ کی آمد پر ان کے لئے بہر تعظیم کھڑے ہو جاتے۔ حضور کے استفسار پر جواب دیتے تھے کہ ان کا میرے اُوپر حق تعلیم ہے۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو جبرئیلؑ نے عرض کی کہ ابتدائے خلقت میں مجھ سے خالق کا خطاب ہوا کہ مَنْ اَنَا وَمَنْ اَنْتَ میں کون اور تو کون ہے؟ تو میں نے جواب دیا اَنَا اَنَا وَاَنْتَ اَنْتَ میں میں ہوں اور تو تو ہے پھر دوبارہ یہی سوال و جواب ہوا جب سہ بارہ سوال ہوا تو میں محوِ حیرت تھا کہ کیا جواب عرض کروں بس اچانک عالمِ انوار سے اسی جوان کو دیکھا اور اس نے مجھے صحیح جواب تعلیم کیا اور فرمایا کہ تو کہہ کہ تو ربِّ جلیل ہے اور میں تیرا عبدِ ذلیل ہوں۔ تیرا نام جلیل ہے اور میرا نام جبرئیل ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تیری خلقت کب سے ہے؟ تو جواب دیا کہ جانب عرش سے ایک ستارہ تیس ہزار سال کے بعد ایک مرتبہ طلوع کرتا ہے اور اب تک میں اس کو تیس ہزار بار دیکھ چکا ہوں۔

پس یہ ذواتِ مقدسہ عقل کل کی حیثیت سے جس طرح عالمِ اکبر کی سفلی مخلوق جن و انسان کے لئے ہادی ہیں۔ اسی طرح عالم کی علوی مخلوق ملائکہ و روحانیین کے لئے بھی رہبر و معلّم ہیں اور ہمارے عقول چونکہ ان عقول کے مقابلہ میں ناقص ہیں لہٰذا جب تک ہم ان سے ربط تعلق پیدا نہ کریں تو فیوض قدسیہ اور انوار معرفتِ الٰہیہ تک رسائی ناممکن ہے۔ کیونکہ ہماری عقلیں تمام اشیاء کے جملہ مصالح و مقاصد کا نہ ادراک کرسکتی ہیں اور نہ صحیح لائحہ عمل از خود مرتب کرکے صراطِ مستقیم

لہ لواعج الاحزان ص۲۰۴ جناب رسالتمآبؐ خود جانتے تھے لیکن اس بات کو منظر عام پر لانے کے لئے اس سے سوالات کئے ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو) واللہ اعلم منہ

کی تعیین کر سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر جس طرح ایک غیر ممیز بچہ عقل و دماغ رکھتا ہے جو بچّے کے حواس کو اچھی و بری اشیاء کی نشاندہی کرتا ہے لیکن اس کی عقل میں جس قدر قوت ہے اسی مقدار کی موزونیّت سے وہ فرائض رہبری انجام دیتی ہے اسے صرف اتنا بتلا سکتی ہے کہ یہ کھانے کی چیز ہے اور یہ پینے کی چیز ہے۔ لیکن یہ صلاحیت اس کی عقل میں ہرگز نہیں کہ بچّے کو اپنی و بیگانی کے درمیان تمیز بھی بتلا سکے۔ لہٰذا اس کا نظریہ ہر خوردنی و نوشیدنی شئ کے استعمال تک ہی محدود رہتا ہے۔ عقل اُسے اس شئے کے نفع و نقصان کا فرق بھی نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ اس میں اس کی بھی صلاحیت نہیں بس وہ صرف شکم پُری کی رہبری ہی کر سکتی ہے۔ اب چونکہ اس بچہ کی رہبر (عقل) رہبری کے دُرست فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ کیونکہ اس میں قوت ہی نہیں۔ لہٰذا اس بچّے کے افعال کی خرابی یا انجام کی برائی میں اس کو ملامت نہیں کی جاتی اور حکومت شرعیہ اور حکومت ظاہریہ دنیاویہ ہر دو کے نزدیک بچہ اپنے افعال کا ذمّہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور نہ وُہ جزا و سزا کا سزاوار گردانا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے افعال کی باز پرس اس کے مربی (ماں، باپ) وغیرہ سے ہوتی ہے اور وہی اس کے ذمّہ دار قرار دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی عقول اس کے مقابلہ میں کامل ہیں۔

اسی طرح پر ہمارے عقول گو کمال کی انتہا کو پہنچ جائیں۔ عقول انبیاء خصوصاً محمدؐ و آلِ محمدؐ کے عقول کاملہ کے مقابلہ میں بالکل ناقص اور خورد سال بچّے کی عقل کی مانند ہیں۔ پس یہ ہماری رہبری اپنی حد رسائی تک تو ضرور کر سکتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے قدم بڑھانا ان کے لئے ناممکن ہے کیونکہ تمام اشیاء ضرورت اور امور حفاظت کے مصالح و مفاسد کا نہ ان کو علم ہو سکتا ہے اور نہ اس کے مطابق فرائض ہدایت انجام دے سکتی ہیں۔ بلکہ تمام روزمرّہ کی چیزوں میں ہر مصلحت و مفسدہ کا ادراک بھی کلی طور پر ان کے بس سے باہر ہے۔ لہٰذا وہ انجام کے ذمّہ دار کیسے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ خود ذاتِ احدیت کا ارشاد ہے۔

وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۔ پ ۲ ع

اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور درحقیقت تمہاری اس میں بھلائی ہو اور ممکن ہے تم ایک شے کو پسند کرو اور درحقیقت وہ تمہارے لئے بری ہو

ہماری عقول آیات متقدمہ کی روشنی میں زمین و آسمان کی ترتیب میں فکر یا جسمانی اعضاء کا نظام مرتب اور اس میں غور صرف اس مرحلہ تک پہنچ سکتی ہیں کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ضرور ہے جو تمام صفات کمال علم، قدرت، حکمت اور قدم و حیات وغیرہ سے متصف ہے۔

لیکن یہ کہ اس کی ذات تک رسائی کیسے ہو؟ اور اس کی مرضات کی تحصیل کیونکر ہو؟ اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ (میں نے جنوں اور انسانوں کو معرفت و عبادت کے لئے خلق کیا ہے) کے فرمان کی تعمیل و امتثال کس طرح ہو؟

یہ چیز ہماری ناقص عقلوں سے دُور تر ہے ۔ لہٰذا ہمیں عقلِ کل (حضرات محمدؐ و آلِ محمدؐ) کی فرمائشات پر عمل کرنا ہوگا۔

منازلِ معرفت

پس معرفت کی پہلی منزل ہے خدا کی پہچان ۔ یعنی آثارِ خارجیہ ظاہرہ کا مشاہدہ اور اعضاءِ جسمانیہ اور اس کے اسرار کا مطالعہ کرنے سے عقلِ انسانی وجودِ صانع حکیم کے اقرار کی رہبری کرتی ہے لیکن اب اس تک رسائی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آگے قدم بڑھانے کے لئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے جو اس کے اوامر و نواہی سے ہمیں روشناس کرائے ۔ لہٰذا

معرفت کی دوسری منزل ہے نبیؐ کی پہچان ۔ تاکہ اس کی فرمائشات پر عمل کرتے ہوئے اور ان کی ہدایات کو لائحہ عمل قرار دیکر اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکیں ۔ لیکن ان کے گذر جانے کے بعد ان کی صحیح پہچان کیسے ہو؟ اور ان کی فرمائشات تک دسترس کیسے ہو؟ جبکہ علم و عرفان کے جابر ہاتھوں نے ان کی اکثر تعلیمات کو زمانہ سے روپوش کر دیا ۔ بہت سی بدعات کا آغاز کر دیا گیا ۔ واقعات و حقائق چھپا دیے گئے ۔ ان کی طرف جھوٹی اور غلط حدیثیں منسوب کر دی گئیں پس

معرفت کی تیسری منزل ہے امامِ برحق حجتِ خُدا کی پہچان ۔ جن کے ذریعہ سے ہم صحیح طور پر جناب نبی علیہ السلام کی تعلیمات حاصل کرکے ان پر عمل کرتے ہوئے خدا کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں

اسی بناء پر زمانِ غیبت میں اس دُعا کا پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے جو اصولِ کافی کے باب غیبت امام میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے ۔

اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنِیْ نَفْسَكَ فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِیْ نَفْسَكَ لَمْ اَعْرِفْ نَبِيَّكَ اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنِیْ نَبِيَّكَ فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِیْ نَبِيَّكَ لَمْ اَعْرِفْ حُجَّتَكَ اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنِیْ حُجَّتَكَ فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِیْ حُجَّتَكَ ضَلَلْتُ عَنْ دِیْنِیْ ۔

اے میرے اللہ مجھے اپنی ذات کی معرفت عطا فرما ۔ کیونکہ اگر تو نے مجھے اپنی ذات کی معرفت عطا نہ کی ۔ تو میں تیرے نبی کی معرفت حاصل نہ کر سکوں گا ۔ اے میرے اللہ مجھے اپنے نبی کی معرفت عطا کر ۔ پس اگر تُو نے مجھے اپنی نبی کی معرفت نہ دی تو میں تیری حجّت کی معرفت حاصل نہ کر سکوں گا ۔ اے میرے اللہ مجھے اپنی حجّت کی معرفت عطا فرما کیونکہ تو نے اگر مجھ کو اپنی حُجّت کی معرفت عطا نہ کی تو میں دین سے گمراہ ہو جاؤں گا ۔

کیونکہ ترتیب معرفت یہی ہے کہ ادلّہ عقلیہ سے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے بعد اس کے احکام پر مطلع ہونے کیلئے نبوّت کی پہچان اور نبوّت کی پہچان کے بعد اس کی تعلیمات صحیحہ حاصل کرنے کے لئے اس کے صحیح جانشین کی تلاش لازم اور واجب ہے توحید کی معرفت کے بعد ہی نظریہ قائم ہو سکتا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ وُہ ہی ہو سکتا ہے ۔ جو انسانی امکانی کمالات میں سے آخری حد پر پہنچا ہوا ہو ۔ ہماری طرح کا عام انسان قطعاً اس عہدہ پر فائز نہیں ہو سکتا ۔ ورنہ اسے پھر ایک اور واسطہ کی ضرورت ہوگی ۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس ۔ اور یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا ۔ پس اس کا انتخاب بھی اللہ ہی کی جانب سے

ہونا ضروری ہے اور جب نبی کی صحیح معرفت ہو جائے گی تو اس کے جانشین کی صحیح معرفت کا امکان ہو سکتا ہے ورنہ اگر نبی کو اپنے جیسا ایک عام انسان فرض کر لیا۔ تو اس کا قائم مقام بھی اپنے جیسا ہی تصور کریں گے لیکن جب نبی کو عام انسانوں سے مافوق حیثیت کا حامل قرار دیں گے تو اس کے جانشین کے متعلق بھی یہی نظریہ ہوگا۔ پس جب نبی کا انتخاب اپنی انسانی دسترس سے بالاتر سمجھیں گے تو اس کے حقیقی جانشین کا انتخاب بھی اپنی پہنچ سے بالاتر جانیں گے اور نبی کے انتخاب کی طرح اس کا انتخاب بھی خدا ہی کی جانب سے ضروری تصور کریں گے۔ پس جب امام کی معرفت جو نبی کا صحیح قائمقام اور روحانی پیشوا ہے ہوگئی تو صراط مستقیم مل گیا۔ ورنہ گمراہی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

جس طرح عقل اس عالم اصغر (وجود انسانی) میں معصومانہ حیثیت کی حامل ہے اسی طرح عقل کل (وجود نبوت) وجود کائنات میں معصومانہ حیثیت کا حامل ہونا چاہیئے اور یہ یاد رہے کہ گذشتہ انبیاء چونکہ محدود اور مختصر ماحول کے نبی تھے۔ لہذا وہ اپنے اپنے ماحول کے لحاظ سے اپنی امتوں کے جزوی عقول کے مقابلہ میں عقل کل تھے اور جناب رسالتمآبؐ چونکہ کائنات عالم کے لئے کلی نبی اور رحمۃ اللعلمین ہیں۔ لہذا یہ کائنات اور عالمین کے مقابلہ میں عقل کل ہیں۔

عقل انسانی کو میں نے اس لئے معصوم کہا ہے کہ باقی تمام اعضاء کی غلطیوں پر اس کی نگاہ رہتی ہے اور جہاں تک اس کی قوت کی پہنچ ہے اور اس کے علم کا تعلق ہے۔ قطعاً فعل بد کے ارتکاب کو بری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور ہرگز افعال ناشائستہ کی دعوت نہیں دیتی ورنہ اگر نیکیوں کو پس پشت ڈال کر اس میں بھی برائیوں کی بجاآوری کا جذبہ ہوتا تو اس کی وجود انسانی میں مبلغ کی حیثیت نہ ہوتی اور خدائی خطابات کا اس سے تعلق نہ ہوتا۔ حالانکہ خدائی خطابات سب عقل والوں کے لئے ہی ہیں۔ پس اس کا اپنا انداز معصومانہ ہے خواہ خواہشات نفسانیہ اس کو مغلوب کر کے کس مپرسی کی حالت میں ہی کیوں نہ چھوڑ دیں۔

نیز جس طرح عقل وجود انسانی میں اعلم ہے تمام اعضاء سے۔

اسی طرح ہر نبی اپنی امت سے اور حضرت رسالتمآبؐ کل کائنات سے اعلم ہیں کیوں کہ وہ ان کے مقابلہ میں عقل کل ہیں۔ یہاں تک پہنچ کر اب حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے دوسرے شعر کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

تمام عالم کا وجود کتاب اکبر اور وجود انسانی کتاب اصغر

آسمان و زمین کتاب عالم کے دو بڑے باب ہیں۔ آسمان میں شمس و قمر ستارے وغیرہ جدا جدا عنوانات ہیں اور ان کے جزوی حالات و فوائد پر از حکمت مصالح اور ان کی اوضاع و حرکات میں عجیب و غریب اسرار فکر کرنے والوں کے لئے گویا ایک قسم کی بین و مفصل تحریریں ہیں اور زمین میں عناصر اربعہ موالید ثلثہ وغیرہ جدا جدا فصول و عنوانات ہیں اور ان میں سے ہر ہر جنس و نوع پر تفصیلی تبصرے کتاب ہستی کا مطالعہ ہے۔

اسی طرح وجود انسانی میں سر اور باقی جسم دو مستقل باب ہیں۔

ایک طرف سر میں ہر ہر عضو علیحدہ علیحدہ فصلیں ہیں اور دوسری طرف جسم کا ہر ہر حصہ جُدا جُدا عنوان ہے اور پھر ہر ہر عضو کی تشریحات و تفصیلات، غوامض و دقائق، فوائد و مصالح اور ان میں عجیب و غریب صنائع و بدائع کتاب وجود کی مبرہن تحریریں ہیں۔

جس طرح طبیعات، فلکیات، عنصریات کا عالم ان حالات و واقعات اور رموز و اسرار پر ایک حد تک مطلع ہو جانے کے بعد پکار اٹھتا ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا میرے اللہ یہ چیز تو نے بے کار اور خالی از حکمت پیدا نہیں کی ہے۔ اسی طرح علم ابدان حاصل کرنے کے بعد اور پھر ہر ہر عضو کی وضع و ساخت پر نظر غائر ڈالنے کے بعد قہراً انسان کی زبان سے نکل جاتا ہے۔ تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کا ہندی طبیب سے مکالمہ

اس مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور طبیب ہندی[1] کا مکالمہ خالی از فائدہ نہیں جس میں زبان امامت سے خلقتِ انسانی کے نایاب اسرار و رموز منظر عام پر آگئے۔ طبیب ہندی سے جب آپ کی ملاقات ہوئی۔ تو رسمی گفتگو کے بعد آپ نے طبیب ہندی سے سوال کیا۔ طب کا عالم ہیں زیادہ ہوں یا تو۔ اس نے عرض کی کہ اس فن میں مجھے زیادہ دسترس حاصل ہے۔ (یہ سُن کر آپ نے اعضائے انسانی کی وضع و ساخت کے علل و مصالح کے متعلق انیس ۱۹ سوالات اس سے کئے جن کے جوابات سے وہ قاصر رہا۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ سر کے اندر چھوٹے چھوٹے گوشے کیوں موجود ہیں۔ یعنی کھوپری کی ہڈی ہموار کیوں نہیں؟

۲۔ سر کے اوپر بال کیوں ہیں؟

۳۔ پیشانی بالوں سے کیوں خالی ہے؟

۴۔ پیشانی پر خطوط (بل) کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔

۵۔ ابرو آنکھوں کے اوپر کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔

۶۔ آنکھوں کی وضع بادامی نمونہ پر کیوں ہے؟ یعنی درمیان میں موٹی اور کنارے باریک۔

۷۔ ناک کو آنکھوں کے درمیان کیوں رکھا گیا ہے؟

۸۔ ناک کے سوراخ نیچے کی طرف کیوں ہیں؟

۹۔ ہونٹ اور مونچھیں منہ کے اوپر کیوں پیدا کی گئی ہیں؟

۱۰۔ دانتوں کی تیزی، داڑھوں کی چوڑائی اور نابوں کی لمبائی کس لئے ہے؟

۱۱۔ مردوں کی داڑھی کیوں ہے؟

[1] الدمعۃ الساکبہ

۱۲۔ ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہیں۔
۱۳۔ ناخنوں اور بالوں کے اندر زندگی کیوں نہیں؟
۱۴۔ دل کی شکل صنوبری کیوں ہے؟
۱۵۔ پھیپھڑا دو حصّوں پر منقسم کیوں ہے؟
۱۶۔ جگر محدب کیوں ہے؟
۱۷۔ گردہ لوبیا کی شکل میں کیوں ہے؟
۱۸۔ گھٹنے پیچھے کو کیوں مڑتے ہیں؟
۱۹۔ قدم درمیان میں اوپر کو کیوں اٹھا ہُوا ہے۔

ان سوالات میں سے ہر ایک کے جواب میں طبیب ہندی یہی کہتا رہا کہ حضور مجھے اس کا جواب معلوم نہیں، آخرکار حضرتؑ نے فرمایا کہ اگر تو نہیں جانتا تو ان کے جواب میں تجھے خود بتلاؤں۔ طبیب ہندی نے عرض کی حضور! آپ بیان فرمائیں تو آپ نے ہر سوال کا جواب اسی ترتیب سے بیان فرمایا۔

ج ۱۔ کھوپری اگر اندر سے ہموار ہوتی تو صداع کا اثر جلدی سے ہوتا۔ اس کے اندر کے گوشے صداع کو دُور رکھتے ہیں۔

۲۔ سر کے بال اس لئے ہیں کہ تیل یا دیگر روغنی مالش کا اثر (مساموں کے ذریعہ سے) اندر پہنچ سکے اور بخاراتِ دماغیہ (انہی مسامات کے ذریعہ سے) بآسانی باہر نکل سکیں، نیز ٹھنڈک یا گرمی کے اثرات حسب ضرورت اندر جذب ہو سکیں۔

۳۔ پیشانی کو بالوں سے اس لئے خالی رکھا گیا ہے کہ آنکھیں اچھی طرح روشنی حاصل کر سکیں۔

۴۔ پیشانی پر خطوط و بل و شکن اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ گرمی کا پسینہ سیدھا آنکھوں میں نہ چلا جائے۔ بلکہ ان شکنوں میں رُک جائے۔ تاکہ ہاتھ کی مدد سے اس کو وہاں سے دُور کر دیا جائے جس طرح زمین میں زیادہ پانی کو دفع کرنے کے لئے نالے یا نہریں کھود دی جاتی ہیں۔

۵۔ ابرُوں کو آنکھوں کے اوپر اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ ضرورت سے زائد دھوپ کو روکے رکھیں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ دھوپ کی شدت کو آنکھوں سے کم کرنے کے لئے بعض اوقات ہاتھ کی ہتھیلی سے بھی مدد لی جایا کرتی ہے۔

۶۔ ناک کو آنکھوں کے درمیان اس لئے رکھا گیا ہے کہ روشنی برابر دو حصّوں میں تقسیم ہو کر ہر آنکھ میں پہنچے۔

۷۔ آنکھ کو بادامی شکل اس لئے دی گئی ہے کہ بصورت بیماری بذریعہ سلائی وغیرہ کے اس میں دوائی ڈالنا آسان ہو۔ اور اس کے ہر دو گوشوں سے مادہ غلیظہ خارج ہوتا رہے۔ ورنہ اگر مستطیل یا مربعہ یا مدوّر ہوتیں تو یہ مصلحت ختم ہو جاتی نہ دوائی ڈالنے میں سہولت رہتی اور نہ غلاظت کا خروج آسانی سے ہو سکتا۔

۸۔ ناک کے سوراخ نیچے کی طرف اس لئے ہیں کہ دماغ سے مواد فاسدہ آسانی سے خارج ہو سکیں اور خوشبو سہولت کے ساتھ دماغ کی طرف جا سکے۔ اگر سوراخ اوپر کی طرف ہوتے تو نہ فضلاتِ دماغ آسانی سے خارج ہو سکتے اور نہ خوشبو دماغ میں آسانی سے پہنچ سکتی۔

۹۔ ہونٹ اور مونچھیں منہ کے اوپر اس لئے قرار دی گئیں کہ دماغ سے خارج شدہ فضلات منہ کو گندہ نہ کریں۔

۱۰۔ داڑھی مردوں کے لئے پیدا کی گئی تاکہ عورتوں اور مردوں میں امتیاز رہے۔

۱۱۔ دانت تیز اس لئے کر دیئے گئے ہیں تاکہ سخت غذا کے کاٹنے میں سہولت ہو اور ڈاڑھوں کا چپٹا ہونا چبانے کی سہولت کے لئے اور نالوں کا بلند ہونا دانتوں اور ڈاڑھوں کے درمیان ربط کی مضبوطی کے لئے ہے۔ جس طرح لمبی دیواروں کے درمیان منارے رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ دیوار زیادہ مضبوط رہے۔

۱۲۔ ہتھیلیاں بالوں سے خالی ہیں تاکہ قوتِ لامسہ صحیح کام کر سکے اگر بال ہوتے تو یہ فائدہ کماحقہٗ حاصل نہ ہو سکتا۔

۱۳۔ ناخن اور بال بڑھ جانے کے بعد بدنما لگتے ہیں۔ لہٰذا ان کو کاٹنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس ان کو زندگی اس لئے نہیں دی گئی۔ تاکہ کاٹنے میں تکلیف نہ ہو۔

۱۴۔ دل کو صنوبری شکل کا اس لئے بنایا گیا ہے کیونکہ وہ الٹا رکھا ہوا ہے اور اس کا باریک کنارہ پھیپھڑے کے اندر داخل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ پھیپھڑے میں آنے والی تازہ ہوا سے اس کو ٹھنڈک پہنچتی رہے اور دماغ کی حرارت اس کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

۱۵۔ پھیپھڑے کو دو حصّوں میں منقسم کیا گیا ہے کہ ہوا کی آمد و رفت سے بآسانی حرکت کر سکے۔

۱۶۔ جگر کو محدب (درمیان کا حصّہ ابھرا ہوا) اس لئے بنایا گیا ہے تاکہ اُوپر سے معدہ کے بوجھ پڑنے سے اس کے بخارات آسانی کے ساتھ اتر سکیں۔

۱۷۔ گردہ کو لوبیا کی شکل اس لئے دی گئی ہے کہ مادہ منویہ کے گرنے کی جگہ ہے۔ منی اس پر قطرہ قطرہ ہو کر گرتی ہے اگر یہ مربع یا مدوّر شکل کے ہوتے تو قطراتِ منی کو ترتیب وار قطرہ قطرہ آگے نہ بھیجتے بلکہ یکجا اور اکٹھا کر دیتے اور وہ لطف جو حاصل ہوتا ہے اس صورت میں حاصل نہ ہو سکتا کیونکہ جب منی صلب سے گردوں پر گرتی ہے تو یہ متواتر سکڑتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔ پس اپنے پھیلاؤ سے باہر آنے والے قطرہ کو آگے بھیج دیا کرتے ہیں۔

۱۸۔ گھٹنوں کا موڑ پیچھے اس لئے ہے کہ اس کا اُلٹ ہوتا تو آگے کی طرف چلا نہ جا سکتا بلکہ چلنے والا منہ کے بل گر پڑتا

۱۹۔ پاؤں کے تلوے درمیان سے اس لئے اُوپر کو اُٹھے ہوئے ہیں کہ جب کوئی چیز زمین پر متوازی طور پر پڑ سکتی ہو تو اس کا زمین پر رکھنا اور اٹھانا ہر دو مشکل ہوا کرتے ہیں۔

ہندی طبیب نے جب امام عالی مقام حضرت صادق آلِ محمد علیہ آلاف التحیہ والسلام کی زبان ہمایوں سے

یہ تفصیل سنی تو فوراً کلمہ توحید و رسالت زبان پر جاری کیا اور آپ کے امام برحق ہونے کا اعتراف کیا۔ ہم نے تفسیر جلد ۱۱ صـ۵۵ پر طبیب ہندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نیز کتاب الدمعۃ الساکبہ میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ ابوحنیفہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا میں نے سُنا ہے کہ تو قیاس کرتا ہے۔ اس نے عرض کی ہاں جی ہاں۔ آپ نے فرمایا۔ تیرے او پر ویل ہو قیاس نہ کیا کر۔ کیونکہ پہلا قیاس کرنے والا شخص ابلیس ہے۔ جس نے آگ کو مٹی پر قیاس کرکے افضل ثابت کیا اگر آدمؑ کے نور کا نار سے موازنہ کرتا تو اُسے اپنی غلطی کا علم ہو جاتا۔ اچھا تو مجھے اپنے سر کے متعلق قیاس کرکے بتا۔

۱۔ کانوں میں تلخی کا مادہ کیوں ہے (قیاس سے جواب دے)

۲۔ آنکھوں میں نمکینی کیوں ہے؟

۳۔ ہونٹوں کا مادہ شیریں کیوں ہے۔

۴۔ اور ناک میں ٹھنڈک کس لئے ہے (یہ چار مادے تلخ نمکین شیریں سرد اپنے مقامات پر کس مصلحت کی بنا پر ہیں) ابوحنیفہ نے عرض کی۔ حضور! مجھے معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تو اپنے بدن کے معاملہ تو قیاس نہیں کرسکتا۔ اور حلال و حرام کے معاملہ میں قیاس کرتا ہے وہ عرض کرنے لگا۔ حضور! مجھے (ازراہِ کرم) سمجھایئے تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

۱۔ اگر کانوں کا مادہ تلخ نہ ہوتا تو حشرات الارض ان کے سوراخوں میں داخل ہو کر نقصان دہ ہوتے۔ خداوند کریم نے ان کو تلخ مادہ دیدیا ہے تاکہ جو کیڑا وغیرہ داخل ہونا چاہے اس مادہ کی تلخی سے متاثر ہو کر مر جائے اور آگے جا کر دماغ کو نقصان و ضرر نہ پہنچا سکے۔

۲۔ آنکھوں کو نمکین مادہ اس لئے دیا ہے کہ یہ دونوں چربی کے ٹکڑے ہیں اگر نمکین نہ ہوتے تو آنسو کی حرارت سے پگھل جاتے

۳۔ ہونٹوں (یا بعض روایات کی بناء پر ہونٹوں کے پانی) کو۔ کھانے پینے کے ذائقہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے شیرینی کا مادہ دیا۔

۴۔ ناک کو ٹھنڈا مادہ اس لئے دیا گیا کہ حسب ضرورت فضلاتِ دماغیہ کو سہولت سے خارج کرسکے۔ اگر اس کا مادہ گرم ہوتا تو بوجہ قرب کے دماغ کو پگھلا کر ختم کر دیتا۔

ان کے علاوہ مفصل کتابوں میں آئمہ طاہرینؑ نے انسانی اعضاء کے مصالح اور ان کی وضع و ساخت پر جو تبصرہ فرمایا ہے اس کے ضبط کے لئے علیحدہ کتاب چاہیے۔ نیز کتاب وجود انسانی کی مفصل تحریرات کے مطالعہ کے لئے بھی ایک کافی وقت درکار ہے لیکن معمولی سے معمولی حد تک بھی معلومات کا حاصل ہو جانا صانع حکیم کی معرفت کا بہترین ذریعہ ہے اس لئے تو مولائے کائنات حلّال مشکلات حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اے انسان تو وہ کتاب مبین ہے جس کے ہر ہر حرف کے اندر معارف و حقائق کے خزانے پنہاں ہیں جو مطالعہ کرنے سے ظہور پذیر ہو کر منظر عام پر آتے ہیں۔

نتیجہ بحث جب اس کتاب صغیر (وجود انسانی) کے مطالعہ اور اس کے اسرار و رموز پر اطلاع ملنے سے

اس کے کاتب (صانع حکیم) کے وجود جامع صفاتِ کمال کا پتہ ملتا ہے کیونکہ اس کا ایک ایک حرف معرفت خدا کا بے پایاں خزانہ ہے۔

تو اس کتاب کبیر (وجودِ عالم) کی تفصیلات پر غور کرنے والا اور اس کے مطالعہ میں شغف رکھنے والا کیونکر تشنہ معرفت رہ سکتا ہے اسی بنا پر تو خالق کائنات نے آفاق اور انفس ہر دو کے مطالعہ کی طرف معرفت حاصل کرنے کے لئے یکساں طور پر دعوت دی ہے چنانچہ اس عنوان میں ابتدائی آیات قرآنیہ کا یہی مطلب ہے

پس جس ہستی کو ان دونوں کتابوں کے تفصیلی مضامین پر عبور حاصل ہو وہ کیوں نہ دعوے کرے سَلُونِی قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ اور یہ بھی واضح رہے کہ مقامِ معرفت جس قدر بلند ہو مقامِ عبودیت میں بھی اسی قدر ارتقاء ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:-

کَفٰی بِیْ فَخْرًا اَنْ تَکُوْنَ لِیْ رَبًّا وَکَفٰی	میرے فخر میں یہی کافی ہے کہ تو ہی میرا رب ہے۔
بِیْ عِزًّا اَنْ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا	اور میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ تیرا ہی عبد ہوں۔

اس کلام پاک میں جو سرکارِ ولایتؑ نے کوزے میں دریا بلکہ قطرہ میں سمندر کو سمو دیا ہے وہ صرف ذوقِ سلیم والے ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ سچ ہے کلام الامام - امام الکلام امام کا کلام باقی تمام کلاموں کا امام ہوتا ہے۔

بہر کیف اس کے صنائع و بدائع پر نظر ڈالنے کے بعد صاحبِ عقلِ سلیم کے لئے راہِ انکار و فرار قطعاً مسدود ہو جاتی ہے۔ لیکن ساتھ یہ یاد رہے کہ جس طرح خدا تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے اور صفات اس کی عین ذات ہیں۔ اسی طرح یہ اعتقاد ضروری ہے کہ نہ وہ دنیا میں نظر آ سکتا ہے نہ آخرت میں نظر آسکے گا جو لوگ اس کے دنیا یا آخرت میں نظر آنے یا آسکنے کے قائل ہیں وہ خدا کی معرفت سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔

ذرا اپنے گریبان میں نگاہ ڈال کر جائزہ لیں کہ جب اپنی رُوح جو اس چھوٹے سے جسم کی مدبّر ہے اس کو نہیں دیکھا جاسکتا تو مدبّرِ عالمین کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ دیکھنے کے لئے آنکھ ہے اور وہ ہر اس شئے کو دیکھ سکتی ہے جو رنگ و مادہ کثیف رکھتی ہو؟ اور جس میں نہ رنگ ہو نہ کثافت ہو آنکھ اس کا قطعاً ادراک کر ہی نہیں سکتی اور خداوندِ کریم نہ کثیف ہے اور نہ رنگ کا محل ہے فرماتا ہے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ۔ جب عام لطیف مخلوق کے دیکھنے سے آنکھ عاجز ہے تو وہ لطیف جو تمام لطائف کا خالق ہے اسے دیکھنے پر کیسے قادر ہو گی؟

یہ بھی خیال رہے کہ عالم خواب میں بھی وہی چیز دیکھی جاتی ہے جو عالم بیداری میں دیکھی جا سکتی ہو۔ پس خدا کا دیکھنا نہ خواب میں ممکن ہے اور نہ بیداری میں۔ نہ اس کی مثال ہے نہ شبیہ۔ نہ وہ تصوّر میں سما سکتا ہے اور نہ وہم میں آسکتا ہے انسان کے وہم و گمان و عقل سے اس کی ذات کا ادراک بلند و بالا ہے چہ جائیکہ آنکھ اس کو ادراک کر سکے تعالی اللہ عما یصفون

البتہ بعض وہ آیاتِ قرآنیہ جن کے پیش نظر لوگ اشتباہ میں مبتلا ہیں ان کا تفصیلی بیان تو اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ اس مقام پر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جب عقل و نقل سے ثابت ہو چکا ہے کہ خالق کائنات، مماثلت و مشابہت مخلوقات سے برتر و بالا ہے جسم و جسمانیت سے مبرا ہے تو اگر کوئی آیت ایسی آجائے جس سے اس کی جسمیت یا مماثلت کا وہم پڑے پس اس کی صحیح تاویل ضروری ہے مثلاً يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ کا یہ معنی غلط ہے کہ وہ اپنی پنڈلی کو ظاہر کرے گا۔ بلکہ یہ لفظ یعنی کشف عن الساق اس دن کی شدت سے کنایہ ہے عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عرش پر بیٹھا ہے بلکہ استویٰ کا معنی استولیٰ ہے یعنی غالب و مسلط ہے اسی طرح یداللہ، وجہ اللہ سے مراد اس کی قدرت، نعمت ذات۔ وغیرہ مراد لئے جا سکتے ہیں بعض مقامات پر حذف مضاف مانا جا سکتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

حقیقت یہ ہے کہ اہلبیت عصمت کے دروازہ سے کنارہ کرنے کی وجہ سے لوگوں نے توحید کا رستہ کھو دیا ہے بخاری والے نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ جب دوزخ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کی آواز بلند کرے گی تو خدا اپنے قدم جہنم میں رکھیگا تب وہ کہے گی بس بس (میں سیر ہو گئی) صحیح بخاری تفسیر سورہ ق نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ ذٰلِكَ

اَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ الاٰية

(جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں)

ضرورتِ نبیؐ

وہ خدا جو کل کائنات کا خالق اور ہر شے پر قادر ہے اس کی ہر صنعت عین حکمت، اس کا ہر فعل عین عدل ازلی ابدی قدیم قیوم، اس کی صفات عین ذات، نہ دیکھنے میں نہ سننے میں، نہ سونگھنے میں نہ چھونے میں اور نہ چکھنے میں آتا ہے۔ ہر جگہ ہے اور ہر جگہ سے بے نیاز ہے، باوجود انتہائی قرب کے انتہائی بعد بھی رکھتا ہے اور باوجود بعید تر ہونے کے قریب تر بھی ہے نہ زبان کا محتاج اور نہ مکان کا خواہشمند ہے۔

چنانچہ بحار الانوار ج میں ہے کہ جب حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے برسرِ منبر دعوے (سَلُوْنِىْ) کیا تو ایک شخص ذعلب نامی نہایت طرار، بلیغ اللسان اور جری القلب حاضرین میں سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ آج علیؑ نے بہت اونچی اور مشکل جگہ پر قدم رکھا ہے میں ان کو لاجواب کر کے (معاذ اللہ) شرمسار کرتا ہوں پس عرض کی! یا امیر المومنینؑ! کیا آپ نے کبھی اپنے

لے ایک شاعر جاہلی سعد بن مالک نے جنگ بسوس کی شدت کے متعلق کہا ہے۔ كَشَفَتْ لَهُمْ عَنْ سَاقِهَا وَبَدَا مِنَ الشَّرِّ الصُّرَاحِ (از حماسہ) منہ

رب کو دیکھا بھی ہے؟ آپؑ نے فرمایا۔ اے ذعلب! میں ایسا نہیں ہوں کہ ان دیکھے خدا کی عبادت کروں۔ اس نے عرض کی پھر کیسے دیکھا؟ ذرا تشریح فرمائیے۔ آپ نے فرمایا! اس کو آنکھیں مشاہدہ بصارت سے نہیں پا سکتیں بلکہ دل بصیرت ایمان سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اے ذعلب! میرے رب کو نہ بعید، نہ متحرک، نہ ساکن، نہ قائم مبنی کھڑے ہونے کے کہا جاتا ہے اور نہ وہ آمد و رفت کی صفت سے متصف ہے، تمام لطافتوں سے لطیف تر لیکن اس کو باریک نہیں کہا جا سکتا۔ تمام عظمتوں سے عظیم تر لیکن جسمیت کے اعتبار سے نہیں۔ تمام بڑوں سے بڑا لیکن عمر کے اعتبار سے اس کو اس صفت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ مقام جلالت میں جلیل تر نہ جسمانی موٹائی کے معنی میں مقامات رحمت میں رحیم تر لیکن نہ رقت قلبی کے اعتبار سے مومن ہے لیکن نہ اقرار لفظی سے مدرک ہے لیکن نہ احساسات سے متکلم ہے لیکن بغیر تلفظ زبانی کے وہ چیزوں کے اندر ہے لیکن نہ خلط کے رنگ میں اور ہر شئے سے خارج ہے لیکن نہ مغایرت کے طور پر اس کے اُوپر کوئی شئے نہیں کہی جا سکتی۔ وہ ہر شئے سے پہلے کوئی شئے اس سے پہلے نہیں۔ اشیاء میں داخل لیکن نہ مظروفیت کے طریق پر اور اشیاء سے باہر ہے لیکن نہ اس طرح کہ جیسے ایک شئے سے دوسری شئے باہر کردی جاتی ہے۔

آپ اس مقام پر پہنچے تو ذعلب بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ ہوش سنبھالنے پر عرض کرنے لگا۔ خدا کی قسم ایسا جواب میں نے کبھی نہیں سنا تھا اور خدا کی قسم اس قسم کا سوال آئندہ ہرگز نہ کروں گا۔

علاوہ ازیں مقام توحید کو بیان کرنے کے لئے نہج البلاغہ یا دیگر کتب خاصہ و عامہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی زبان دُر فشان سے معرفت کے جو دریا جاری ہوئے ہیں وہ صرف آپ ہی کا حصّہ تھا اس جگہ مقام توحید کی طرف اشارہ کرنے کے بعد مجھے یہ کہنا ہے کہ پس ایسی ذات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اور اس کی رضامندی کی تحصیل اور اس کے غضب سے بچاؤ کے لئے کیا طریق اختیار کرنا چاہیے؟ اس غرض کے لئے کیا ہم خود اپنا رستہ معین کر سکتے ہیں یا کسی ایسے واسطہ کی ضرورت ہے جو وہاں سے لاکر یہاں پہنچائے؟ جس کا تعلق اس کی ذات سے بھی ہو اور ہماری پہنچ بھی اس تک ہو سکتی ہو۔ نہ وہ اس کی مثل کیونکہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ اور نہ وُہ پُوری طرح ہمارے مشابہ ہو۔ ورنہ وہ بھی فیوض قدسیہ الٰہیہ کی تحصیل میں ہماری طرح عاجز و محتاج غیر ہو جائے گا۔ پس وُہ ایسا ہو جو خُدا سے اِدھر ہو اور ہم سے اُدھر ہو۔ اُدھر سے لانے کی اہلیت رکھتا ہو اور ادھر پہنچانے میں بصیرت تامہ کا حامل ہو۔ خدا ارشاد فرماتا ہے۔

وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ — اللہ کی طرف پہنچنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو۔

(۱) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ الآیۃ — کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری (محمدؐ کی) اطاعت کرو الخ

(۲) مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا — جو تم کو رسولؐ دے وُہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ الخ

(۳) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى — وہ (رسولؐ) خواہش نفس سے نہیں بولتا وہ تو وحیِ خُدا ہی ہوتی ہے۔

۵۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔	البتہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی کے نفسوں میں سے ایک ایسا رسولؐ مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاکیزہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت (شریعت) کی تعلیم دیتا ہے اور تحقیق وہ اس سے پہلے پوری طرح گمراہی میں تھے
(۶) يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ	اے لوگو! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بھیجا ہوا ہوں) الخ
(۷) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ	پس اللہ اور اس کے رسول اُمّی کے ساتھ ایمان لاؤ الخ
(۸) يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ	اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو۔ حالانکہ تم سنتے ہو۔
(۹) يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ الاٰیۃ	اے رسولؐ! پہنچا دے وہ چیز جو تیری طرف نازل کی گئی ہے۔

ان قرآنی اقتباسات سے معلوم ہوا کہ انسان خوشنودیٔ خالق کے حاصل کرنے میں اس کے رسولؐ کا محتاج ہے۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے شعر سابق (جو اس سے پہلی فصل میں بیان کیا جا چکا ہے) کی تمثیل کی بنا پر جس طرح بدنِ انسانی میں عقلِ انسانی رسولِ باطنی ہے۔ اسی طرح وجودِ عالم میں خدا کا فرستادہ مبلّغ عقلِ کل (رسولؐ ظاہری) ہے اور وہ اعضاءِ بدن کا ہادی ہے اور یہ افرادِ عالم کا رہبر ہے۔ جس طرح عقلِ انسانی انسان کے اعتقاد وعمل دونوں پہلوؤں میں رہبری کے فرائض انجام دیتی ہے۔

اسی طرح خدا کا رسولؐ افرادِ عالم کی ہر دو پہلوؤں سے ہدایت کرتا ہے۔ گو گزشتہ بحث میں اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے لیکن اس مقام پر اعادہ خالی از افادہ نہ ہوگا۔ رسولؐ کے دو کام ہوا کرتے ہیں۔ ایک اصلاحِ عقیدہ اور دوسرے اصلاحِ عمل وہ ایک طرف تو معبود کے متعلق کج اعتقادات کو مٹا کر روحِ معرفت پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف فرائضِ عبدیت کی تعلیم کے ساتھ تمدن ومعاشرہ میں پیدا شدہ خرابیوں کا قلع قمع کرکے اصلاحی طرزِ عمل کا نفاذ کرتے ہیں۔

دیکھئے! حیوانات میں رُوح ہے لیکن عقل نہیں۔ پس وہ رُوح کا احساس رکھتے ہیں لیکن عقل نہ ہونے کی بنا پر عمل میں صحت وخطا کی تمیز ان میں ناممکن ہے اور انہیں حلال وحرام سے آگاہ کرنا محال ہے۔

پس عقل وجودِ انسانی میں روح اور باقی اعضاء کے درمیان واسطہ کی حیثیت سے ہے جس کی بدولت انسان کو حیوانات سے امتیازی شان حاصل ہے لیکن عقل نہ تو روح کے مشابہ ہے بلکہ اس کی مثل ان اعضاء میں کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور نہ باقی اعضاء سے اس کی مشابہت ہے۔ ہاں البتہ رُوح کی رعایا ہونے میں باقی اعضاءِ بدن کے ساتھ شریک ضرور ہے۔ روح سے خود بلاواسطہ استفادہ کرتی ہے اور باقی اعضاء کو فائدہ پہنچاتی ہے اور باقی تمام اعضاء پر اس کو حقِ حکومت حاصل ہے اور ان کی اصلاح کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق اس کو کلی اختیارات حاصل ہیں اگر عقل درمیان میں نہ ہو تو باقی اعضاء کو عام حیوانات کی طرح رُوح کا احساس تو ضرور ہوگا۔ لیکن نفع ونقصان کا ادراک

مصلحت و مفسدہ کا علم یا حلال و حرام، اپنی و پرائی میں تمیز ہرگز نہ ہو سکے گی۔ پس عقل رُوح اور باقی اعضاء ہر دو کے درمیان واسطہ ہے اور ہر دو کی حقیقت سے جُدا ہے اور ہر دو کے ساتھ اتصال کُلی بھی اس کو حاصل ہے۔ نہ اس کے مشابہ ہے، نہ ان کے مشابہ ہے اُس سے اِدھر ہے اور اُن سے اُدھر ہے۔

اسی طرح رسولؐ۔ خدا اور خدائی کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ نہ وہ اُس جیسا ہو سکتا ہے اور نہ اُن جیسا اس کو کہا جا سکتا ہے۔ ہاں اس کی مخلوق عبد رعایا ہونے میں ان جیسا ضرور ہے۔ ہر دو طرف اس کو اتصال حاصل ہے اُدھر سے لاتا ہے اور اِدھر پہنچاتا ہے اور تمام مخلوق کی اصلاح کے لئے اختیارات وسیعہ کا حامل ہے۔ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا جو بھی حکم دیں اس کی اطاعت کرو اور جس سے منع کریں۔ اُس سے رُک جاؤ۔

جس طرح بدن انسانی میں رُوح کی پہلی منزل عقل ہے۔
اسی طرح بدنِ عالم میں معرفتِ خدا کی پہلی منزل رسولؐ ہے۔
جس طرح بدن انسان میں عقل انسانی مخلوقِ اوّل ہے۔
اسی طرح [illegible] عالم میں نور نبوّت مخلوقِ اوّل ہے۔

جن انسانوں کو عقل نہیں دی گئی۔ ان سے جزا و سزا ساقط ہے۔ (جس طرح بچے یا دیوانے)

فی الکافی، عن ابی جعفر علیہ السلام قال لما خلق اللہ العقل استنطقہ ثم قال اقبل فاقبل ثم قال لہ ادبر فادبر ثم قال وعزتی و جلالی ما خلقت خلقا ھو احب الیّ منك ولا اکملتك الا فی من احب اما انی ایاك امر و ایاك انھیٰ و ایاك اعاقب و ایاك اثیب۔

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ جب خدا نے عقل کو پیدا کیا۔ تو اس کو گویا کیا۔ پھر فرمایا آگے بڑھ تو وہ بڑھا پھر فرمایا پیچھے ہٹ تو وہ ہٹا۔ پھر فرمایا کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم تجھ سے محبوب تر کوئی مخلوق میں نے پیدا نہیں کی اور میں نے محبوب ترین انسان میں ہی تجھے کامل کر کے بھیجا ہے۔ میرے اوامر و نواہی کا تعلق بھی تجھ ہی سے ہوگا۔ اور سزا و جزا کا مورد بھی تو ہی ہوگا۔

اسی مضمون کی اور احادیث بھی وارد ہیں۔ جن کو جمع کرنا کتاب میں طول کا باعث ہے۔

ذاتِ احدیت کا عقل سے خطاب کرنا غالباً امر تکوینی ہے نہ کہ تشریعی۔ جس طرح زمین و آسمان سے فرمایا۔ کہ آؤ پس وہ اطاعت کرتے ہوئے آ گئے اور انہوں نے کہا (اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ) جس طرح روز ازل تمام ارواح سے خطاب فرمایا (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ) تو سب نے کہا (بلیٰ) غرض اس سے معرفت و اطاعت کی استعداد کا حسب حیثیت ان میں تفویض کرنا ہے۔ واللہ اعلم

لیکن حدیث کے الفاظ ہیں "آگے آ" تو وہ آیا اور "پیچھے ہٹ" تو وہ ہٹا۔ اس اقبال وادبار کے فرمان کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کے متعلق متعدد توجیہات بیان کی گئی ہیں۔ میں اس مقام پر صرف کچھ ہی عرض کرتا ہوں۔

(۱) عقل سے مراد عقل انسانی ہو تو مقصد یہ ہے کہ عقل سے یہ عہد لیا گیا کہ جب اس کو اپنی حیثیت کے مطابق نفع ونقصان معلوم ہو جائے۔ پھر ایک صورت میں اس کو صاف نفع معلوم ہو اور اسی کام کا دوسرا پہلو اس کی نگاہ میں باعث نقصان ہو تو دریں صورت خدا کا حکم بذریعہ رسولؐ بھی اسی صورت کے موافق ہو جائے۔ جس کے نفع مند اور مطابق مصلحت ہونے کا اُس نے خود فیصلہ کیا تھا۔ پس اس صورت میں عقل کی اطاعت کا نام ہے۔ "آگے آنا (اقبال)" اور اگر خدا کا حکم بذریعہ رسولؐ صورت نفع کے خلاف ہو بلکہ عقل کی نگاہ میں اس کام کا کرنا باعث نقصان ہو تو اپنے نظریہ کے ماتحت ذاتی جذبات کو کچل کر حکم خُدا اور رسولؐ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے "ادبار" پیچھے ہٹنا۔ پہلی صورت کی مثال۔ جیسے نکاح کرنا۔ تجارت کرنا وغیرہ عقل کے نزدیک بھی نافع اور مصلحت دار اور حکم خُدا بھی ایسا ہی ہے پس اس قسم کے امور میں اطاعت شعاری کا نام اقبال ہے اور دوسری صورت کی مثال جیسے جہاد میں سر کٹوانا اپنے کمائے ہوئے ذاتی مال سے خمس وزکوٰۃ ادا کرنا۔ حج کرنا وغیرہ۔ ظاہری اعتبار سے عقل کے نزدیک جانی یا مالی نقصان کا موجب اور خلاف مصلحت ہیں۔ پس اپنے جذبات کو زیر کر کے خدائی حکم کے سامنے سر جھکا دینے کا نام ہے ادبار۔ پس عقل نے عالم تکوین میں دونوں صورتوں میں اطاعت کو قبول کیا اور اب عالم تشریع میں اس سے ہر دو صورتوں میں اطاعت مطلوب ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) عقل سے مراد نور نبوت ہو۔ تو ممکن ہے کہ اقبال سے مراد عالم علوی میں اپنے تقدیس وتسبیح کے فریضہ کو ادا کرنا اور ادبار سے مراد عالم سفلی میں جا کر تسبیح وتقدیس کے علاوہ فرائض تبلیغ انجام دینا۔

(۳) اقبال کا معنی امت کی اطاعت کی صورت میں فرائض تبلیغ کا انجام دینا اور ادبار سے مراد مخالفت ونافرمانی بلکہ ایذا رسانی کے باوجود اپنے عہدہ کو نبھاتے رہنا۔

(۴) سنجیدہ و دانا طبقہ کو تعلیم دینا اقبال سے مراد اور نااہل، اکھڑ مزاج اور کند ذہن طبقہ کو حسن سلیقہ ونرمی و لطف کے ساتھ راہِ راست پہ لانا ادبار سے مراد ہو۔

(۵) تندرستی وصحت کے زمانہ میں اور بیماری و دُکھ کی حالت میں خوشنودئ خالق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کو ہر کام میں ملحوظ رکھنا علی الترتیب اقبال و ادبار سے مطلوب ہوں۔

(۶) حالتِ تجرد میں یعنی مادۂ نفسانیہ، غضبیہ وشہویہ کے بغیر بھی اطاعت خدا کو مقدم قرار دینا اور ان موانع نفسانیہ کو اگر ساتھ ملحق کر دیا جائے، تب بھی اطاعتِ خالق کو ہی مطمح منظر رکھنا علی الترتیب اقبال وادبار ہوں۔
ان کے علاوہ اور توجیہات بھی بیان کی جا سکتی ہیں اور ہر دو صورتوں میں عقل نے اطاعت کا عہد کیا۔

ورنہ ظاہر کے اعتبار سے اقبال و ادبار کی لفظوں کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور ان توجیہات سے معنی صاف واضح ہے واللہ الموفق۔ بہر کیف میرا مقصد حدیث مذکور سے یہ تھا۔ کہ سزا و جزا عقل سے ہی وابستہ ہے۔ اگر عقل نہیں تو نہ سزا ہے نہ جزا۔ اسی طرح اگر مخلوق میں نبی نہ ہو۔ یا کہیں دعوت نبوت نہ پہنچی ہو تو وہ لوگ بھی معذور ہیں اور ان سے بھی ثواب و عقاب ساقط ہے جس طرح بدن انسان میں عقل بلاواسطہ علم کا مورد ہے اور باقی اعضاء اس کے محتاج ہیں۔

اسی طرح وجود عالم میں نور نبوت بلاواسطہ مورد علم ہے اور باقی لوگ ان سے مستفید و مستفیض ہیں۔

وجود انسانی میں اگر عقل نہ ہو تو انسانیت نہیں رہتی۔

اسی طرح وجود کائنات میں اگر نور نبوت نہ ہو تو کائنات نہ رہے۔ (لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ)

عقل انسانی وجود انسانی میں سید الاعضاء ہے۔

اسی طرح نور محمدی جو عالمین کیلئے عقل کل ہیں وہ سید کائنات ہیں۔

حضرت محمدؐ مصطفٰے سے لے کر حضرت حجتؑ تک سب اسی ایک ہی نور کے حصے ہیں۔ جس طرح کہ حدیث نور میں صاف تصریحاً موجود ہے۔ پس سرکار رسالت کے گذر جانے کے بعد کائنات کی بقا صرف اس لئے ہے کہ ابھی اس نور کا ایک حصہ دنیا میں باقی ہے ورنہ کائنات ختم ہو جاتی اور قیامت آجاتی اور وہ حضرت حجۃ العصر صاحب الزمان عجل اللہ فرجہٗ علیہ السلام ہیں۔ جن کی بقا سے دنیا باقی ہے۔ عقل وجود انسانی میں بے لوث بغیر طمع کے اپنا فریضہ منصبی سمجھ کر فرائض تبلیغ انجام دیتی ہے۔

اسی طرح نبی بھی اپنی رعایا کے لئے بے لوث مبلغ و مدرس ہوتا ہے۔

تنبیہ عقل وجود انسانی میں پردۂ غیبت میں رہ کر اپنی رعایا (اعضائے جسمانیہ) پر تبلیغ کے فرائض انجام دیتی ہے اس کے رعایا کی مجال نہیں کہ اس کے وجود کا انکار کر سکیں۔ کیونکہ اس کے آثار و علامات، فیوض و برکات قطعاً اس کے وجود و انکار کی اجازت نہیں دیتے۔

اسی طرح عقل کل حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا آخری جانشین پردۂ غیبت میں رہ کر خلق خدا کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ لہٰذا کسی ہوشمند انسان کے لئے ان کے وجود مسعود کے انکار کی بھی گنجائش نہیں۔

جناب محمدؐ مصطفٰے خلقت نوری کے بعد سے لے کر حضرت عیسٰیؑ کے دور نبوت کے اختتام تک گو تمام کائنات میں غائبانہ وجود رکھتے تھے لیکن تمام گذشتہ انبیاء اور ان کی امتوں پر ان کی تصدیق واجب اور ان کا انتظار لازم اور ان کی آمد کی صورت میں ان کی نصرت کے لئے تیار رہنا ضروری تھا اور بجز اس کے سابق انبیاء کے نبوتیں متزلزل تھیں چنانچہ قرآن مجید میں میثاق نبیین والی آیت اس امر کا صاف اعلان کر رہی ہے پس بعینہٖ اسی طرح ان کے آخری وصی و جانشین کے زمان غیبت میں ان کی امامت کا اقرار اور ان کی نصرت کا عہد بھی واجب و لازم ہے۔ اور بغیر اس کے دعوئ اسلام

وایمان بے سود اور لغو ہے۔

سبحان اللہ! حضرت امیرالمومنینؑ کے مختصر سے جملہ (وفیك انطوی العالم الاکبر) میں معرفت توحید و نبوت و امامت کے کس قدر درس ملتے ہیں "کلام الامام امام الکلام"

نتیجۂ بحث خدا کی معرفت کے بعد انسان کو انسانی کمالات حاصل کرنے اور اپنے خالق کی خوشنودی کے اسباب مہیا کرنے میں نبوت کے دروازہ پر جبہ سائی ضروری ہے اور ضمنی طور پہ یہ معلوم ہو ہی گیا ہے کہ نبی کو کن کن صفات سے متصف ہونا چاہیئے۔

(۱) اپنی تمام رعایا سے اعلم ہو۔ ورنہ فرائض تبلیغ کی انجام دہی میں ناکام رہے گا۔
(۲) اپنے قول و فعل میں معصوم عن الخطا ہو۔ ورنہ تبلیغ بے اثر ہوگی۔
(۳) تمام امت سے صفاتِ کمالیہ میں ممتاز ہو۔
(۴) دعویٰ نبوت کے ساتھ صاحبِ اعجاز بھی ہو۔ تاکہ اس کے دعویٰ کی مقبولیت ہمہ گیر ہو اور ہمارے نبی کے معجزات میں سے قرآن شریف قیامت تک کے لئے باقی و دائم معجزہ ہے۔ اس کے اعجازی پہلوؤں پر ایک مستقل عنوان کے تحت میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

عصمتِ انبیاءؑ

مذہب حقۂ شیعہ اثنا عشریہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت سید الانبیاء جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کل ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی برحق تھے اور ہدایت خلق کے لئے مبعوث کئے گئے تھے پس وہ اپنی امتوں میں جمیع خصالِ حمیدہ کے لحاظ سے ان سے افضل و اکمل تھے اور صاحبانِ اعجاز تھے۔ علمی و عملی افضلیت کے ساتھ وہ اپنے جملہ اقوال و افعال میں اوّل سے آخر تک بچپنے کے دور سے دمِ آخر تک قبل از بعثت اور بعد از بعثت تمام گناہان کبائر و صغائر سے معصوم تھے۔

عصمتِ انبیاء کے متعلق ہمارے علمائے اعلام نے متعدد دلیلیں پیش فرمائی ہیں۔ حتیٰ کہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تحریر کی گئی ہیں۔ اس جگہ میں نے صرف آسان اور عام فہم سادہ طریق پر چند دلیلیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ آسانی سے استفادہ کیا جاسکے۔ علمائے اعلام نے علمی مذاق کے ماتحت جو استدلالات ذکر فرمائے ہیں وہ کافی دقت طلب اور اصطلاحاتِ خصوصیہ کے جاننے پر موقوف ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر ان کو ترک کر دیا گیا ہے۔

(۱) اگر نبی معصوم نہ ہو تو اس کی تبلیغ ناقابلِ قبول ہوگی۔ کیونکہ بغیر عصمت کے اس کی ہر بات میں جھوٹ کا احتمال ہوگا۔

(۲) نبی کے لئے دعویٰ نبوّت کا اثبات بغیر عصمت کے محال ہے کیونکہ اگر اس سے گناہوں کا سرزد ہونا جائز ہو تو منجملہ گناہوں کے ایک کذب بھی ہے تو جب اس کی ہر بات میں کذب کا احتمال پیدا ہوگیا تو دعویٰ نبوّت میں بھی یہی احتمال رہے گا۔ لہٰذا اس کی نبوّت تسلیم نہ ہوسکے گی۔

(۳) اگر نبی گنہگار ہو اور جملہ افعال وکردار میں خدا کا تابع فرمان نہ ہو۔ تو عام رعایا پر اس کی تبلیغ کا کیا اثر ہوگا؟ وہ تو صاف کہہ دیں گے کہ جو کام خود نہیں کرتے ہو، دوسروں کو کس منہ سے کہتے ہو؟ بلکہ خود عمل نہ کرنے والے کی نصیحت موثر ہونے کی بجائے مضحکہ خیز ہوا کرتی ہے۔

(۴) جو شخص عامل نہ ہو لوگوں کے دلوں سے اس کا وقار اٹھ جایا کرتا ہے اور وقار کے بغیر نہ کوئی بات سنتا ہے نہ مانتا ہے۔

(۵) بعثتِ انبیاء کی غرض ہے اصلاح اور جس شخص کو نبی بنایا گیا ہے اگر گنہگار ہو تو وہ خود قابلِ اصلاح ہے۔ لہٰذا اس کی اصلاح کا انتظام بھی ہونا چاہیئے۔ اب یا تو ایسا ہو کہ وہ امّت کی اصلاح کریں اور امت ان کی اصلاح کرے تو یہ ناممکن ہے اور اگر ان کی اصلاح کے لئے کوئی اور نبی مبعوث ہو جو فقط اسی کی اصلاح پر ہی مامور ہو تو اس کے غیر معصوم ہونے کی صورت میں اس کیلئے ایک اور نبی درکار ہوگا اور پھر یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔

(۶) اگر نبی میں عصمت نہ ہو تو وہ گنہگار ہونے میں امّت کے ساتھ برابر ہوجائے گا تو اس صورت میں بلا ترجیح اس کو نبی بنانا اور باقی امّت پر اس کو فوقیّت دینا منافیٔ عدل ہے۔

(۷) اگر نبی خود گناہ سے کنارہ کش نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے احکام کی اہمیّت اس کے اندر نہیں ورنہ ایسا نہ کرتا تو اس صورت میں ممکن ہے کہ ارتکاب گناہ میں دوسروں کا ہمنوا ہوجائے تو پس بجائے ترویج کے تخریب دین کا موجب ہوجائے گا اور یہ حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔

(۸) اگر خود گنہگار ہوگا تو رعایا کے باہمی نزاعات کے فیصلوں میں عدل سے کام نہ لے گا اور تمدنی زندگی خراب ہوجائے گی۔

(۹) اگر بالفرض قبل از بعثت گناہ کرتا ہو اور بعد از بعثت گناہ نہ کرے۔ تاہم رعایا جرأت سے کہے گی کہ کل تک تو تم خود ایسا کیا کرتے تھے اور آج ہم کو منع کرتے ہو۔ لہٰذا نہ رعب نہ وقار نہ اثر اور تبلیغ بے کار ہوگی۔

(۱۰) اگر نبی گناہ صغیرہ کرتا ہو اور وہ قبل از بعثت ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خوفِ خدا اور عدالت کا ملکہ راسخہ نہیں اور اس صورت میں بعد از بعثت بھی اس سے ارتکاب گناہ ممکن ہوسکتا ہے۔ پس وہی خرابیاں لازم آئیں گی جو اوپر مذکور ہوچکی ہیں۔

ان کے علاوہ اور دلیلیں بھی کتب مفصلہ میں مذکور ہیں۔ اس مقام پر انہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

بہرکیف انبیاء کی بعثت کے لئے ضروری ہے کہ خداوندِ عالم جس شخص کو ہماری ہدایات کیلئے بھیجے وہ ہم سے

ہر طرح افضل و اکمل ہو۔ پس ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام انبیاء اپنے اپنے زمانہ میں پوری امت سے اعلم اور گناہان صغیرہ و کبیرہ سے معصوم تھے۔ اور ہمارا رسولؐ چونکہ تمام کائنات کا نبی بلکہ گذشتہ نبیوں کا بھی نبی ہے۔ لہٰذا وہ ماسوا اللہ تمام کائنات سے افضل و اعلم و اکمل ہیں اور ان کے بارہؑ جانشین ان کے قائمقام ہونے کی حیثیت سے آنحضورؐ کے علاوہ باقی تمام کائنات سے افضل و اعلم ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام انبیاء بھی ان کی رعایا کی حیثیت سے ہیں۔ جس طرح کہ وہ جناب رسالتمآبؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رعایا ہیں۔ کیونکہ بادشاہ کے وزرأ یا قائمقام بادشاہ کی پوری رعایا کے حاکم و سردار ہوا کرتے ہیں اور اس کی تصدیق خود حضرت عیسیٰؑ اپنے عمل سے کریں گے۔

جب حضرت محمد مصطفیٰ کا آخری وصی و جانشین گذشتہ تمام انبیاء کے آخری ممتاز نبی کا مقتدا ہوگا (جس کی کتاب و شریعت گذشتہ انبیاء کی شریعتوں کی ناسخ تھی) تو اس سے پہلے کے انبیاء کا مقتدا کیونکر نہ ہوگا؟

اور جب آخری وصیؑ ان سے افضل اور ان کا مقتدا ثابت ہوا تو اس سے پہلے گیارہ اوصیائے رسالتؐ کیونکر افضل نہ ہوں گے۔ اس مقام پر پہنچ کر بعض شکوک و شبہات کا ازالہ ضروری ہے جو بعض آیاتِ قرآنیہ سے عصمت انبیاء پر حرف گیری کا موجب قرار دیئے جاتے ہیں۔ گو ان کی تفصیلی بحثیں اپنے اپنے مقامات پر انشاء اللہ مذکور ہوں گی۔

پس یہ جاننا چاہیئے کہ جب رسول باطنی (عقل) کے صریح فیصلہ سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ حجت خدا یعنی نبیؐ و رسولؐ کے لئے ہر صغیرہ و کبیرہ گناہ سے معصوم ہونا ضروری ہے تو جس جس مقام پر کسی آیتِ قرآنی سے اس کے خلاف کا شبہ ہو تو وہاں مناسب توجیہہ و تاویل ضروری ہے محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑ جانا کجی قلب کی نشانی ہے۔

آئمہ اہلبیتؑ نے اس قسم کے مقامات پر ازالۂ شبہات کے لئے نہایت بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ جو منصف طبائع کے لئے موجب اطمینان ہے۔ کاش امتِ اسلامیہ کا ثقلین (کتاب و عترت) ہر دو کے ساتھ تمسک ہوتا۔ صرف اغراضِ دنیاویہ کی خاطر صرف قرآن کو کافی سمجھنا اور عترتِ رسولؐ سے کنارہ کرنا ہی عقائد اسلامیہ کی تباہی کا موجب ہوا۔ جبھی تو صحیح بخاری میں حضرت ابراہیمؑ جیسے بزرگ پیغمبر پر بھی جھوٹ کے الزامات سے گریز نہیں کیا گیا۔

حضرت ابراہیمؑ پر کذب کا اتہام اور اس کا جواب

چنانچہ بخاری شریف ج ۲ مطبوعہ مصر ص ۱۴۵ کتاب الانبیاء میں ہے۔

عن ابی هريرة قال لم يكذب ابراهيم عليه الصلوٰة والسلام الا ثلث كذبات ثنتين منهن في ذات الله عز وجل۔ قوله اني سقيم وقوله بل فعله كبيرهم هذا وقال بينا هو ذات يوم وسارة اذ اتى على جبار

ابوہریرہ سے مروی ہے وہ کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صرف تین مقامات پر جھوٹ بولا ہے ان میں دو تو اللہ کے لئے (۱) ان کا کہنا کہ میں بیمار ہوں (۲) ان کا کہنا کہ یہ کام ان کے بتوں میں سے بڑے نے کیا ہے (پہلے مقام پر بیمار نہ تھے اور کہا بیمار ہوں اور دوسرے مقام پر کیا خود تھا اور بڑے بت پر تھوپ دیا) (۳) ابوہریرہ نے کہا

من الجبابرة فقيل له ان ههنا رجل معه امرأة من احسن الناس فارسل اليه فسأله عنها فقال من هذه؟ قال اختی، فاتی سارة قال یا سارة لیس علی وجه الارض مومن غیری وغیرك وان هذا سألنی عنك فاخبرته انك اختی۔ فلا تکذبینی (الخبر)

کہ ایک دن وہ اپنی بیوی سارہ کو لے کر جا رہے تھے کہ ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گذرے (بادشاہ) سے کسی نے کہہ دیا کہ یہاں ایک شخص ہے جس کی بیوی بڑی خوبصورت ہے۔ پس اُس نے اُن کو بلالیا اور پوچھا۔ کہ یہ عورت کون ہے؟ آپ نے فرمایا یہ میری بہن ہے پھر اگر سارہ سے کہا (کہ دیکھو) اس روئے زمین پر میرے اور تیرے سوا اور کوئی مومن نہیں ہے اور اس (بادشاہ) نے مجھ سے تیرے متعلق دریافت کیا ہے تو میں نے اس کو بتایا ہے کہ یہ میری بہن ہے (اگر تجھ سے کوئی پُوچھے) تو مجھے نہ جھٹلانا الخ

وفی کتاب النکاح عن ابی هریرة لم یکذب ابراهیم الاثلث کذبات

اور بخاری کی کتاب النکاح میں بھی ہے کہ ابوہریرہ کہتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے صرف تینؑ دفعہ جھُوٹ بولا تھا۔

ایک تیسری حدیث میں بھی ابوہریرہ نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف جھُوٹ بولنے کا الزام لگایا ہے لیکن (معاذاللہ) اس حدیث میں جناب رسالتمآبؐ کی طرف نسبت دیدی ہے (کتاب الانبیاء)

لیکن پہلی دونوں حدیثیں جو اصل عبارت کے ساتھ میں نے نقل کی ہیں۔ ان میں ابوہریرہ نے اپنی طرف سے یہ بات کی ہے اور تعجب ہے کہ مرزا حیرت مترجم اُردو بخاری نے اُن دونو حدیثوں کو بھی جناب رسالتمآبؐ کی طرف سے منسوب کر دیا ہے اور صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ہی ایسا فرمایا ہے (العیاذ باللہ)

انصاف فرمائیے کہ ابوہریرہ کے دامن کو بچانے کے لئے جناب رسالتمآبؐ کی طرف غلط بیانی کی نسبت سے ذرا بھر باک نہیں اور اگر حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم نبی بھی جھُوٹ وغیرہ سے پرہیز نہ کرتے ہوں تو دیگر عامۃ الناس پر جھُوٹ کی حرمت کا فتویٰ کیسے عائد ہو سکے گا۔ حالانکہ خدا ارشاد فرماتا ہے وَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ حضرت ابراہیمؑ کی ملت کی اتباع کا مطلب تو یہ ہے کہ پھر ملت اسلامیہ میں جھُوٹ بولنا جائز ہو۔ کیونکہ ابراہیمؑ خود جھُوٹ بولا کرتے تھے۔ یہ سب اہلبیتؑ عصمت کے دروازہ سے کنارہ کرنے کے نتائج ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان مقامات پر توریہ فرمایا ہے اور یہ تقیہ کی بہترین صورت ہے یعنی ایسی لفظ استعمال کی جائے کہ سُننے والا ظاہری معنی سمجھ کر خاموش ہو جائے اور یہ اپنے دل میں دوسرا معنی مراد لے لے جو مطابق واقع ہو پس اِنِّي سَقِيمٌ سے مراد یہ ہے کہ اگر تمہارے ساتھ تمہارے تہوار میں شرکت کروں تو بیماری روحانی میں مبتلا ہو جاتا ہوں پس وہ لوگ ظاہری جسمانی بیماری سمجھ کر خاموش ہو گئے اور حضرت ابراہیمؑ روحانی بیماری مراد لے کر جھُوٹ سے بچ گئے اور مسلمانوں نے بھی وہی ظاہری معنی مراد لے کر حضرت ابراہیمؑ پر جھُوٹ کا الزام عائد کر دیا۔

اسی طرح بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ساتھ شرط لگادی اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ اس عبارت میں جھوٹ تو درکنار، حضرت ابراہیمؑ نے بہترین طریقہ پر ان کو دعوتِ توحید دی ہے اور مصنوعی خداؤں سے کنارہ کشی کا درس دیا ہے فرمایا ان بتوں سے سوال کرو اگر بول سکتے ہیں تو یہ کام ابتِ تکنیم بھی ان کے بڑے نے کیا ہے اور اگر وہ بول نہیں سکتے ہیں تو یہ کام بھی اُس نے نہیں کیا (یعنی جو بول تک نہیں سکتا وہ کسی کو نفع یا ضرر پہنچانے میں کیسے قدرت رکھ سکتا ہے؟ پس وہ لائق عبادت کیسے ہو سکتے ہیں؟

اور اسی طرح تیسری صورت میں مراد ہے کہ میری دین کی بہن ہے نہ کہ نسبی بہن تاکہ جھوٹ لازم آئے (بشرطیکہ روایت مقبول ہو) اسی طرح چاند، سورج، ستاروں کی پرستش کرنے والوں کے سامنے حضرت ابراہیم کا ھٰذَا رَبِّیْ کہنا استفہام انکاری ہے۔ ہاں بعض وہ آیاتِ قرآنیہ جن میں عصیان، غوایت، ظلم یا ضلالت کی لفظوں کو انبیاء کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر میں متعدد مقامات پر ایسا ہوا ہے وہ دقت طلب ضرور ہیں

عصمتِ آدم

پس جس طرح خداوند کریم کا جسم و جسمانیت سے مبرا ہونا ادلہ قطعیہ سے ثابت ہے اور اس کے خلاف وہم ڈالنے والی آیات کی صحیح و مناسب توجیہہ ضروری ہے اسی طرح جب عصمت انبیاء قطعی طور پر ثابت ہے تو اس کے خلاف جہاں وہم پیدا ہو سکتا ہو وہاں مناسب تاویل کرنا ضروری و لازم ہے حضرت آدمؑ کے متعلق وارد شدہ شبہات کے حل کے لئے مقدمہ کے طور پر مندرجہ ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) حضرت آدمؑ کے سجدہ سے انکار کرنے کے بعد ہی آدمؑ کو گمراہ کرنے کے متعلق قسمیہ طور پر اس نظریہ کا ابلیس نے اظہار کیا تھا۔ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ تیری عزت کی قسم میں ان کو ضرور گمراہ کروں گا۔

(۲) اس حتمی اور تاکیدی اعلان کے بعد خود ابلیس نے بعض لوگوں کے متعلق ان صریح اور غیر مبہم لفظوں میں استثناء کر دیا۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ مگر ان میں سے تیرے با اخلاص بندے (ان کو گمراہ نہ کروں گا یا نہ کر سکوں گا)

(۳) انبیاء کے متعلق خداوند کریم نے یوں ارشاد فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت فرمائی فبھداھم اقتدہ پس تم بھی انہی کے رستہ پر چلو۔

(۴) مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ جس کو اللہ ہدایت کردے وہ ہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور نیز فرمایا فَمَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى جو میری ہدایت پر ہو نہ وہ گمراہ ہوتا ہے اور نہ شقی ہوتا ہے۔

(۵) حضرت آدم کے لئے یہ بھی ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ الاٰیۃ۔ تحقیق اللہ نے حضرت آدم کو چن لیا پس حضرت آدمؑ مہتدین (ہدایت یافتگان درِ خدا) سے بھی تھے اور مخلصین سے بھی تھے ورنہ مصطفےٰ نہ ہو سکتے چونکہ ہدایت یافتہ خدا تھے۔ لہٰذا ضلالت ان کے پاس نہیں آ سکتی۔ پس اُضِلَّنَّهُمْ سے مستثنیٰ تھے اور چونکہ مخلصین میں سے تھے۔ لہٰذا اغوائے شیطانی کا اثر ان پر نہیں ہو سکتا پس لَاُغْوِيَنَّهُمْ سے مستثنیٰ ہیں۔ اور یہ

چیز مسلّم ہے کہ ہدایتِ خدا اور اخلاص دونوں جڑیں اور اصل ہیں ۔ تمام نیکیوں کی اور اسی طرح اضلال اور اغواء شیطانی جڑیں اور اصل ہیں تمام بدکاریوں اور برائیوں کی ۔

پس جب حضرت آدمؑ سے ضلال اور غوایت جو من جانب شیطان ہیں ۔ کی نفی ہو گئی تو ظلم اور عصیان جو ۔ ان کے فروعات میں سے ہیں خود بخود منتفی ہو گئے ۔

باقی رہا حضرت آدمؑ کا جنّت میں رہنا یا وہاں سے چلا جانا اس بات کا تعلق نہ حقوق الناس سے ہے اور نہ حقوق اللہ سے بلکہ اس کا تعلق صرف اس کے ذاتی نفع و نقصان سے تھا جو دنیاوی زندگی سے وابستہ ہیں پس نہ ان سے امر و نہی کا تعلق امورِ دینیہ کی طرف راجع تھا اور نہ اُن کے خلاف کرنا حقوق العباد یا حقوق اللہ کی پامالی کا موجب تھا ۔

حضرت آدمؑ کی خلقت ہی زمین کے لئے تھی جسطرح ارشاد ہے (اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں ۔ پس ان کو ابتداءً ایک مقام خاص (جنّت) میں سکونت دی گئی کیونکہ ابتداء آفرینش سے ان کو اتنی وسیع و عریض زمین میں بھیجنا ان کے مقتضائے بشریت کے اعتبار سے ان کے لئے باعثِ وحشت تھا ۔ لہٰذا ایسی جگہ ان کی ابتدائی رہائش کا انتظام کیا گیا جہاں ملائکہ کی تسبیح و تقدیس دمیل جول یا باغ جنّت کی سیر و تفریح سے ان کی طبیعت قدرے مانوس ہو جائے اور ان کو بشری قوتیں شہویہ ، غضبیہ واہمہ ، عاقلہ وغیرہ سب عطا کر دی گئی تھیں

اب اس مقام پر یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ہدایت دو قسم پر ہے ایک ہدایت عقل انسانی اور دوسرے ہدایت خدا جو انبیاء کو بذریعہ وحی و الہام اور عامۃ الناس کو بذریعہ انبیاء ہوا کرتی ہے ۔

عقل انسانی کی ہدایت صرف امورِ ظاہریہ تک محدود ہوتی ہے جو تجربہ کے بعد انسان کو عمل میں مضبوطی کی دعوت دیتی ہے اور بخلاف اس کے ہدایتِ الٰہیہ وہ تجربہ کی محتاج نہیں بلکہ پہلی مرتبہ سے ہی اطمینانی طور پر اس کو ماننا اور اس کو واجب العمل قرار دینا عقل انسانی کا فریضہ ہے اس سے ذرا ادھر اُدھر ہونا خطا کاری و عمدی غلطی قرار دی جاتی ہے کیونکہ ہدایتِ خدا میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہوتا تاکہ محتاجِ تجربہ ہو پس اس کے خلاف کرنا گناہ اور ظلم ہے ۔

ہدایتِ عقل گو وہ بھی خدا کی عطا کردہ استعداد ہی سے ہوتی ہے ۔ لیکن اس میں پختگی خدا خود ہی بعد تجربہ کے پیدا کرتا ہے اور یہی دستور خداوندی ہے ورنہ اگر اس میں بھی غلطی کا امکان نہ ہوتا اور پہلی دفعہ سے ہی پختہ و استوار ہوتی تو کبھی کوئی انسان کسی معاملہ میں خطا کار نہ ہوتا ۔

ایک حکیم بڑی محنت سے معجون تیار کرتا ہے یا کوئی کشتہ یا دوائی بناتا ہے اور اُسے تسلّی و اطمینان ہے کہ یہ دوا فلاں مرض کے لئے سو فیصدی مفید ہے بلکہ اکسیر اعظم ہے دوائی کے تیار ہو جانے کے بعد اگر اس کے دل میں ایک وسوسہ سا پیدا ہو جائے مثلاً اس کی فلاں جزء شاید درست حل نہ ہوئی تھی یا اشیاء کے اوزان کی مناسبت میں فرق تھا تو اس وسوسہ کے

پیدا ہوتے ہی وہ اس دوائی کو بے کار قرار دیکر ردی کی ٹوکری میں پھینک دے گا اور جس بیماری کے لئے وہ نسخہ اس نے اپنی محنت شاقہ سے تیار کیا تھا وہ اس کو اپنے کسی عزیز دوست کو لاحق ہو جائے اور اس حکیم سے اسی دوائی کا مطالبہ کیا جائے تو ہرگز وہ یہ دوائی استعمال کرنے پر تیار نہ ہوگا۔ گو عقل اسے پکار پکار کہے کہ دوائی بالکل درست تیار ہے۔ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن وہم کی وجہ سے اس کو قطعًا اطمینان نہ آئے گا۔

ہاں اگر یہی دوائی ایک دفعہ یا چند مرتبہ استعمال ہو چکی ہو اور مفید نتیجہ اس سے برآمد ہو تو اب ہزاروں وسوسے آتے رہیں۔ اوہام کا مقابلہ ہوتا رہے شکوک پڑتے رہیں۔ اس کا تجربہ سے پیدا شدہ اطمینان قطعًا زائل نہ ہوگا اور عقل کے قطعی فیصلہ پر عمل کرنے میں اسے کوئی تامل نہ ہوگا (خواہ اس دفعہ نتیجہ خاطر خواہ نہ بھی ہو)

اسی طرح ایک زمیندار محنت شاقہ سے زمین کو نرم و ہموار کرے اور عقلی نظریہ کسی خاص جنس کے متعلق رکھتا ہو پس پوری محنت کر چکنے کے بعد اس زمین کے زرخیز ہونے کے متعلق اس کو شک پڑ جائے تو ہرگز اس میں قیمتی جنس کی کاشت کرنے سے اولاً گھبرائے گا کہ کہیں بیج ہی تلف نہ ہو جائے لیکن تجربہ کے بعد ہزار وہم آئیں۔ پرواہ نہ کرے گا۔

بہر کیف مقصد یہ ہے کہ قوتِ عاقلہ کی دنیاوی امور میں ہدایت گو اللہ کی جانب سے ہی ہے لیکن اس کے نظریہ کا راسخ ہونا تجربہ کا محتاج ہے۔ آپ دنیاوی امور میں جس جس چیز کو لیں گے عمومًا آپ کو یہ یقین کرنا پڑے گا کہ عقلی نظریہ محتاج تجربہ ضرور ہے۔

پس حضرت آدم کا اسی عقلیہ نظریہ کے ماتحت یہ فیصلہ تھا کہ اس درخت کے پاس نہیں جانا۔

اور یہ اس لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ اس ماحول میں رہنے والے اس سے گریز کرتے ہیں اور اس کے پاس نہیں جاتے اور یا اس لئے کہ ابتدائی دَور کے پیش نظر ان کو اللہ نے ہی بذریعہ وحی جتلا دیا کہ یہ باعث نقصان ہے اس کے قریب نہ جانا فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ورنہ تم کو خسارہ رہے گا۔ ظلم کا معنی خسارہ ہے۔

ان کے اس عقلی نظریہ کو اللہ نے اپنی طرف اس لئے منسوب فرمایا کیونکہ استعدادات عقلیہ بھی اللہ کی جانب سے ہیں اور عقل بھی اللہ ہی کی طرف سے انسان کے لئے رسولِ باطنی ہے اور اس عقلی حکم کو اللہ کا حکم کہا جایا کرتا ہے۔ مثلاً عام کہتے ہیں۔ اللہ کا حکم ہے۔ کماؤ اور کھاؤ۔ مقصد یہ ہے کہ چونکہ استعدادِ عقل اللہ کی طرف سے ہے اور اس کا یہی فیصلہ ہے تو پس اللہ کا یہی حکم ہے۔

ابلیس چونکہ حضرت آدم سے حسد کرتا تھا۔ کیونکہ زمین کی خلافت قوم جن سے لے کر حضرت آدمؑ کو دی جا رہی تھی اور پھر حضرت آدمؑ کی عزت و وقار یہ کہ ملائکہ کو ان کے سامنے جھکا دیا گیا جس سے وہ اور زیادہ جل بھُن گیا اور خود انکاری و فراری ہو گیا۔ اور تیسرے ان کی تعظیم نہ کرنے کی وجہ سے راندۂ بارگاہ و مستحق لعنت بھی ہو چکا تھا۔

اپنے حسد کی بھڑاس کسی اور ذریعہ سے تو نکال نہیں سکتا تھا اسے معلوم تھا کہ یہ مہدی خدا اور مخلص و مصطفٰے

بنی ہے لہٰذا اس کو ضلال دغی میں پھنسانا محال ہے خود اس کا اپنا اعتراف بھی ہے کہ مخلص و برگزیدگان خدا کو میں گمراہ نہ کر سکوں گا اور ذاتِ احدیت کا بھی ساتھ ساتھ اعلان ہو چکا تھا کہ میرے مخصوص بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہ ہوگا

پس امورِ دینیہ میں حضرت آدمؑ کو دھوکہ دینا اور ان کو صراطِ مستقیم سے ہٹانا اور عباداتِ الٰہیہ سے ان کو منحرف کرنا قطعاً اس کے لئے ناممکن تھا۔ اب اس نے یہ سوچا کہ دنیاوی زندگی میں ان کی تلخی پیدا کر دوں تاکہ کئی دن مبتلائے مصیبت رہیں۔

ان کے عقلی نظریہ میں چونکہ بذریعہ وسواس کے رخنہ اندازی کی گنجائش تھی کیونکہ حد تجربہ کو نہ پہنچا تھا لہٰذا اس کو بدلنے کی کوشش میں لگ گیا وہ اس معاملہ میں پرانا خرانٹ تھا اور تجربہ سے اس کا باعث نقصان ہونا جانتا تھا۔ لگاتار دونوں کے سامنے قسمیں کھا کھا کر اپنی خیر خواہی جتلانے۔ آخر کار حضرت آدمؑ نے اس کی قسموں سے متاثر ہو کر اس کے وسواس کی وجہ سے بمشورہ حضرت حواؑ اس عقلی نظریہ کو نظر انداز کر کے اس کی خلاف ورزی کر لی جس کے نتیجہ میں انہیں فوراً اکیلا اس بنجر زمین پر آنا پڑ گیا۔ اگر ایسا نہ کرتے تو کچھ عرصہ اور بھی وہاں گذار سکتے تھے۔

بہرکیف ان کا وہاں رہنا ویسے بھی عارضی تھا۔ وہ پیدا ہی صرف زمین پر آنے کے لئے کئے گئے تھے اور انہوں نے ایک وقت یہیں آنا تھا صرف چند روزہ مانوسیت حاصل کرنے کے لئے ان کو وہاں ٹھہرایا گیا تھا اور اس عمل کی وجہ سے چند روز قبل ان کو یہاں آنا پڑ گیا۔ جس کا کافی عرصہ تک احساس کرتے رہے اور روتے رہے۔

پس عصیان سے مراد ہدایت عقل کی خلاف ورزی اور امر ارشادی میں کوتاہی ہے۔ جس کا خسارہ صرف دنیاوی زندگی تک ہی محدود ہوا کرتا ہے اور اس کے متعلق نہی ارشادی تھی جس طرح کہ عرض کر دیا گیا ہے۔

عصیان سے مراد ہدایت الٰہیہ شرعیہ کی مخالفت نہیں ہے یعنی یہ نہی مولوی نہیں تھی تاکہ مخالفت کا وبال آخرت پر رکھا جائے۔ نہ اس فعل کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور نہ حقوق اللہ سے ہے بلکہ اس کا تعلق صرف ان کے ذاتی نفع و نقصان سے ہے پس ان کی طرف غوایت اور ظلم کی نسبت سے مراد خسارہ دنیاویہ ہے جو ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوا کرتا ہے

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح ایک باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ دیکھو بیکار بیٹھنا اچھا نہیں۔ تجارت کرو لیکن رستے دو ہیں اگر فلاں کام کرو گے تو اس میں تکلیف زیادہ ہوگی اور فلاں کام کرو گے تو تکلیف کم ہوگی آمدنی دونوں صورتوں میں یکساں ہی ہے۔ صرف تیری اپنی سہولت و تکلیف میں فرق ہے۔ پس اگر بیٹا کسی کے کہنے سے یا اپنی ذاتی رائے سے اس راستہ کو اختیار کرے جس میں باپ کے خیال میں تکلیف زیادہ تھی تو یہ باپ کی نافرمانی نہیں ہے بلکہ ہے وہ دونوں صورتوں میں باپ کا اطاعت گذار۔ فرق یہ ہے کہ اس کے مشورہ پر چلتا اور دوسری صورت اختیار کرتا تو وہ خود ذرا سہولت سے رہتا اور تکلیف سے بچ جاتا۔

اس مقام پر حضرت آدمؑ کا قصّہ بعینہٖ یہی ہے کہ اگر وہ کام نہ کرتے تو کچھ عرصہ زیادہ اس جگہ رہ کر ملاءِ اعلیٰ کی

صحبت میں خوشنود ہوتے اور اس کام کے کرنے سے ان کی وہاں رہنے کی مدت کو جلد ختم کر دیا گیا۔ بہرکیف آنا ہر دو صورت میں زمین پر ضرور تھا کیونکہ وہ پیدا ہی اس لئے کئے گئے تھے اور زمین پر ان کا آجانا سزا نہیں تھا۔ بلکہ ڈیوٹی تھی صرف عدم تجربۂ عقلی کی بنا پر (چونکہ پہلا ہی موقعہ تھا) ناہموار رستہ اختیار کرنے کی وجہ سے تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ملاء اعلیٰ کی صحبت سے بہت جلد محروم ہو جانے کی وجہ سے بہت عرصہ تک کفِ افسوس ملتے رہے اور روتے رہے

پس اس بیان سے ثابت ہُوا کہ نہ حضرت آدمؑ کی طرف راجع نہی (مولوی) تھی اور نہ اس کی خلاف ورزی باعثِ گناہ تھی بلکہ وہ نہی ارشادی تھے جس کی موافقت یا مخالفت نفع و نقصان دنیاوی زندگی تک محدود ہے۔

پس نہ وہ مخالفِ امرِ خدا ہوئے نہ گناہگار نہ اُن سے عصیاں سرزد ہُوا نہ ظلم نہ ان کا یہ فعل مہدی و مخلص ہونے کے منافی تھا اور نہ مصطفائی میں مخل تھا۔

پس وہ مصطفےٰؑ بھی تھے اور معصوم بھی اور نبیؑ بھی۔

والحمد للہ رب العالمین

ضرورتِ کتاب اللہ (قرآن مجید)

جب یہ ثابت ہو گیا کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہمیں خدا کے فرستادہ پیغمبر معصومؑ کی تعلیمات حاصل کر کے ان کے نقشِ قدم پر چلنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ جو نبی وہ اپنی طرف سے ہماری راہنمائی کے لئے بھیجے اس کو اس قسم کے معجزات بھی عطا کرے جس سے اس کی من جانب اللہ مبعوث بعہدۂ نبوت ہونے کا اطمینان ہو سکے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ خداوند کریم جس کو عہدۂ نبوت کرامت فرما کر ہماری راہنمائی پر مامور فرمائے اس کو معجزات کے علاوہ ہماری اصلاحات کے لئے ایک ایسا ضابطۂ قوانین بھی اپنی جانب سے عطا فرمائے جو ہمارے لئے لائحہ عمل کی حیثیت سے ہو اور جس کو وضع کرنے سے ہمارے عقول قاصر ہوں۔

گذشتہ انبیاء کو معجزات بھی عطا ہوئے اور ضابطۂ قانون (کتاب یا صحیفہ) بھی عنایت ہوا اور ہر دو جُدا جُدا یعنی معجزہ الگ اور کتاب یا صحیفہ الگ۔ معجزہ ہر نبی کو اس قسم کا دیا گیا جو زمانِ حاضر کے ترقی یافتہ طبقہ کے نزدیک ایک ناشدنی امر تھا۔ اور غیر شعوری طور پر ان کی طبائع کا مطمحِ نظر تھا اور اس کے علاوہ ان کے موجودہ خیالات و جذبات کے اس طرف رجحان کا اور کوئی موثر و کارگر ذریعہ نہ تھا اور نہ ان کی جاذبیت کا اس سے زیادہ مفید تر کوئی اور اقدام تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جادو کا چرچا تھا اور اس زمانہ کا ماحول اس کو انتہائی کمال انسانی خیال کرتا تھا اور غیر شعوری طور پر اس سے بالا طاقت کے منتظر تھے کہ جو اس سے قدم آگے بڑھا کر رکھ دے اس کے گرویدہ ہو جائیں۔ کیونکہ اس سے آگے بڑھنا ان کے نزدیک ایک ناشدنی جیسا امر تھا پس حضرت موسیٰؑ کو اس نوعیت سے جداگانہ رنگ کا کوئی معجزہ عطا ہوتا تو وہ اتنا جاذب و مؤثر نہ ہوتا۔ جتنا کہ عصا کا سانپ بن کر دوسرے جادوگروں کے مفروضہ سانپوں کو کھا کر ہضم کر کے پھر اصلی حالت میں پلٹ کر عصا بن جانا مؤثر و کارگر ثابت ہوا اور جس کی بدولت تمام صاحبان کمال جادوگر مسلمان ہوگئے کیونکہ ان لوگوں کے دماغ اس دور کے جادوگروں کے موجودہ کمال کے ارد گرد چکر لگا رہے تھے اور وہ اس کو آخری کمال سمجھتے تھے پس اس سے بڑھ کر اسی جنس کا خارق عادت اقدام ہی ان کا جاذب بن سکتا تھا۔ دوسرا کسی نوعیت کا معجزہ ان کی منظر التفات سے اجنبی رہتا۔ لہٰذا مقبولیت عامہ میں اس کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکتا جو اس کو حاصل ہوا کیونکہ اس کو غیر شعوری طور پر وہ خود تلاش کر رہے تھے پس منظر عام پر آجانے کے بعد وہ ان پر اثر انداز کیونکر نہ ہوتا؟

حضرت عیسیٰؑ کے دور میں افتاد طبع فن طب پر تھی۔ اہل زمانہ کے اذہان افلاطون، ارسطو، جالینوس وغیرہ کے طبی کمالات کے شیفتہ و شیدائی تھے اور غیر شعوری طور پر اس سے مافوق کمال کے طالب تھے۔ لہٰذا خدائی عہدہ دار نبوت کے لئے ضروری تھا کہ ان کے موجودہ رجحانات کے پیش نظر ان کے سامنے ایسی چیز پیش کرے جس کو موجودہ طب و حکمت کا کمال ادراک نہ کر سکے۔ ماہرین زمانہ ہر مرض کا علاج کر سکتے تھے۔ اپاہج کو تندرست کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی نسخہ نہ تھا۔ مردہ کو زندہ کرنا اُن کے بس سے باہر تھا وہ معجونیں اور کشتے تیار کر سکتے تھے لیکن مٹی کا بت بنا کر اس میں رُوح پھونک کر جاندار نہ بنا سکتے تھے۔

پس حضرت عیسیٰؑ کو ایسا معجزہ عطا ہوا کہ موجودہ دور کے کمالات اس کے سامنے ماند پڑ گئے

وعلیٰ ہذا القیاس۔ ہر زمانہ کے انبیاء کو اس قسم کا معجزہ عطا ہوا جو دور حاضر کے صاحبانِ کمال کی گردنیں جھکا دے بنا بریں تصدیق نبوت کے بعد قوانین شریعت کی کتاب انہیں علیحدہ عطا کی گئی۔ لہٰذا ان کی کتابیں اور صحیفے اعجازی حیثیت کے حامل نہ تھے۔

لیکن جناب رسالتمآبؐ کے دور پر آشوب میں اس زمانہ کا موجودہ ترقی یافتہ گروہ فصاحت و بلاغت کا دلدادہ تھا۔ یہاں تک کہ عرب اپنے خطبات فصیحہ اور اشعار بلیغہ پر اس قدر نازاں تھے کہ اپنے مقابلہ میں باقی اقوام عالم کو عجم گنگ بے زبان کی لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ دریں صورت اگر خدائی پیغامات سے روشناس کرانے کا طریقہ عام گفتگو قرار دے کر معجزہ اس سے الگ نوعیت میں عطا کیا جاتا تو ہرگز ہرگز اس میں کامیابی کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ عام گفتگو اگر دیگر فصحائے عرب اور بلغائے زمانہ کے معیار کلام سے پست ہوتی تو ادعائے نبوت محل تمسخر و مزاح کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا اور اگر عام فصحاء و بلغاء کے کلام کے برابر ہوتی تو پھر دوسرے اس جیسی کلام کرنے والے ہزاروں خم ٹھوک کر اس میدان میں

کود پڑتے اور دعوائے نبوت کر لیتے اور جناب رسالتمآبؐ کو امتیازی حیثیت قطعاً حاصل نہ ہو سکتی۔ کیونکہ باقی معجزات کو جادو کی لفظ سے تعبیر کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

پس اتمام حجت اور تبلیغ رسالت کے لئے اس ماحول میں اس سے زیادہ مؤثر اور کامیاب کوئی طریقہ نہ تھا کہ جس گفتگو کو دعوتِ توحید کا ذریعہ قرار دیا جائے وہ عام انسانی طاقت سے بلند ترین معیار پر فائز ہو جس کے سامنے فصحائے و بلغاء زمانہ اپنی گردنیں جھکا دیں اور اس کو خدا کی کلام تسلیم کرنے کے علاوہ ان کے لئے کوئی اور راہ نہ نکل سکے پس وہ کلام معجزہ بھی ہو اور ضابطہ قوانین شرعیہ بھی قرار پائے۔

تاریخ عرب سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس دور میں انتہائی مشکل سے مشکل کام نکالنے کے لئے فصیح و بلیغ کلام جس قدر مفید و کارگر تھی۔ مال و زر یا قوت و زور کو وہ مقام حاصل نہ تھا۔ چنانچہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ عرب کا ایک مشہور شاعر ایک دفعہ ایک بادیہ نشین عرب کے ہاں مہمان ہوا۔ اس نے اس کی بڑی تواضع کی۔ اس شاعر نے رخصت ہوتے ہوئے بطور صلہ کے اس کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ بادیہ نشین تین لڑکیوں کا باپ تھا اور بوجہ گمنامی و غربت کے اس کے ساتھ رشتہ و ناطہ کے لئے کوئی خاندانی آدمی تیار نہ تھا۔ پس اس نے اس شاعر کے سامنے اپنی حالتِ زار کا تذکرہ کیا اور اس تکلیف کے رفع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس شاعر نے وعدہ کیا کہ عرب کے مشہور اجتماع (میلہ عکاظ) میں تیری اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ چنانچہ جب وہ وقت آیا تو اس نے شرفائے عرب کے بھرے مجمع میں اس بادیہ نشین عرب کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اور بڑھا چڑھا کر اس کے فضائل و اوصاف کا تذکرہ کیا۔ پس قصیدہ کیا تھا۔ ایک جادو کی لہر مجمع میں دوڑ گئی، قصیدہ سنتے ہی اس بادیہ نشین کو شرفائے عرب، عزت و حرمت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اس کی شرافت و برتری کا پورے مجمع میں غل پڑ گیا۔ لوگ اس کو دیکھنے کے لئے اور اس سے تعارف کے لئے اس کے مکان پر حاضر ہوئے۔ آخر کار اس سے رشتہ کی درخواستیں کی گئیں۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں چند دنوں کے اندر اس کی تینوں لڑکیاں شرفاء کے گھروں میں بیاہی گئیں۔

اور یہی وجہ تھی کہ امراء و رؤسا اپنی شہرت و بلندی کی خاطر مشاہیر شعراء کی بڑی خدمت کرتے تھے اور کسی قیمت پر ان کی دل شکنی گوارا نہ کرتے تھے اور ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھر پس و پیش کرنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔

بنا بریں دعوتِ توحید، جو اس دور باطل میں بت پرستی اور خود ستائی کے موجودہ وقتی رجحانات کے لئے کھلا ہوا چیلنج تھی۔ عام کلام سے قطعاً اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ خواہ حضرت رسالتمآبؐ اپنی تصدیق کے لئے اس کے علاوہ دوسرے ہزاروں قسم کے معجزات ہی کیوں نہ پیش کرتے۔ ان کی نگاہوں میں انسانی کمالات سے مافوق کمال صرف معیار کلام کی ایسی بلندی میں مضمر تھا جو موجودہ صاحبانِ کمال کی دسترس سے بالاتر ہو جس کو سن کر مشاہیر فصحاء و بلغائے عرب اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے گردن خم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ گویا غیر شعوری طور پر اس کمال کے منتظر تھے

جس کو قرآن مجید نے آکر طشت از بام کر دیا۔ جس کی ضوءِ ارتقاء کے سامنے مشاہیر دور کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور جس کے اوجِ کمال کے مقابلہ میں ان کا موجودہ کمال بالکل ہیچ پوچ معلوم ہونے لگا۔

اور اس کا کمال بالائے کمال یہ کہ یہ کلام ایسی ذات کی زبان حق ترجمان پر جاری ہوا۔ جو موجودہ فصحاء و بلغاءِ عرب سے راہ و رسم کا دُور سے بھی واسطہ نہ رکھتا تھا۔ جس کو رسمی تعلیم و تعلم کے طریقوں سے قطعاً کوئی وابستگی حاصل نہ تھی۔ بایں ہمہ اس کلام نے آتے ہی عرب عُرباء کو اپنے خالق کی کلام ہونے کے ثبوت کے لئے مقابلہ کی عام دعوت دیدی اور بار بار پکار پکار کر صدا بلند کی آؤ اگر یہ اللہ کا کلام نہیں تو تم بھی اس جیسا بنا لاؤ۔" چلو پورا قرآن نہ سہی"۔ اس کے ایک سورہ کی مثل بنا لاؤ۔ "یہ بھی نہ سہی" تو اس کی ایک آیت کا مقابلہ کر کے دیکھو۔ صرف ایک ایک سے تنہا نہیں ہو سکتا" تو پورے ملک عرب کے فصحا و بلغا، خطبا و شعرا مل کر ایک دوسرے کی امداد و تعاون سے، مجموعی طاقت و استعداد سے، اس کا مقابلہ کر لیں۔ بلکہ جن و انسان مل کر اس کلام کے مثل ایک چھوٹا ٹکڑا ہی پیش کر دیں اور اس تحدی بالائے تحدی، چیلنج در چیلنج کے بعد ان کے عجز کا بھی کھلے لفظوں میں اعلان فرما دیا کہ خواہ کتنا ہی زور لگائیں، تنہا کریں یا مل جل کر کرنا چاہیں اس کی مثل ہرگز لا سکتے ہی نہیں۔ یہ سب کچھ سنتے رہے اور مبہوت و ششدر سے ہو کر ایک دوسرے کا منہ ہی تکتے رہے اور دنگ کے دنگ ہی رہ گئے۔ اس کے مقابلہ کے لئے ان کی زبانیں گنگ یا شل ہو گئیں۔ صرف حیرت سے انگشت بدنداں ہونے کے سوا ان کے پاس اور چارہ ہی نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ عکاظ کے میلہ کے موقعہ پر سورۂ کوثر کی تین آیتیں لکھ کر دیوار کعبہ سے لٹکا دی گئی تھیں۔ فصحاء عرب دیکھتے ہی محو حیرت ہو گئے اور مقابلہ میں کچھ کہنے کی جراءت نہ کر سکے۔ آخر کار ایک شاعر نے بار بار پڑھ کر کچھ اضافہ کی جُراءت کی تو وہ صرف اس قدر کہ آخر میں لکھ دیا۔ مَا هٰذَا

كَلَامُ الْبَشَر (یعنی یہ انسان کا کلام نہیں ہے)

اب ان کے ذہن و دماغ میں یہ بات پوری طرح بیٹھ گئی کہ انسانی طاقتوں کے مافوق ایک ایسی طاقت ضرور موجود ہے جس کے سامنے انسان کی ذہنی کاوشیں ایک افسانۂ باطل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسانی افکار رسا کی روشن قندیلوں کے مافوق ایک ایسا نور یکتا موجود ہے جس کی ہمہ گیر ضیاء پاشیوں کے مقابلہ میں یہ چراغ سحری ہیں بلکہ بالکل مدھم و خاموش ہیں۔

یہ تصور جب پیدا ہو گیا تو کلام اللہ قرآنِ مجید کی ہمہ گیر جاذبیت نے معیاری کلام سننے کے دیوانوں کو اپنا پروانہ بنا لیا۔ جب سننے تک نوبت آگئی تو ساتھ ساتھ کلام مقدس نے ادلہ توحید کے وہ ناقابل تردید براہین سامنے رکھ دئیے۔ جس کو فطرتِ سلیمہ بلا پس و پیش قبول کئے بغیر دم نہ لے سکے بس سنتے گئے اور پرکھتے گئے اور ہمنوا ہوتے گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر شرک و کفر کے مضبوط آہنی جال، ظلم و باطل کے محکم فولادی پھندے، تارِ عنکبوت بن کر معمولی ید اللّٰہی جنبشوں سے ٹوٹنے لگ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مستقبل قریب میں سب کا خاتمہ ہو گیا۔

جب عرب اذہان نے اس کلام کے مقابلہ میں ہار تسلیم کر لی۔ اس کے متعلق اللہ کا کلام ہونا تسلیم کر لیا تو دیگر اقوام

عالم حیوان کے مقابلہ میں عجم (گنگ) کی حیثیت سے مقیں کس طرح اس کی صداقت کے تسلیم کرنے سے اعراض کر سکتے تھے؟ پس دین خدا کا تھوڑی مدت کے اندر چار دانگ عالم میں، ڈنکا بج گیا اور فوج فوج ہوکر اطراف و نواح سے حضور رسالتمآب کی بارگاہ فیض میں آکر لوگ اسلامی تعلیمات سے دامن مراد پر کرکے جانے لگے اور قرآنی فیوض و برکات سے تشنگان معرفت نے وہ استفادہ کیا کہ پھر اور لوگ ان سے سیکھ سیکھ کر دور دور تک اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے

چونکہ اس کلام مقدس کی فصاحت و بلاغت کا معیار انسانی دماغی صلاحیتوں سے بلند و بالاتر ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس کی فصاحت و بلاغت کے لئے جن لطائف و رموز اور اصول و نکات کو ملحوظ قرار دیا گیا ہے، ان کا استکشاف بھی انسانی اوہام وظنون یا افکار و عقول کی انتہائی بلند پروازی اور نازک خیالی سے ہو سکنا ناممکن اور محال قطعی ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے التحلیل انما یکون الی ما منہ الترکیب (کسی شی کی تحلیل انہی اجزا کی طرف ہی ہو سکتی ہے جن سے ابتدا ترکیب واقع ہوئی تھی، یعنی جن لطائف و نکات اور دقائق و اسرار کو ابتدا ملحوظ قرار دیکر خالق کلام نے ان کے مطابق کلام مقدس (قرآن مجید) کی ترکیب و تشکیل فرمائی ہے) ناممکن ہے کہ انسانی فہم صائب اور ذہن ثاقب اپنی انتہائی اور انتھک جد و جہد سے اپنی غیر معمولی نکتہ سنجی و دقائق رسی کی بنا پر ان کا ادراک کر سکے کیونکہ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو ابتداء سے اس قسم کے لطائف و نکات کا لحاظ رکھ کر ان کی مطابقت سے کلام کرنا اور مرکب کرنا کیوں محال ہوتا؟ اور اگر ابتداءً ان کے دماغوں سے یہ بات اوجھل تھی تو اس پاک کلام کے مطالعہ یا سماعت کے بعد تو وہ سب نکات و رموز سامنے آچکے تھے پھر تحدی و چیلنج کے باوجود خاموش کیوں رہتے؟ یا اس کے مافوق البشر ہونے کا اعتراف کیوں کرتے؟

پس معلوم ہوا کہ نہ ابتداءً ان کی رسائی مافوق البشر لطائف تک تھی تاکہ اپنے کلام کو اس معیار پر لے جا سکتے اور نہ قرآن آجانے کے بعد اور اس کا بار بار مطالعہ و مذاکرہ کرنے کے بعد ان لطائف تک ان کا پہنچ سکنا ممکن ہے تاکہ اس کلام لاجواب کا جواب پیدا کرنے کی جرأت کریں۔

تو جس طرح جناب رسالتمآب قدرت کے انتخاب لاجواب سے اس کلام کے لانے کے اہل تھے بس وہ ہی اس کلام کے سمجھنے اور سمجھانے کے اہل بھی تھے اور باقی تمام لوگوں نے اس کے معانی و اسرار کو جناب رسالتمآب سے اپنی اپنی استعداد و قابلیت سے حاصل کیا۔ بعض صرف سرسری ترجمہ سمجھنے کے اہل تھے بعضوں نے کچھ تفسیر و تاویل سیکھ لی۔ گویا جس قدر استعداد اسی قدر استفادہ۔ یہانتک کہ بعض لوگ تو لفظی ترجمہ سے ذرا بھر آگے قدم نہ رکھ سکے اور آسان سے آسان اشارہ تک پہنچنے کیلئے بھی ان کا دماغ وقت محسوس کرتا تھا چہ جائیکہ مزید دقائق کی طرف قدم بڑھاتے۔

چنانچہ صحیح بخاری کتاب الصوم میں ہے کہ جب ماہ مبارک رمضان میں روزہ کے سحری کے وقت کی تعیین کیلئے یہ آیت اتری کُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰی يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ (کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ سفید تاگا سیاہ تاگے سے متمیز ہو جائے) تو بعض صحابہ نے یہ دستور بنالیا کہ اپنے پاؤں میں دو تاگے ایک سیاہ اور دوسرا سفید باندھ لیا کرتا تھا اور

(۱) فَاسْئَلُوا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ — اہل ذکر سے دریافت کرو جو تم نہ جانتے ہو۔

وعن بن عباس ۔ ھم محمد وعلی وفاطمہ والحسن والحسین ھم اھل الذکر والعلم والعقل والبیان وھم اھل بیت النبوۃ ومعدن الرسالۃ ومختلف الملائکۃ واللہ ما سمی المؤمن مومنا الا کرامۃ لامیر المؤمنین ؑ

ابن عباس سے مروی ہے "اہل ذکر سے مراد" حضرت محمد مصطفےٰ اور علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ یہی اہل ذکر، اہل علم، اہل عقل، اہل بیان اور اہل بیت نبوۃ۔ نیز رسالت کی کان اور ملائکہ کا محل نزول ہیں۔ اللہ کی قسم مومن کو مومن ہی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی کرامت کے لئے کہا گیا ہے

اور ینابیع المودۃ سے بروایت تفسیر ثعلبی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے۔

قال علیؑ نحن اھل الذکر — حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اہل الذکر ہم ہیں

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۔ الآیۃ ۔ قال الفضل بن روزبہان فی ابطال النہج ۔ علی من جملہ ورثۃ الکتاب لانہ عالم بحقائق الکتاب فھذا یدل علی علمہ ووفور توغلہ فی معرفۃ الکتاب انتہی ویؤیدہ قول النبیؐ علی مع القرآن والقرآن مع علی۔

(ارشاد قدرت ہے) پھر ہم نے وارث کتاب بنایا۔ ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔ فضل بن روزبہان جو علمائے اہل سنت میں سے ہے اس نے اپنی کتاب ابطال النہج میں لکھا ہے کہ علیؑ وارثان کتاب میں سے ہے کیونکہ وہ حقائق کتاب کا عالم ہے پس یہ چیز ان کے علم اور معرفت کتاب کے راسخ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اور جناب رسالتمآبؐ کا فرمان کہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کیساتھ ہے اس کا موید ہے۔

(۲) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۔ عن السیوطی فی الدر المنثور عن ابن عباس وکونوا مع علی بن ابی طالب

(ارشاد خداوندی ہے) ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ اس کے متعلق درمنثور سے بروایت ابن عباس منقول ہے۔ یعنی علیؑ بن ابی طالب کے ساتھ ہو جاؤ۔

(۴) وَمَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ ۔ — جس کے پاس کتاب (قرآن) کا علم ہے۔

عن الثعلبی عن عبداللہ بن سلام قال ھو علی — ثعلبی سے بروایت عبداللہ بن سلام مروی ہے کہ اس سے مراد حضرت علیؑ ہے

(۵) اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ — سوائے اس کے نہیں کہ تو ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کیلئے ایک ہادی ہے

روی العلامہ عن الجمھور عن ابن عباس قال قال رسول اللہؐ انا المنذر وعلی الھادی وبک یا علی یھتدی المھتدون

علامہ نے بطریق جمہور حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ میں منذر ہوں اور علی ہادی ہے اور فرمایا اے علیؑ طالبان ہدایت تجھ ہی سے ہدایت پائیں گے۔

یہ پانچ آیاتِ مجیدہ قرآنیہ کے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ جن کے متعلق روایات سے ثابت ہے کہ ان کا مصداق حضرت

کھانے میں مشغول رہتا تھا۔ پس جب وہ دونوں تاگے اپنے اپنے رنگ میں دکھائی دینے لگتے تھے تو کھانا وغیرہ بند کر دیا تھا۔ پس جب (مِنَ الْفَجْرِ) کی لفظ اتری تو معلوم ہوا کہ اس سے تو صبح صادق مراد تھی۔

اور بعض صحابہ تو پورے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ ہی نہ سیکھ سکے۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں بعض اکابر صحابہ کے متعلق ذکر کیا ہے کہ ان کو فَاکِهَةً وَّاَبًّا کا معنی نہیں آتا تھا تفصیل کے ساتھ ص۱۵۴ تا ۱۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں حالانکہ انہی کو "الاتقان" میں علامہ موصوف نے مشہور مفسرین قرآن کی فہرست میں پہلے نمبر پر جگہ دی ہے۔

علاوہ اُن رموز و اسرار کے جو معیار فصاحت و بلاغت قرار دیئے جائیں قرآن کے ظاہر و باطن اور باطن در باطن حتیٰ کہ سات باطن تک موجود ہونے کی روایات بھی ہیں۔ پھر اس میں خاص و عام، مطلق و مقید، مجمل و مبیّن، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ بھی ہیں۔ تو اگر جناب رسالتمآبؐ کے بعد یہ تمام چیزیں پردۂ خفا میں رہ جائیں اور ان کے سمجھنے سمجھانے والا کوئی نہ ہو تو قرآن مجید کا قیامت تک انسانوں کے لئے باعثِ ہدایت ہونے کا کیا مطلب رہ جائے گا؟ بلکہ پھر تو منہ پر قرآن کی لفظی رٹ ہی رہ جائے گی اور بس۔

لہٰذا عقل کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہنچنا ضروری ہو گا کہ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ قیامت تک کے لئے امت میں حضرت رسالتمآبؐ کا ایک جانشین موجود ہو۔ جو قرآن مجید کی جملہ باریک گتھیوں کو سلجھانے کی اہلیت تامہ اور اس میں بصیرت صادقہ رکھتا ہو اور وہ سوائے عترتِ طاہرہ کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس طرح کہ "ثقلین" "معجزنما" اور دیگر متفرق عنوانات کے تحت میں قدرے تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے۔

اس وقت حضرت رسالتمآبؐ کا جانشین موجود ہے جس کے وجودِ مسعود سے زمانہ قائم ہے۔ جب پردۂ غیبت اُٹھے گا وہ عالم ظہور میں تشریف فرما ہو کر قرآن مجید کی صحیح تعلیمات سے دنیا والوں کو روشناس کرائیں گے۔ باطل کا دور یکسر ختم ہو جائے گا اور دینِ خدا مقبول عام ہو گا۔ ظلم و جور کا قلع قمع ہو جائے گا۔ عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گا۔

اَللّٰهُمَّ عَجِّلْ لَنَا ظُهُوْرَهٗ فَاِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرَاهُ قَرِيْبًا۔ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ وَّعَلِيٍّ وَّاٰلِهِمَا عَلَيْهِمُ السَّلَامُ اٰمِيْنَ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ

قرآن کے ساتھ ضرورت امام

متعدد عناوین کے ذیل میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ ایک ایسے عالم قرآن کا ہونا بھی ضروری ہے جو قرآن کے ظاہر و باطن بلکہ اس کے جملہ علوم پر بھی حاوی ہو۔ اب اس مطلب کی تائید کے لئے قرآن مجید کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ اربابِ بصیرت ان کی روشنی میں اپنے نظریات کا جائزہ لے سکیں۔

امیر المومنینؑ ہے۔ پس ان سے ثابت ہُوا کہ جناب رسالتمآبؐ کے بعد امّت اسلامیہ پر حضرت علیؑ کی اطاعت واجب ہے اور چونکہ قرآن کے خطابات صرف اسی دور تک محدود نہیں لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ تاقیامت ان آیاتِ قرآنیہ کا مصداق امّت میں باقی ہونا واجب ہے جو جناب رسالتمآبؐ کی تعلیمات کا ذمہ دار قرار دیا جا سکے اور آیاتِ قرآنیہ کی وضاحت کرنے میں وہ ان کا صحیح قائمقام ہو۔

(۱) پہلی آیت کی رُو سے تاقیامت اہلِ ذکر میں سے ایک فرد کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ فَاسْئَلُوْا کا خطاب تاقیامت باقی رہے

(۲) دوسری آیت کے اعتبار سے وارثِ کتاب کا تاقیامت موجود ہونا ضروری ہے کیونکہ کتاب کی حد قیامت ہے۔

(۳) تیسری آیت میں چونکہ خطاب قیامت تک کے ایمان والوں سے ہے۔ لہٰذا ہر دور میں تاقیامت ایک صادق کا وجود ضروری ہے جس کے ساتھ تمسک پکڑا جا سکے۔

(۴) چوتھی آیت کا مصداق (عالم کتاب) بھی قیامت تک ہونا لازم ہے کیونکہ آیت قیامت تک زندہ ہے اور قرآن بھی قیامت تک ہے

(۵) پانچویں آیت کی رُو سے قیامت تک اقوامِ عالم کے لئے ایک ہادی کی بقا ضروری ہے۔

(۶) چونکہ قرآن معجزہ باقیہ ہے لہٰذا اس کے ساتھ تاقیامت ایک معجزنما کا وجود ضروری ہے جو قرآن کے اعجاز کو منظر عام پر لا سکے۔

(۷) چونکہ قرآن قیامت تک کیلئے ضابطہ قوانین ہے۔ لہٰذا اس کے نافذ کرنے والے کا وجود بھی تاقیامت لازم ہے۔

(۸) حدیث متواتر (ثقلین) سے چونکہ قرآن اور اہل بیت رسولؐ میں تلازم وجود ثابت ہے جس کی مفصّل بحث سابقاً مذکور ہو چکی ہے پس جب تک قرآن موجود ہے اہل بیت رسولؐ کی ایک فرد معصوم بھی ساتھ ساتھ موجود ہے۔ اور وہی مخلوق پر حجّت خدا ہے۔

پس جس طرح سورج بادلوں میں روپوش ہوکر دنیا والوں کو اپنا فیض پہنچایا کرتا ہے اسی طرح امام زمانہ بھی غائب رہ کر اپنے فیوض سے خلق خدا کو بہرہ ور کر سکتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّعَجِّلْ فَرَجَهُمْ

قرآن اور مسئلہ تقلید

یہاں تک تو یہ ثابت کر دیا جا چکا ہے کہ قرآن کے ساتھ ایک عالمِ قرآن کا وجود ضروری ہے جو تعلیماتِ اسلامیہ سے روشناس کرا سکے اور یہی سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا۔

جناب رسالتمآبؐ اپنے زمانہ میں مرجع علوم قرآنیہ تھے اور خود ہی بہ نفس نفیس مسائل قرآنیہ کے حل کرنے کے کفیل تھے لیکن خود چونکہ ایک ہی مقام پر قیام فرما رہا کرتے تھے۔ لہٰذا اطراف و نواح میں صحابہ کرام بفرمان سرکار رسالتمآبؐ فرائض تبلیغ احکام پر مامور ہوا کرتے تھے۔ جس حد تک وہ خود علم رکھتے تھے ان کے مسائل حل کر دیا کرتے اور جو نہ جانتے تھے۔ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں مشرف ہو کر سیکھ لیا کرتے تھے اور پھر جا کر دوسروں کو سکھا دیا کرتے گویا وہ لوگ اطراف و نواح میں حضورؐ کے زمانہ میں نیابت کے فرائض اپنے مخصوص علاقہ تک انجام دینے پر مامور تھے۔

اسی طرح جناب امیرالمومنینؑ علیہ السلام اپنے دورِ حکومت میں چونکہ عالم قرآن تھے۔ لہٰذا علوم قرآنیہ کا مرجع وہی تھے لیکن وہ خود بنفسِ نفیس ایک مقام پر مثلاً کوفہ میں تشریف فرما تھے اور اطرافِ مملکت میں ان کے نائبین فرائض تبلیغ و نظام ملکی انجام دیا کرتے تھے۔ مثلاً بصرہ میں عبداللہ بن عباس، مصر میں محمد بن ابی بکر، مدائن میں سلمان پاک اور مدینہ میں قثم بن عباس وغیرہ اور ان سب کے اوپر حضرت علیؑ خود نگران اعلیٰ تھے اور یہ سب نائبین مسائل مشکلہ میں آنحضرتؑ کی طرف بذریعہ ملاقات یا بطریق مکاتبت رجوع کر لیا کرتے تھے۔ یہ لوگ نیابت خاصہ کے حامل تھے۔

ان ہر دو مقامات پر تو سلطنت ظاہریہ و باطنیہ ہر دو یک جا تھیں۔ معاملاتِ دنیاویہ اور مسائل دینیہ ہر دو کا حل نبیؐ یا امام یا ان دو کے نائبین کے ہاتھ میں تھا اور حضرت امام حسنؑ علیہ السلام کا ابتدائی چھ ماہ کا زمانہ بھی اسی طرح تھا۔ لیکن جناب رسالتمآبؐ کے بعد سے لے کر حضرت علیؑ کی خلافت ظاہریہ کے دور تک اور حضرت امام حسنؑ کی صلح سے لے کر حضرت امام حسن عسکریؑ کے زمانہ تک آئمہ اہلبیتؑ کے پاس حکومت ظاہریہ نہیں تھی۔ لہٰذا اس مدت میں حضرات آئمہ طاہرین علیہم السلام اپنے شیعوں کے لئے صرف مسائل دینیہ کا مرجع تھے۔ اطرافِ عالم سے شیعہ لوگ ان کی خدماتِ عالیہ میں پہنچ کر ان سے احکامِ قرآنیہ مسائل شرعیہ کا درس حاصل کرتے اور ان پر عامل ہوتے تھے اور جو لوگ خدمتِ آئمہ میں شرف باریابی حاصل نہ کر سکتے وہ اپنے مقامی علمائے شیعہ سے جو آئمہ طاہرین سے پڑھ کر گئے ہوئے ہوتے تھے۔ اپنے مسائل دینیہ سیکھ لیا کرتے تھے۔

چنانچہ کتب رجال میں بہت سے اصحاب آئمہ کا ذکر ہے جو آئمہ کی اجازت سے دور دراز کے شیعوں کے لئے مرجع مسائل دینیہ قرار دیئے گئے جس طرح کہ جناب رسالتمآبؐ کی سلطنت اور حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے دورِ حکومت میں ان کے نائبین مرجعیت رکھتے تھے۔ متعدد اصحاب آئمہ جن کو شرف مرجعیت حاصل تھا وہ زمانِ حضور آئمہ میں مسائل دینیہ حل فرمایا کرتے تھے۔

(۱) حضرت زرارہ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا شاگرد خاص تھا۔ آپ نے ایک شخص کو ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جب تم کو ہماری حدیث کی ضرورت ہو تو زرارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اس بیٹھنے والے کی طرف رجوع کر لیا کرو۔ ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا کہ اگر زرارہ نہ ہوتا تو ہماری احادیث کہنہ ہو جاتیں۔

(۲) حضرت محمد بن مسلم، ابن ابی یعفور سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر

ہوکر عرض کی ، مولا میں ہر دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے قاصر ہوں اور لوگ مجھ سے مسائل دینیہ کا سوال کرتے ہیں تو چونکہ ہمیں بعض مسائل میں علم نہیں ہوتا ۔ لہٰذا ایسے مقامات پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے تو آپ نے فرمایا ۔

نما یمنعك عن الثقفی یعنی محمد بن مسلم فانه سمع من ابی احادیث وکان عنده وجیھا ۔ (تجھے ثقفی سے کیا مانع ہے (محمد بن مسلم ثقفی) پس تحقیق اس نے میرے باپ سے کافی احادیث سُنی ہیں اور یہ ان کا خاص طور پر منظور نظر تھا (اس سے مسائل دریافت کر لیا کرو)

(۳) ابان بن تغلب چنانچہ مسلم بن ابی حبیبہ سے روایت ہے کہ حضرت صادق علیہ السّلام نے مجھے ابان بن تغلب کی طرف رُجوع کرنے کا حکم دیا ۔

(۴) ابو بصیر شعیب عقرقوقی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے عرض کی ۔ کہ حضور ہمیں مسائل دینیہ دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے متعلق حضور کا ارشاد ہو ہم اس کی طرف رُجوع کر لیا کریں تو آپ نے فرمایا علیك بالاسدی یعنی ابا بصیر (ابو بصیر اسدی سے دریافت کر لیا کرو)

(۵) زکریا بن آدم ، علی بن مسیب ہمدانی روایت کرتا ہے کہ میں حضرت امام علی رضا علیہ السّلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی میرا وطن دُور ہے اور ہر وقت خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر (مسائل دینیہ دریافت نہیں کر سکتا) فرمایئے ہم کیا کریں ؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ زکریا بن آدم قمی جو دین و دنیا میں امین ہے سے دریافت کر لیا کرو ۔

(۶) یونس بن عبدالرحمٰن ، عبدالعزیز بن مہدی نے عرض کی کہ ہر وقت (بوجہ دوری مسافت کے) آپ سے مسائل دینیہ کا حل حاصل کرنے سے قاصر ہوں کیا یونس بن عبدالرحمٰن موثق ہے (اس سے پوچھ لیا کروں) فرمایا ! ہاں ! یہ لوگ جو احادیث آئمہ کی ترویج اور عوام شیعہ کی مشکلات مسائل دینیہ میں رہبری کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ اُن پر آئمہ طاہرین علیہم السّلام کو پُورا وثوق تھا ۔ حتیٰ کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام سے منقول ہے کہ یزید بن معاویہ عجلی ابو بصیر لیث بن بختری ، محمد بن مسلم اور زرارہ ۔ یہ چار اللہ کے نجباء (برگزیدگان) اور امنا ہیں ۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آثار نبوت کہنہ ہو جاتے ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ۔ جس طرح ان چار شخصوں نے ہمارے ذکر اور احادیث کو زندہ کیا اسی طرح کسی اور نے نہیں کیا ۔

اسی طرح زمان غیبت صغریٰ میں نواب اربعہ حضرت حجت عج علیہ السّلام کی طرف سے مخصوص عہدہ دار نیابت تھے (۱) عثمان بن سعد (۲) محمد بن عثمان بن سعید (۳) ابوالقاسم حسین بن رَوح (۴) علی بن محمد سیمری

یہ بزرگوار جن کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کا حضرات آئمہ طاہرین علیہم السّلام سے ربط ظاہری قائم تھا اور ان کی جانب سے تبلیغ مسائل دینیہ و احکام قرآنیہ میں نائب خاص تھے ۔

لیکن عہدۂ نیابت صرف انہی پر منحصر نہیں تھا ۔ بلکہ زمان آئمہ میں اطرافِ ممالک کے شیعہ لوگ اپنے ہاں کے

علمائے شیعہ اور راویانِ احادیث آئمہ کی طرف مسائل دینیہ میں رجوع کرنے پر مامور تھے فرق صرف یہ ہے کہ جو لوگ آئمہ کی خدمت میں پہنچ کر مشرفِ زیارت ہو سکے انہوں نے ازراہ اطمینان دریافت کر لیا کہ مسائل دینیہ اور امور شرعیہ میں جبکہ ہم آپ سے بہت دُور ہیں، کیا کریں؟ تو معصوم نے ایک عالم راوئ حدیث کا نام سے لیا جو ان کے قریب ترین تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے مختلف سائلین کے جواب میں علیحٰدہ علیحٰدہ مراجع کا نام لیا۔ اگر سب کے لئے ایک مرجع کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتے تو جس مشکل اور دشواری کی وہ شکایت پیش کر رہے تھے اس کا ازالہ قطعاً نہ ہو سکتا اور اس سے دُور دراز والوں کے لئے پھر انہی مشکلات کا سامنا ہوتا اور یہ چیز قابلِ برداشت ہوتی تو کسی اور کو مرجع بنانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی بلکہ ہر اک پر خود امام کی خدمت میں پہنچنا اور ان سے ہی دریافت کرنا ضروری ہوتا۔ پس معلوم ہُوا کہ شیعوں کی سہولت و آرام کے لئے اور تعلیمات قرآنیہ کو عام کرنے کے لئے ہر شہر کے عالم اور راوئ حدیث کو اس شہر کے شیعوں کا مفتی نامزد فرمایا یا ہر علاقہ کے عالم و راوئ حدیث کو اس علاقہ والوں کا مرجع قرار دیا۔

عن الکشی عن ابی الحسن الثالث فیما کتبہ جواباً عن السؤال عن من یعتمد علیہا فی الدین، اعتمدا فی دینکما علی کل مسن فی حبنا و کل کثیر القدم فی امرنا۔

رجال کشی، سے حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے مروی ہے کہ دو آدمیوں نے آپکی خدمت میں خط لکھا کہ مسائل دینیہ میں ہم کس پر اعتماد کریں؟ تو آپ نے جواباً تحریر فرمایا کہ تم اپنے دینی معاملات میں ہر اس شخص کی طرف رجوع کر سکتے ہو جو ہماری محبت میں سن رسیدہ ہو اور ہمارے امر میں (مسائل دینیہ میں) تجربہ کار ہو۔

تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد ہے کہ تمہارے شہر یا علاقہ میں قریب ترین لوگوں میں سے جو اس صفت سے متصف ہو۔ اس کی طرف رجوع کرو اسی طرح زمانۂ غیبت امام علیہ السلام میں چونکہ امام کی خدمت میں رسائی تو ہو نہیں سکتی تھی کہ مسائل دینیہ کا جواب براہِ راست ان سے حاصل کیا جا سکتا۔ پس اس زمانہ کے شیعوں کو بلکہ ہر دَور کے شیعوں کو آئمہ نے اس زمانہ کے علماء کی طرف رجوع کرنے کا حکم عام دیدیا۔ تاکہ ہر ہر شہر یا علاقہ میں وہاں کے باشندے اپنے قریب ترین عالم دین سے راوئ حدیث کی طرف رجوع کر کے آسانی سے دین خدا و احکام قرآن کی تعلیم حاصل کر کے اس پر عمل کر سکیں اور اسی کا نام ہے تقلید چنانچہ اسحٰق بن یعقوب کے سوالات کے جواب حضرت حجت عج نے تحریراً ارشاد فرمایا۔

واما الحوادث الواقعۃ فارجعوا فیھا الی رواۃ احادیثنا فانھم حجتی علیکم و انا حجۃ اللہ علیھم

پس آئندہ کے مسائل میں ان لوگوں کی طرف رجوع کرو جو ہماری حدیثوں کے راوی ہیں وہ میری جانب سے تم پر حجت ہیں اور میں ان پر حجت خدا ہوں۔

نیز حضرت صادق آل محمد علیہ السلام سے ایک حدیث طویل میں مروی ہے۔ آپ نے فرمایا:

فاما[2] من کان من الفقہاء صائنا لنفسہ

پس جو شخص فقہا میں سے اپنے نفس پر قابو رکھنے والا، دین کا نگہبان

---

[1] عن اکمال الدین [2] عن الاحتجاج

حافظا لدینہ مخالفا علی ھواہ مطیعا لامر مولاہ فللعوام ان یقلدوہ — خواہش کا مخالف اور مولا کا فرماں بردار ہو پس عوام کو چاہیئے۔ کہ کہ اس کی تقلید کرلیں۔

نیز کافی میں بروایت عمر بن حنظلہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث طویل میں مروی ہے کہ ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

من کان منکم ممن قد روی حدیثنا ونظر فی حلالنا وحرامنا وعرف احکامنا فلیرضوا بہ حکما فانی قد جعلتہ حاکما فاذا حکم بحکمنا فلم یقبلہ منہ فانما استخف بحکم اللہ وعلینا رد والراد علینا الراد علی اللہ و ھو علی حد الشرک باللہ الخ

جو شخص تم میں سے ہماری حدیثوں کا راوی ہو اور ہمارے حلال وحرام کو جانتا ہو اور ہمارے احکام کی معرفت رکھتا ہو (پس شیعوں کو چاہیئے) کہ اس کے حکم پر راضی ہو جائیں۔ میں نے اس کو تمہارے اوپر حاکم بنایا ہے پس جب وہ ہمارا حکم سنائے اور اس کو قبول نہ کیا جائے۔ پس گویا وہ اللہ کے حکم کی توہین اور ہماری تردید ہے۔ اور ہماری تردید اللہ کی تردید ہے اور وہ حد شرک ہے۔

پس ان احادیث سے معلوم ہوا کہ زمان غیبت میں مجتہدین عظام کی وہی حیثیت ہے جو آئمہ کے ظہور کے زمانہ میں ان کے اصحاب کی تھی۔ صرف فرق یہ ہے کہ ان میں بعض خاص طور پر نامزد تھے اور بعض عمومی طور پر مجاز تھے اور زمان غیبت امام علیہ السلام میں سب علمائے امامیہ (مجتہدین عظام) یکساں طور پر عمومی لحاظ سے مامور ہیں اور شیعوں کو بھی بالعموم حکم ہے کہ ان کی طرف رجوع کریں اور ان کی تقلید کرکے اعمال بجالائیں۔

اس مقام پر پہنچ کر تائید مزید کے لئے آیت قرآنی پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ پ ۱۱ ع ۴ میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۔

مومنین سب کے سب تو (دینی مسائل طلب کرنے کیلئے) باہر نہیں جاسکتے لیکن ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہر قوم کی طرف سے ایک ایک گروہ جاکر مسائل فقیہہ دینیہ حاصل کرلیں۔ اور واپس آکر اپنی قوموں کو خوف خدا کی تلقین کریں۔ شاید وہ ڈر جائیں (اور اعمال صالحہ کی طرف توجہ کریں)

اس آیۂ شریفہ میں ہر ہر قوم سے ایک ایک گروہ کو فقیہہ بننے کی دعوت دی گئی ہے۔ محض اس سہولت و آسانی کیلئے جس کو آئمہ طاہرین نے ملحوظ قرار دیا تھا۔ تاکہ عوام مومنین احکام قرآن سیکھنے میں کوئی تکلیف محسوس نہ کریں۔ پس بنا بریں ہر وہ شخص جو جامع شرائط فتویٰ ہو۔ متدین ہو، شہوات وخواہشات کا دلدادہ نہ ہو۔ یعنی نیک و صالح ہو۔ عوام پر واجب ہے کہ اس کی تقلید کریں یعنی مسائل دینیہ سیکھنے میں اس کی طرف رجوع کریں۔

مسئلہ تقلید اعلم

اس مقام پر پہنچ کر یہ بات خود بخود واضح و عیاں ہو جاتی ہے کہ تقلید اعلم کا مسئلہ جو عام مشہور ہے۔ بالکل خالی از دلیل اور بے بنیاد ہے۔ البتہ اگر ایک ہی شہر یا علاقہ میں متعدد فقیہہ موجود ہوں اور ان کے فتاوی میں اختلاف ہو تو اس صورت میں اعلم کی طرف رجوع ضروری ہے جیسا کہ کافی میں عمر بن حنظلہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

ورنہ جب زمانِ آئمہ میں یہ سہولت ملحوظ تھی کہ ہر شہر و علاقہ کے لوگ اپنے قریب ترین اعلم کی طرف مسائل دینیہ میں رُجوع کر کے اعمال کی صحت کریں اگر اعلم کی طرف رجوع واجب ہوتا تو اس زمانہ کے شیعوں کے لئے سوائے امام علیہ السلام کے اور کسی کی طرف رجوع کی اجازت نہ ہوتی۔ حتی کہ زمانِ رسالت میں یہ چیز صرف سرکار رسالتمآب تک ہی محدود رہتی اور اور اسی طرح حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے زمانہ میں آنحضرتؐ تک محدود ہوتا اور نائبین کی صورت اوّل سے آخر تک سب باطل ہوتی کیونکہ ہر دَور کے نائبین اپنے اپنے مقامات پر ناقلِ فتویٰ نہیں تھے بلکہ خود اپنے اجتہادات سے فتویٰ دیا کرتے تھے حالانکہ ان سے اعلم خود نبی یا امام معصوم موجود تھے۔

خداوند کریم نے ہر قوم میں متعدد فقیہہ پیدا کرنے کا حکم صادر فرما کر مرجع تقلید کو عام قرار دیا ہے تاکہ احکام شریعت کے سیکھنے اور سکھانے میں عسر و حرج نہ رہے اور دینِ خدا آسان و سہل ہو اور اسی بنا پر زمانِ رسالت سے تا زمانِ حضرت امام حسن عسکریؑ اسی سہولت کو برقرار رکھا گیا اور عوام کی مرجعیت کو عام کیا گیا اور یہ پابندی نہ رکھی گئی کہ معصوم ہی سے دریافت کیا جائے اور بس۔ ورنہ عوام پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتا۔ جس کو روا رکھنا تکلیف مالایطاق کے مترادف ہے پس جب اس وقت اس آسانی کو ملحوظ رکھا گیا تو زمانِ غیبت میں شیعوں سے بلا وجہ یہ سہولت کیوں سلب کر لی گئی؟

نیز قرآن میں ہر قوم کو متعدد فقیہہ پیدا کرنے کا کیوں حکم ہوا؟ جب کہ پوری روئے زمین پر صرف ایک ہی مفتی کی تقلید واجب تھی؟ جب ایک کے علاوہ باقیوں سے مسئلہ پوچھنا ناجائز ہو تو ان پر بتانا کیسے واجب ہو سکتا ہے! تو پھر ان کا فقیہہ بننا کس کام کا؟

جن جن احادیث میں تقلید کا حکم دیا گیا ہے اُن میں کہیں نہیں کہ صرف ایک ہی اعلم کی تقلید واجب ہے۔ بلکہ روایات میں صاف طور پر ہے کہ جو بھی حرام و حلال جاننے والا، خواہش نفس کا مخالف، اللہ کا اطاعت گزار وغیرہ شرائط رکھتا ہو عوام کو ان کی طرف رُجوع کرنا چاہیئے۔

ابتدائے زمانہ غیبت سے آج تک ہر دَور میں ہزاروں کی تعداد میں نہیں تو سینکڑوں کی تعداد میں تو ضرور مجتہد بن رہے ہیں اور ہر مجتہد اپنے حلقہ تقلید میں فتویٰ دیتا رہا ہے اور اس کے فتاوی پر ان کے مقلدین عمل کرتے رہے ہیں۔ اس دَور

میں تو یقیناً ہزاروں کی تعداد میں مجتہدین موجود ہیں اور بہت سوں کے رسائل عملیہ طباعت شدہ ہیں۔ ان کے مقلدین بھی موجود ہیں اگر صرف ایک اعلم کی تقلید واجب ہو تو مندرجہ ذیل چند خرابیوں کا لازم آنا ضروری ہے جن کا علاج بھی سوچنا پڑے گا

اللہ کے نزدیک سب سے بڑا عالم (اعلم) تو ایک زمانہ میں صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ پس اس ایک کی تقلید واجب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کی تقلید حرام ہو۔ لہٰذا اللہ کے نزدیک تو اسی ایک ہی مجتہد (اعلم) کے مقلدین کے اعمال درست اور قابل قبول ہوں گے۔ پس وہ مجتہد (اعلم) بھی مستحق نجات اور اس کے مقلدین بھی ناجی اور اس مجتہد اعلم کے علاوہ جتنے مجتہدین نے اعلم کی موجودگی میں فتویٰ دیا انہوں نے غلط اور ناجائز کیا اور جن لوگوں نے ان سے فتویٰ لیا انہوں نے بھی غلط کیا اور فعل حرام کیا۔ لہٰذا ان تمام کے اعمال رائیگاں و برباد ہو گئے پس نہ غیر اعلم مجتہد ناجی ہوئے اور نہ ان کے مقلدین: گویا۔ دورِ حاضر میں ہزاروں کی تعداد میں ایک اعلم کے علاوہ سب مجتہدین اور لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ان کے تمام مقلدین غلط راستے پر ہوئے اور ان سب کے اعمال ضائع و بے کار ہوئے۔

اور یہ ممکن ہے کہ جس شخص کو ایک آدمی نے اعلم سمجھ کر اس کی تقلید کی ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ اعلم نہ ہو اور دورِ حاضر میں اکثر صاحبانِ رسالہ مجتہدین کے رسائل عملیہ کے ٹائیٹل پیج (سرورق) پر جس مجتہد کا وہ رسالہ ہوتا ہے اس کے نام کے ساتھ اعلم لکھا ہوا ہوتا ہے۔ گویا ہر صاحب رسالہ اپنے آپ کو اعلم قرار دیتا ہے۔ ورنہ جب اس کا فتویٰ ہے کہ تقلید صرف اعلم کی ہی کی جا سکتی ہے تو اگر اپنے آپ کو غیر اعلم سمجھے تو رسالہ عملیہ ہی کیوں لکھے؟

اب واقع میں تو اعلم صرف ایک ہی ہے اور تقلید بھی صرف اسی ایک کی ہی جائز ہے اور دعوئے اعلمیت کرنے والے ہیں زیادہ پس نہ اعلم کا صحیح فیصلہ ہوگا اور نہ کوئی شیعہ دریں صورت دعویٰ کر سکتا ہے کہ میری تقلید اور اعمال درست ہیں۔ لہٰذا اگر تقلید اعلم واجب ہو تو اعمال کی کشتی اس طوفانی بھنور میں پھنسی ہی رہے گی۔

(۲) اگر اعلم کی تقلید واجب ہو اور غیر اعلم کی حرام ہو تو جس طرح عوام پر واجب ہے کہ اعلم کی تشخیص کریں اور پھر اس کی تقلید کریں اسی طرح مجتہدین (صاحبان فتویٰ) میں سے ہر ایک پر واجب ہونا چاہیئے کہ جب تک ان کو اپنی اعلمیت کا یقین پیدا نہ ہو جائے فتویٰ نہ دیں تو جس طرح عوام کے لئے تعین اعلم کے لئے علامات قرار دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح ان کے پاس بھی تشخیص اعلمیت کا کوئی ذریعہ ہو۔ بلکہ عوام کے لئے متعدد دعوے داروں میں سے ایک کا اعلم ہونا معلوم کرنا زیادہ مشکل ہے۔ بہ نسبت ان کے کیونکہ ان سب پر اگر تشخیص اعلمیت کے بغیر فتویٰ حرام ہو تو تاریخ مقرر کر کے یک جا جمع ہو کر چند روزہ تبادلہ خیالات سے کسی ایک کی اعلمیت پر یقین پیدا کر لیں گے پس تمام لوگوں کو اسی ایک کے فتویٰ پر عمل کرنے کی دعوت دیں اور خود سوائے اسی ایک کے فتوے سے دست برداری اختیار کر لیں۔

اور یہ اجتماع نقیضین ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے صاحب فتویٰ ہونا جائز اور عوام پر صرف ایک اعلم کی تقلید اور اس کے فتویٰ پر عمل کرنا واجب اور باقیوں کے فتاویٰ کو رد کر دینا ضروری۔ اور عجیب و غریب معمہ ہے کہ فتویٰ

دینے کے لئے مجتہد پر اپنی اعلمیت کا علم پیدا کرنا واجب نہ ہو اور عوام پر فتویٰ قبول کرنے کے لئے تشخیص اعلم ضروری ہو۔ جب غیر اعلم کی بات سننا ناجائز ہے تو غیر اعلم کو بات کرنے کی اجازت دینا کون سا عدل ہے۔

(۳) اگر تقلید اعلم واجب ہو تو آیت نفر (لولا نفر من کل فرقۃ۔ الایۃ) معاذ اللہ بے معنی رہ جائے گی کیونکہ اس مذکورہ آیت میں تو ارشاد خداوندی ہے کہ ہر قوم میں سے متعدد فقہا ہونے چاہئیں جو اپنے حلقۂ اثر میں تبلیغاتِ قرآنیہ اور احکامِ شرعیہ کو لوگوں تک پہنچائیں اور لوگوں کو عذابِ خدا سے خوفزدہ کریں اگر صرف اعلم کے علاوہ، دوسروں کے فتویٰ پہ عمل کرنا ناجائز ہو تو ہر قوم میں متعدد فقہا پیدا کرنے کا حکم دینا بے کار ہے اور وہی اجتماع متنافیین یا خلاف عدل ہی لازم آئے گا کہ اُدھر حکم ہے علماء کے لئے کہ زیادہ فقیہ بنو اور مفتی بن کر اپنی اپنی اقوام میں احکام شرعیہ کی ترویج کرو۔ اور ادھر عوام کو حکم ہے کہ صرف ایک ہی کا فتویٰ مانو۔ جو سب سے بڑا ہو اور اس کے علاوہ کسی کی نہ سُنو۔ دریں صورت تو کیا اچھا ہوتا کہ اُدھر علماء کو فرما دیتا کہ تم سب تکلیف نہ کرو۔ صرف ایک ہی فتویٰ دینے کے لئے کافی ہے۔ پس یہ اشتباہ ختم ہو جاتا۔

(۴) اگر تمام روئے زمین پر صرف ایک اعلم کی تقلید واجب ہو تو رفتہ رفتہ علم فقہ دنیا سے اٹھ جائے گا کیونکہ اعلم کی تقلید کے وجوب کا مطلب تو یہ ہے کہ باقیوں سے کوئی فتویٰ نہ لے۔ تو جس شخص نے اپنی عمر کا عزیز ترین حصہ طلب علوم دینیہ میں صرف کیا اور صرف اس لئے کہ فراغت کے بعد مذہب کی خدمات انجام دوں گا تو جب یہ فارغ ہوگا اور سب مسائل شرعیہ حاصل کرے گا تو چونکہ تقلید واجب ہے صرف اعلم کی۔ نہ تو یہ خود غیر کی تقلید کر سکتا ہے۔ کیونکہ خود مجتہد ہے اور نہ غیر مجتہد (عوام) اس کی تقلید کر سکتے ہیں کیونکہ یہ اعلم نہیں اگر مذہب کی خدمات کرے تو کیونکر؟ کیونکہ اگر زبانی خدمات کرے تو یہ صرف نقل قول ہی کر سکتا ہے اپنی علمی تحقیقات کو منظر عام پر نہیں لا سکتا کیونکہ لوگ اس کے مقلد نہیں ہیں اور اگر تصنیف کی طرف قدم بڑھائے تو وہاں بھی نقل قول پر ہی اُسے منحصر رہنا چاہیئے کیونکہ اس کی ذاتی تحقیقات ناقابل قبول ہیں اس لئے کہ وہ اعلم نہیں پس اس کی قومی و مذہبی خدمات صرف نقل قول تک ہی منحصر رہ گئیں تو اتنی کافی مدت تک اس کی سر دردی کا کیا فائدہ؟ اگر اپنی علمی تحقیقات کو ظاہر کرنے کے لئے یا عوام کو قبول کرنے کے لئے شرعی اجازت نہیں تو مذہبی خدمات کا جذبہ لے کر اپنی عمر عزیز کو رائیگاں ہی کرتا رہا۔ پھر تو سرے سے اس کو تحفۃ العوام یا دیگر عملیات کو تھوڑے عرصہ میں عبور کر کے پیش نماز ہو کر قوم کی خدمات کرتا رہنا چاہیئے تھا۔

دریں صورت جو شخص تحصیل علم کے میدان میں قدم رکھے اسے یقین کر لینا چاہیئے کہ آخری درجہ تک پہنچ جانے کے بعد بھی میری حیثیت ناقل کی ہوگی۔ عالمانہ حیثیت تب حاصل ہوگی جب روئے زمین میں اعلم صرف میں ہی ہوں گا تو سرے سے جذبۂ تحصیل علم رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ اور علومِ شرعیہ اٹھ جائیں گے۔

(۵) بحار الانوار میں سرکار رسالتؐ سے منقول ہے۔ فرمایا: علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں) کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح بنی اسرائیل کے انبیاء بیک وقت ہزاروں یا سینکڑوں کی تعداد

میں عہدہ تبلیغ نبوت پر فائز تھے اور اپنی اپنی بستی یا قوم یا گھر میں فرائض تبلیغ انجام دیا کرتے تھے؟ اسی طرح میری امت کے علماء ہزاروں یا سینکڑوں کی تعداد میں بستی بستی یا قوم قوم میں اپنے اپنے مقامات پر خدمات دینیہ انجام دیں گے اگر یہ فریضہ صرف اعلم کے ذمہ ہو۔ تو اس تشبیہ کا کیا فائدہ؟

(۶) یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ۔ خدا تمہاری آسانی چاہتا ہے اور تمہاری تنگی نہیں چاہتا۔ اگر پوری دنیا میں صرف ایک اعلم کی طرف رجوع کرنا واجب ہو تو نت نئے پیش آمدہ مسائل جن کا ان کے رسالہ عملیہ میں ذکر نہ ہو اور اطراف عالم میں ان کا پیش آنا ہے بھی ضروری۔ اگر ان سب میں صرف اسی ایک ہی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو تو ایک آدمی ان سب کے جوابات کیسے دیگا؟ اور یہ دریافت کرنے والے جواب کی آمد تک کون سی زندگی گزاریں گے۔ جبکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے جواب کی باری کب آئے گی؟ تو اس کا مطلب تو یہی ہے کہ معاملہ سب گڑبڑ رہے گا پس نہ مجتہد کو کسی وقت ان جوابات سے فراغت ملے گی تاکہ اس کی زندگی کا کوئی لمحہ آرام سے گزرنے پائے اور نہ عوام کو مسائل شرعیہ میں صحیح رہبری حاصل ہو سکے گی۔ بخلاف اس کے اگر ہر جگہ کے عوام کو اپنے قریب ترین مجتہد کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہو جس طرح کہ آئمہ کے زمانہ میں تھا۔ تو عوام کو مسائل دینیہ و احکام شرعیہ حاصل کرنے میں بھی آسانی اور مفتی پر بھی بوجھ کم۔ اگر ایسا نہ ہو تو شریعت سہلہ کی لفظ بے کار اور آیت نفی عُسر مذکورہ معاذ اللہ بے معنی ہو گی۔

(۷) آئمہ طاہرین علیہم السلام نے دُور دُور کے شیعوں کو اپنے قریب ترین عالم۔ راوی حدیث کی طرف رُجوع کرنے کا حکم کیوں دیا؟ (جس طرح کہ ص ۲۰۹، ۲۱۰ پر گزر چکا ہے) اگر صرف ایک اعلم کی طرف رجوع واجب تھا تو حضرت آئمہ طاہرینؑ اعلم بھی تھے اور معصوم بھی پس جب معصومینؑ نے اپنے حضورؑ کے زمانہ میں دُور دراز کے شیعوں پر یہ بھار ڈالنا گوارا نہ فرمایا تو زمانِ غیبت میں اس بوجھ کو کیوں گوارا کیا گیا؟ کیا زمانہ حضورؑ اور زمانہ غیبت کی شریعت جُدا جُدا ہے؟ پس نتیجہ یہی نکلا کہ تقلید اعلم کا وجوب دعوائے بلا دلیل اور بجائے نفع کے نقصان عظیم کا موجب ہے بلکہ ہر مجتہد جامع الشرائط کی تقلید جائز ہے اور اس کے فتوے پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اعلم کی تقلید واجب نہ ہو تو وحدت مرکز ختم ہو جائے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام شیعہ کا مرکز واحد صرف حضرت حجت علیہ السلام عج موجود ہیں اور تمام علماء اسی کی شعاعیں ہیں اور اگر خواہ مخواہ مرکز ظاہری کی ہی وحدت کا مطالبہ ہو تو وہ قطعاً زمانِ غیبت میں حاصل ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اعلم کی تقلید کی صورت میں وحدت مرکز تو جب ہو گی کہ جب اعلمیت کا مدعی صرف ایک ہی ہو۔ جب ہر رسالہ عملیہ کے سرورق پر مجتہد صاحب رسالہ کے نام کے ساتھ اعلم کی لفظ موجود ہو تو اعلمیت کا فیصلہ کیونکر ہو گا۔ اور وحدت کیسے آئے گی؟ اور ممکن ہے کہ جس کو ایک طبقہ والوں نے اعلم کہا ہے۔ دوسرے طبقہ کے نزدیک ان کا نظریہ غلط ہو بلکہ ان کی نگاہوں میں اعلم کوئی اور ہو۔

صرف شہرت بھی تشخیص اعلم میں ناکام ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ میں ایک کی اعلمیت کا شہرہ ہو۔ اور دوسرے طبقہ میں دوسرے کی شہرت ہو اور تیسرے طبقہ میں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور زیادہ شہرت کا حامل ہو جس طرح دورِ حاضر میں یہ چیز عیاں راچہ بیان کی مصداق ہے نہ اسس اعلمیت کا تسویہ ہو سکتا ہے اور نہ وحدت قائم ہو سکتی ہے

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ عقلاً اعلم کی طرف رجوع کرنا واجب ہے کیونکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ ہر فن میں بوقت ضرورت اس فن کے ماہر ترین انسان کی طرف رجوع کیا جائے۔ مثلاً بیمار کو علاج کے لئے اعلیٰ ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنے کی عقل دعوت دیتی ہے۔ مکان کے لئے اعلیٰ معمار، قانون کے لئے اعلیٰ وکیل، پڑھنے کے لئے اعلیٰ استاد وعلی ہذاالقیاس گویا ہر فن میں فن کے ماہر ترین انسان کی طرف رجوع کرنا عقل کا اٹل فیصلہ ہے۔ پس مسائل شرعیہ میں اعلم کی طرف رجوع ضروری ہے

اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ زمان آئمہ میں عملی طور پر اسس نظریہ کے خلاف کرکے اس کو رد کر دیا جا چکا ہے۔ اور ثانیاً یہ کہ ہر فن میں ماہر ترین فن کی تلاش قطعاً عقلاً واجب نہیں کیونکہ دنیا بھر میں ہر فن کا ماہر ترین تو ایک وقت میں صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اگر پوری دنیا والوں کے لئے صرف اسی ایک کی طرف رجوع کرنا واجب عقلی ہوتا تو تمام دنیا کا نظام معطل ہو جاتا۔ ہاں عقلاً اتنا واجب ضرور ہے کہ ضرورت کے وقت پہلے پہل قریب ترین عالم فن کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر اس سے ضرورت پوری نہ ہو سکے تو علاقہ بھر کے ماہر فن کو طلب کیا جائے اگر اس سے بھی مطلب حل نہ ہو تو حسب حیثیت آگے قدم بڑھاتا چلا جائے۔ بلکہ گھر میں بیٹھ کر قریب ترین ماہر فن سے مطلب پورا ہو سکنے کے باوجود دور دراز کی سفر کی تکالیف برداشت کرنا اور قریب والوں کو نظر انداز کرنا قطعاً خلاف عقل ہے پس مسائل شرعیہ کے حاصل کرنے کے لئے بھی عقلی نقطۂ نگاہ یہی ہے کہ اولاً قریب ترین عالم کی طرف رجوع ہو اور بصورت عجز آگے قدم رکھا جائے اور اس کے خلاف کرنا خلاف عقل ہے اور خلاف نقل بھی ہے۔ جس طرح کہ مفصلاً ذکر کیا جا چکا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ آج تک تمام علمائے کرام ومجتہدین عظام کا یہی فتویٰ رہا ہے کہ اعلم کی تقلید واجب ہے اور اس کے بغیر اعمال سب باطل ہیں تو اسس کا جواب یہ ہے کہ تمام مجتہدین کا اگر یہ فتویٰ ہوتا تو ہر دور میں متعدد صاحب فتوے کیوں موجود ہوتے۔ دورِ حاضر میں ایران وعراق وہند میں متعدد صاحب رسالہ موجود ہیں۔ اسی طرح کربلا، سامرا، کاظمین اور ایران کے ہر بڑے شہر میں مجتہدین موجود ہیں۔ جن کے فتاویٰ پر عمل ان کے مقلدین کرتے ہیں اگر ان تمام کے نزدیک صرف اعلم کی تقلید واجب ہوتی تو فتویٰ دینے یا رسالۂ عملیہ لکھنے سے پہلے اپنی اعلمیت کا علم کیوں نہ پیدا کر لیتے؟ بلکہ مشاہدہ ہے کہ ایک ہی وقت میں اساتذۂ مجتہدین بھی موجود ہیں اور ان کے تلامذۂ مجتہدین بھی موجود ہیں۔ استاد اور شاگرد ہر دو کے عملیہ بھی موجود ہیں اور علیحدہ علیحدہ مقلدین بھی موجود ہیں۔ اب اگر اعلم کی تقلید واجب ہو تو ان دو میں سے یا استاد اعلم ہے یا شاگرد پس غیر اعلم کو چاہیئے کہ فتویٰ سے دست بردار ہو جائے۔ جبکہ وہ جانتا ہے کہ تقلید صرف اعلم کی ہی ہو سکتی ہے۔ لہذا اپنے تمام حلقۂ اثر میں اپنے سے اعلم کی طرف رجوع کا حکم دیدے اور حد یہ ہے کہ چونکہ یہ

بات عام چل چکی ہے کہ اعلم کی ہی تقلید ہونی چاہیئے۔ لہٰذا اساتذہ کے رسائل عملیہ کے سر ورق پر بھی نام کے ساتھ
اعلم کی لفظ ہے اور تلامذہ کے رسائل عملیہ کے سر ورق پر بھی ان کے نام کے ساتھ اعلم کی لفظ موجود ہے اور بعض
اوقات ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے کہ تلامذہ کا حلقہ تقلید بہ نسبت اساتذہ کے وسیع تر ہوتا ہے۔ پس اب یہ فیصلہ کرنا
آسان ہے کہ آیا تمام مجتہدین کے نزدیک اعلم کی تقلید واجب ہے یا نہ؟ اور ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ تمام مجتہدین
اعلم کی تقلید واجب نہیں سمجھتے اور ان کا اپنا عمل اس کا شاہد بین ہے۔ بلکہ ان کا عمل صاف طور پر اعلان کر رہا ہے
کہ ہر مجتہد جامع الشرائط کی تقلید جائز ہے۔

اب ذرا اعلم کی لفظ پر غور کیجئے۔ اگر مسئلہ تقلید اعلم میں، اعلم کا مطلب یہ ہو کہ دور موجود کے تمام مجتہدین
سے اعلم تو سابقہ براہین و ادلہ سے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس معنی میں تقلید اعلم واجب نہیں ورنہ وہ خرابیاں لازم
آئیں گی جو مذکور ہو چکی ہیں اور نیز نہ اعلم اس معنی میں۔ مقلدین کو معلوم ہو سکتا ہے اور نہ خود مجتہدین اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں
تاکہ اس پر عملی اقدام کیا جا سکے پس اعلم کا معنی ہے (اعلم فی الجملہ) تو اس اعتبار سے ہر جامع الشرائط مجتہد عوام کے مقابلہ
میں اعلم ہے اور اس کی تقلید واجب ہے اگر اعلم کا معنی یہ نہ ہو، بلکہ وہ پہلا معنی یعنی تمام مجتہدین میں سے اعلم تو ہر مجتہد کو
فتویٰ دینے یا رسالہ لکھنے سے پہلے ضروری ہو جائیگا کہ تمام مجتہدین میں سے اپنی اعلمیت کا علم پیدا کریں اور پھر فتویٰ دیں اور
یہ علم پیدا کرنا مشکل نہیں بلکہ محالات میں سے ہے۔ لہٰذا اعلم کا دوسرا معنی بالکل درست ہے۔ اور حدیث سابق مَنْ
كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِناً لِنَفْسِهِ الحدیث۔ یعنی فقہاء میں جو شخص بھی ان شرائط کا جامع ہو عوام اس کی تقلید کر سکتے
ہیں یا اس کے ساتھ دوسری حدیثیں مثلاً جو بھی ہمارے حلال و حرام کا جاننے والا اور ہمارے احکام کا عالم ہو وہ ہماری طرف
سے تمہارے اوپر حاکم ہے یہ ہمارے راویانِ حدیث ہماری طرف سے تمہارے اوپر حجت ہیں۔ گویا آئمہ کی یہ سب فرمائشات
اسی دوسرے معنی کی شاہد ہیں۔ پس تمام مجتہدین اس معنی کے اعتبار سے اعلم کی صفت سے متصف ہیں کیونکہ وہ عوام سے
یقیناً اعلم ہیں۔ لہٰذا ان کی تقلید میں اعمال بجالانا درست ہے۔ پس اعلم کی لفظ صرف رسمی ہی ہے۔ ایران و عراق و
ہند وغیرہ میں جہاں جہاں لوگ کسی مجتہد جامع الشرائط کی تقلید سے اعمال بجالاتے ہیں۔ بالکل درست اور انشاء اللہ موجب اجر
ہیں۔ خداوند کریم کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا اور اس نے اپنے دین کو سہل کیا ہے۔ وہ اپنے بندوں پر حرج و عسر نہیں ڈالتا

پس تمام مجتہدین جو جامع شرائطِ فتویٰ ہوں اپنے اپنے مقامات پر فتویٰ دے سکتے ہیں اور علاقہ والے ان سے
استفادہ کر سکتے ہیں ان کے ساتھ حضرت حجت قائم آل محمد عجل اللہ فرجہ علیہ السلام کی تائید غیبی شامل حال ہے اور وہ سب
ان کے فرائض نیابت عامہ انجام دینے کے اہل ہیں اور ان کی طرف سے اس کار خیر کے انجام دینے پر مامور ہیں۔ جس طرح ان کا
فرض ہے کہ ان سے کماحقہٗ استفادہ کریں اور ان کو خدمات علمیہ کا موقع دیں۔ بحار الانوار جلد ۱ حدیث میں وارد ہے کہ بروز محشر
تین چیزیں اللہ کی بارگاہ میں اپنی کس مپرسی کی شکایت کریں گی۔

(۱) قرآن مجید جس کو لاکر رکھ دیا گیا ہو اور اس پر تلاوت نہ کی جائے (صرف الماری یا صندوق کی ہی زینت بنا رہے)

(۲) وہ مسجد خستہ حال جس میں نماز نہ پڑھی جائے۔

(۳) وہ عالم جس سے مسائل نہ دریافت کئے جائیں (تقلید اعلم کی مشہور اصطلاح کے مطابق جبکہ عوام کا فریضہ صرف ایک سے ہی دریافت کرنے پر منحصر ہو) تو حدیث کے اس فقرہ کا کوئی معنی ہی نہیں۔ اس اصطلاح کے مطابق غیر اعلم مجتہد کی بروز محشر شکایت ہی بے جا ہے پس تمام مجتہدین جو جامع الشرائط ہوں مجموعی طور پر اعلم ہیں اور حضرت حجت کے نائبین عمومی ہیں۔ تمام عالم میں ان کا فیض درحقیقت انہی کا فیض ہے۔ جس طرح شہر میں بجلی گھر ایک ہوتا ہے اور اس سے ربط رکھنے والے قمقمے دُور دُور تک گھروں میں روشنی پہنچاتے ہیں۔ یہ روشنی ان کی نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت اسی مرکز کا فیض ہوا کرتا ہے جس سے ان قمقموں کی تار ملی ہوئی ہوتی ہے یا جس طرح ایک بادشاہ سیر و تفریح یا دیگر امور ضروریہ کے لئے کچھ عرصہ کے لئے ملک سے باہر چلا جائے یا کسی مصلحت کے ماتحت گھر کے اندر ہی بیٹھ جائے اور باہر نہ نکلے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوا کرتا کہ ملک بادشاہ کے فیض سے محروم ہے کیونکہ اطراف مملکت میں ہر ضلع یا صوبہ کے مقامی عہدہ داروں کا نظام سلطنت کو بحال رکھنا اور ضابطۂ قوانین مملکت کی پاسداری و نگہبانی کرتے رہنا اسی سلطانِ غائب کا ہی فیض ہوا کرتا ہے اور وہ ملک بھی اسی کا ملک کہلاتا ہے یہ سب اسی کے ملازمین شمار ہوتے ہیں۔ بادشاہ کا آنکھوں کے سامنے ہونا یا غائب ہونا اس کے فیض عام میں دخیل نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ شاہی نظام کی کفالت ہی اس کا فیض ہے۔

پس زمانِ غیبت میں علمائے کرام اپنے عہدہ کے ذمہ دار ہیں اور ان کی کوتاہیاں موجب باز پُرس ہیں اور اُن کی اپنے فرائض کی انجام دہی موجب اجر عظیم ہے چنانچہ جو علماء خوشنودئ خدا کو ملحوظ رکھ کر احکام قرآن کو زندہ کریں اور احادیث اہلبیت عصمت اور ان کی صحیح تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کرائیں اور خدماتِ دینیہ کو کما حقہٗ بجا لائیں۔ ان کے متعلق وارد ہے کہ وہ کافل ایتام آلِ محمدؐ کے نام سے پکارے جائیں گے۔ کتاب بحارالانوار جلد ۱ میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اپنے حقیقی باپ کے سایہ سے محروم رہنے والے یتیموں سے بھی بڑا یتیم وہ شخص ہے جو اپنے امام کے ظلِّ عاطفت سے محروم ہو جائے اور ان تک پہنچ نہ سکے اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ جن مسائل دینیہ سے مجھے تعلق ہے اور مجھ سے باز پُرس ہے ان کے احکام کیا ہیں؟

آگاہ ہو یا جو شخص ہمارے شیعوں میں سے ہمارے علوم کا عالم ہو تو یہ شخص جاہل جو نہ ہمارے احکام جانتا ہے اور نہ ہم تک پہنچ سکتا ہے اس کی گود میں بمنزلہ یتیم کے ہے پس جو اس کو ہدایت کرے گا اور اس کی رہبری کر کے اس کو ہماری شریعت کے مسائل سکھائے گا وہ ہمارے ساتھ رفیق اعلیٰ میں ہوگا (علامہ مجلسی قدہ نے رفیق کے متعلق فرمایا ہے کہ مراد اس سے انبیاء کی جماعت ہے جو "اعلیٰ علیین" میں ہوگی۔

نیز بحارالانوار میں سرکار رسالتؐ سے پانچ کاموں کو عبادت کے نام سے موسوم کرنا منقول ہے۔ آپ نے فرمایا

(۱) علماء کے ساتھ بیٹھنا عبادت ہے (علمائے صالحین جن کا مقصد رضائے خدا کے لئے ترویج دینِ خدا ہو۔

(۲) حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کا چہرہ دیکھنا عبادت ہے۔

(۳) قرآن شریف پر نظر کرنا عبادت ہے (تلاوت وغیرہ کا ثواب اس سے الگ ہے)

(۴) بیت اللہ (کعبہ) کا دیکھنا عبادت ہے۔

(۵) والدین کی طرف (مہر و محبت سے) نظر کرنا عبادت ہے۔

پس بہر کیف بفرمانِ ائمہ طاہرینؑ عوام پر علماء حاکم و حجت ہیں اور اُن پر آئمہ حجت خدا و حاکم ہیں تو جس طرح عوام پر ان کے حقوق ہیں۔ اور وُہ اُن کی حقوق تلفی میں مسئول و ماخوذ ہوں گے اسی طرح ائمہ کی طرف سے عوام کے اُن پر حقوق ہیں جن کے وہ مسئول ہوں گے۔

اپنے فرائض منصبیہ کی ادائیگی پر عوام سے اُجرت طلب کرنا یا دیگر منافع دنیا پر نظر رکھنا علماء کی شانِ نیابت کے سراسر منافی ہے بلکہ ان کو تو اپنے حسنِ کردار اور بلندی سیرت سے عوام کو سیرت آئمہ کی طرف جذب کرنا ضروری ہے اور یہی ان کی شان ہے۔ ورنہ جس طرح جنت کے اعلیٰ درجات میں علمائے عاملین کا مقام ہے اسی طرح جہنم کے اسفل درکات میں علمائے سوء کی جگہ ہے۔

عُلمائے سوء کا حشر

بحارالانوار جلد میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جہنم میں علمائے سوء کیلئے طبقات منقسم ہیں۔

(۱) وہ عالم جو اپنے علم کو اپنے پاس خزانہ کرے اور دوسروں تک نہ پہنچائے وہ جہنم کے پہلے طبقہ میں ہوگا۔

(۲) وہ عالم جب اس کو نصیحت کی جائے تو ناک چڑھائے اور جب وُہ دوسروں کو نصیحت کرے تو سختی سے کام لے یہ جہنم کے دوسرے طبقہ میں ہوگا۔

(۳) وہ عالم جو اپنے علم کو صاحبانِ ثروت کے سامنے پیش کرے اور مساکین کو محروم رکھے وہ جہنم کے تیسرے طبقہ میں ہوگا

(۴) وہ عالم کہ اگر اس کی کوئی بات نہ مانی جائے یا اس کے معاملہ میں کوتاہی برتی جائے تو جابر حکمرانوں کا سا سلوک کرے وہ جہنم کے چوتھے طبقہ میں ہوگا۔

(۵) وہ عالم جو یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال کی تلاش کرے تاکہ لوگ اس کو بڑا عالم کہیں اور اس کا رُعب زیادہ

ہو جائے وُہ جہنم کے پانچویں طبقہ میں جگہ پائے گا۔

(۶) وہ شخص جو لوگوں میں اپنا مفتی ہونا ظاہر کرے اور ان کو اپنی طرف دعوت دے خواہ درحقیقت وہ کچھ بھی نہ جانتا ہو وہ جہنم کے چھٹے طبقے میں جائے گا۔

(۷) وہ عالم جو اپنے علم کو خود غرضی اور بڑائی کا آلہ بنائے وہ جہنم کے ساتویں طبقہ میں ہوگا۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعُہُ الذِّکْرٰی

مقبولیّتِ اعمال

خالق و مخلوق کے درمیان انبیاء طاہرین علیہم السلام کا سلسلہ اس لئے ہے کہ ہر انسان براہِ راست اللہ سے احکام حاصل کرنے کا اہل نہیں۔ انسان مادی جکڑ میں اس قدر پھنسا ہے کہ صرف عقلی ہدایات پر قطعاً توجہ ہی نہیں دیتا جب تک کہ باہر سے کوئی طاقت اس کو اس طرف متوجہ کرنے والی نہ ہو

بے شک خالق کائنات کا عین لطف ہے کہ ہمیں عقل عطا فرما کر اور اس کو خیر و شر کے ادراک کا اہل قرار دیکر باقی موجودات پر افضلیت و کرامت عطا فرمائی۔ پس انسان اپنی اس عقل کے ذریعے اطراف عالم میں غور و فکر کرکے اور اپنے نفس و بدن میں توجہ کرکے اور ان تمام چیزوں کے مصالح و مفاسد پر تبصرہ کرکے اس نتیجہ تک تو ضرور پہنچ جاتا ہے کہ میرا خالق ضرور موجود ہے جو مجانست و مماثلت مخلوقات سے بلند و بالا ہے لیکن اتنی فرصت کہاں؟ کہ عقل کو ان اشیاء میں غور کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ محبت دنیا خواہش نفسیہ، حرص و ہوس وغیرہ کا بھوت کسی وقت سر سے اُترے تو کسی دوسری طرف توجہ کی جا سکے اور یہ بات بھی ساتھ ساتھ ہے کہ عمر میں جس قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خواہشات و اغراض میں اسی قدر زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ پس انسان کا دماغی کارخانہ صرف ایک ہی رُخ کی طرف استعمال ہوتا رہتا ہے۔ یعنی منافع دنیاویہ کی سوچ بچار۔

عوارض مادیہ اور اغراض نفسیہ اس کو غرض خلقت کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتے تاکہ چشم بصیرت کھلے اور خالق کی معرفت اور اس کی خوشنودی کے ذرائع کی طرف دھیان کیا جائے اور تنہا عقل اگرچہ صلاحیت رکھتا ہے کہ معرفت کے اسباب پر غور کرکے اللہ کی ذات کو پہچان لے لیکن موانع مذکورہ کی موجودگی میں ان منازل کا طے کرسکنا بہت گراں ہے۔

اللہ نے کمال لطف و عنایت سے عقل کی رہبری اور تقویت کے لئے سلسلۂ انبیاء جاری فرمادیا۔ تاکہ انسان آسانی سے اس طرف آسکے اور پھر اس کو فرائض عملیہ سے آگاہ کیا جائے۔ پس ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا یہی کام تھا کہ عقول

انسانیہ کی رہبری فرما کر انسان کو ورطۂ ظلمات نفسانیہ سے نکال کر احاطۂ قدس روحانیہ میں لا کھڑا کریں اور دنیاوی منافع کی ناپائیداری، زندگی کی فنا اور دنیا کی عدم وفا وغیرہ پر متوجہ کر کے اس کو آخرت کے منافع کی طرف راغب کریں اور اس کی اس ابدی زندگی کے لئے جن جن اعمال کی ضرورت ہے ان سے ان کو روشناس کرائیں۔

پس اس سلسلہ میں حضرت رسالتمآبؐ کا وجود ذیجود سید الانبیاء کی حیثیت رکھتا ہے اور جس قدر ان کا حلقہ تبلیغ زیادہ اسی قدر باقی انبیاء کے مقابلہ میں اللہ کے نزدیک ان کی توقیر و اجلال بھی زیادہ ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتے تو وہ ہرگز نہ ہوتے اور جس طرح نبی کی رہبری کے بغیر خدا کی طرف متوجہ ہونا ہمارے لئے دشوار تھا اسی طرح توجہ ہو جانے اور معرفت حاصل کر چکنے کے بعد احکام خدا اور اس کی ذات کی طرف تقرب کے ذرائع واسباب کا معلوم کرنا ہماری عقلوں کی رسائی سے بالاتر تھا۔ ان میں از خود یہ استعداد ہرگز نہیں کہ خدائی احکام واجبات و محرمات خود سوچ کر پیدا کر سکیں۔

پس تمام مسلمانوں پر جناب رسالتمآبؐ کا احسان عظیم ہے کہ ظلمت کدہ کفر و شرک سے نجات دلا کر انہوں نے ہم کو توحید کی معرفت اور اس کی لذات روحانیہ سے ہمکنار کیا اور قرب خدا حاصل کرنے کے وہ زرین اصول تعلیم فرمائے جو رہتی دنیا تک نوع انسانی کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اگر انسان ان کے تعلیم کردہ اصول و فروع کو اپنا کر قرب خداوندی کا جویا ہو تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کی معرفت حاصل کر کے ان کی محبت و اطاعت کو اپنا شعار قرار دے کیونکہ خالق کائنات کے بعد یہ محسن کائنات ہیں۔ اس کی ذات نے انکو خلعت وجود سے آراستہ کیا اور ان کی ذات سے اس کی معرفت اور قرب کا درس ملا۔ بلکہ خالق کو اگر اس ذات مقدسہ کی تخلیق مقصود نہ ہوتی تو کائنات نعمت وجود سے ہم آغوش نہ ہوتی۔ اسی بناء پر تو حضورؐ کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ مجھے اپنی جان و مال و اولاد سے محبوب ترین نہ قرار دے۔ پس انسان ہزاروں اعمال صالحہ بجالائے لیکن جب تک اس محسن انسانیت سے قلبی محبت نہ رکھتا ہو اور اس کی اطاعت کو فرض نہ سمجھتا ہو اس کے تمام اعمال اکارت جانے کے قابل ہیں اور اسی طرح ان کی محبت و اطاعت کے ساتھ ان کی عترت طاہرہ جو ان کی صحیح قائمقام ہے ان کی معرفت اور محبت و اطاعت بھی ویسے ہی فرض عین ہے۔ ورنہ رسالتمآبؐ کی خوشنودی قطعاً حاصل ہو نہیں سکتی کیونکہ ان کے بعد ان کی صحیح تعلیمات کے امت تک پہنچانے کے یہی ذمہ دار ہیں اور قرآنی احکام ان ہی کی بدولت ہم تک پہنچے ہیں۔ پس قرب خدا، رسالتمآبؐ کے قرب پر موقوف ہے کیونکہ حضورؐ کی اطاعت ہی محبت پروردگار کا زینہ ہے۔ اور قرب رسالتمآبؐ ان کے قرب پر موقوف ہے پس تمام اعمال صالحہ کی مقبولیت اور خدا و رسولؐ کی خوشنودی انہی کی اطاعت و معرفت پر منحصر ہے۔

چنانچہ مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآبؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کی۔

یارسول اللہؐ! اکل من قال لا الٰہ الا اللہ حضورؐ! یہ فرمائیے کہ جو بھی لا الٰہ الا اللہ پڑھے وہ مومن ہے؟ آپ

مومن؛ قال عداوتنا تلحق بالیھود والنصاریٰ انکم لاتدخلون الجنۃ حتی تحبونی وکذب من زعم انہ یحبنی ویبغض ھذا یعنی علیاً علیہ السّلام

نے فرمایا کہ ہماری عداوت یہود و نصاریٰ کے ساتھ ملحق کر دیتی ہے تحقیق تم لوگ ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگے جبتک مجھ سے محبت نہ کروگے اور جو شخص علیؑ سے بغض رکھتا ہو اور میری محبت کا دعویٰ کرتا ہو وہ جھوٹا ہے

پس اس روایت سے معلوم ہوا کہ لاالٰہ الا اللہ پڑھنا اور جنت میں جانے کی آرزو رکھنا فضول ہے۔ جب تک محبت رسولؐ نہ ہو اور محبت رسولؐ کا دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے جبتک محبت علیؑ نہ ہو گویا رضائے خالق دخول جنت اور محبت رسولؐ کا مدار و محور علیؑ ہے۔

(۲) مسند احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ جب یہ آیت قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی نازل ہوئی تو بروایت ابن عباس لوگوں نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ کون لوگ آپ کے قرابت دار مراد ہیں جن کی مودت فرض کی گئی ہے تو آپ نے فرمایا علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے فرزند۔ دلائل الصدق میں نیا بیع المودت۔ صواعق محرقہ اور درّ منثور وغیرہ متعدد کتابوں سے اس روایت کو مختلف الفاظ سے نقل کیا گیا ہے مقصد سب سے یہی ہے کہ اس آیہ وافی ہدایہ میں جن لوگوں کی مودت فرض کی گئی ہے وہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب اور جناب بتول معظمہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ اور ان کی اولاد طاہرین ہیں۔ اور مقدمہ تفسیر کبیر امام رازی سے بھی اسی طرح منقول ہے گویا جناب رسالتمآبؐ کی تعلیمات کا اجر ہے مودت آل رسولؐ تو جبتک مودت اہل بیت نہ ہوگی۔ تعلیمات قرآن پر عمل کرنا ہی تصرف غاصبانہ ہوگا اور حرام ہوگا جس طرح کہ عام کسی اجیر کی اُجرت ادا کئے بغیر اس چیز کا استعمال ناجائز و حرام ہوتا ہے جس سے اس اُجرت کا تعلق ہو۔

معرفت امام

(۳) جامع الاخبار (فصل الموت) میں حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت آل محمدؐ پر مرنے والے اور بغض آل محمدؐ پر مرنے والے لوگوں کے متعلق ارشادات ذیل منقول ہیں۔

(۱) مَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَھِیْدًا
جو آل محمدؐ کی محبت پر مرتا ہے۔ وہ شہید مرتا ہے۔

(۲) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ مَغْفُوْرًا
آگاہ ہو! جو بھی آل محمدؐ کی محبت پر مرے وہ مغفور ہو کر مرتا ہے۔

(۳) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ تَائِبًا
آگاہ ہو! جو بھی آل محمدؐ کی محبت پر مرے وہ تائب ہو کر مرتا ہے۔

(۴) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ مُؤْمِنًا مُسْتَکْمِلَ الْاِیْمَانِ۔
آگاہ ہو! جو بھی آل محمدؐ کی محبت پر مرے وہ مومن کامل الایمان ہو کر مرتا ہے۔

(۵) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ بَشَّرَہٗ مَلَکُ الْمَوْتِ بِالْجَنَّۃِ ثُمَّ مُنْکَرٌ وَنَکِیْرٌ۔
آگاہ ہو! جو بھی آل محمدؐ کی محبت لے کر مرے اسے ملک الموت اور اس کے بعد منکر و نکیر بھی جنت کی خوشخبری دیتے ہیں۔

(۶) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ فُتِحَ لَہٗ فِیْ قَبْرِہٖ بَابَانِ اِلَی الْجَنَّۃِ
آگاہ ہو! جو بھی آل محمدؐ کی محبت پر مرتا ہے اس کے لئے قبر میں دو دروازے جنت کی طرف کھول دیئے جاتے ہیں۔

(۷) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ جَعَلَ اللّٰہُ قَبْرَہٗ مَزَارَ مَلَائِکَةِ الرَّحْمَةِ

آگاہ ہو! کہ جو بھی آل محمد کی محبت پر مرے اللہ اس کی قبر کو رحمت کے فرشتوں کی زیارت گاہ بنا دیتا ہے۔

(۸) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ عَلَی السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ

آگاہ ہو! کہ جو شخص آلِ محمدؐ کی محبت لے کر مرتا ہے وہ سنت و جماعت پہ ہو کر مرتا ہے۔

(۹) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْهِ اٰیِسٌ مِّنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

آگاہ ہو کہ جو شخص آلِ محمدؐ سے بغض رکھ کر مرتا ہے تو قیامت کے روز جب محشور ہو گا تو اس کی پیشانی پہ لکھا ہو گا کہ یہ خدا کی رحمت سے ناامید ہے۔

(۱۰) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ کَافِرًا

آگاہ ہو! کہ جو آلِ محمدؐ کی دشمنی پر مرتا ہے وہ کافر ہو کر مرتا ہے۔

(۱۱) اَلَا وَمَنْ مَاتَ عَلٰی بُغْضِ اٰلِ مُحَمَّدٍ لَمْ یَشَمَّ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ

آگاہ ہو! کہ جو شخص آلِ محمدؐ کے بغض پہ مر جائے وہ جنت کی بُو نہ سونگھے گا۔

جناب رسالتمآب کی یہ فرمائشات تفسیر کشاف سے بھی منقول ہیں اسی بناء پر حضرت صادقؑ آل محمدؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم اہل بیت سے عداوت رکھنے والے کیلئے نماز، روزہ وغیرہ یا چوری، زنا دغیرہ کرنا یکساں ہے کیونکہ لامحالہ اس کی بازگشت تو دوزخ ہے ہی۔

(۴) جامع الاخبار میں (مفصّل معرفت آئمہ کے بیان میں) جناب سلمان پاک سے ایک طویل روایت میں منقول ہے کہ میں ایک دفعہ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھ کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: سلمان! التحقیق! خداوندکریم نے کوئی رسولؐ و نبی مبعوث نہیں فرمایا، مگر یہ کہ اس کیلئے بارہ نقیب بھی بھیجے" میں نے عرض کی یارسول اللہ! میں یہ بات دونوں کتابوں (توراۃ، انجیل) والوں کی طرف سے جانتا ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا: "کہ تو میرے نقباء کو جانتا ہے؟ میں نے عرض کی کہ اللہ لاللہ کا رسول بہتر جانتا ہے تو آپ نے فرمایا: اے سلمان! خدا نے مجھے اپنے برگزیدہ نور سے خلق فرمایا اور مجھے اپنی اطاعت کی دعوت دی تو میں نے قبول کر لی پھر اس اللہ نے علی الترتیب اسی میرے نور سے علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کے انوار کو خلق فرمایا اور ان کو اپنی اطاعت کی دعوت دی اور ان سب نے قبول کی۔ پھر اس نے اپنے اسماء سے ہمارے پانچ نام مقرر فرمائے۔ پس اللہ محمود ہے اور میں محمدؐ ہوں۔ خدا اعلیٰ ہے اور یہ علیؑ ہے، اللہ فاطر ہے اور یہ فاطمہ ہے اللہ صاحب احسان ہے اور یہ حسنؑ ہے اور خدا محسن ہے اور یہ حسینؑ ہے پھر حسینؑ کے نور سے نو اماموں کے انوار خلق فرمائے اور ان کو اپنی اطاعت کی دعوت دی، ان سب نے قبول کی اور یہ سب کچھ اس وقت ہوا۔ جب نہ آسمان خلق ہوا تھا اور نہ زمین بچھائی گئی تھی۔ اور نہ ہوا نہ ملک نہ بشر کی تخلیق ہوئی تھی"

ہم عالم انوار میں اس کی تسبیح کرتے تھے اور اس کے ارشادات کی اطاعت کرتے تھے۔ میں نے عرض کی۔ میرا ماں باپ

آپ پر فدا ہو۔ یارسول اللہؐ! جو شخص کما حقہ ان کی معرفت رکھتا ہو اس کا کیا مرتبہ ہے ؟ تو آپؐ نے فرمایا : اے سلیمان! جو شخص ان کی معرفت رکھے جس طرح حق معرفت ہے اور ان کی موالات رکھتے ہوئے ان کی اطاعت کرے اور ان کے دشمنوں سے بیزاری کرے وہ ہم میں سے ہوگا۔ اور جس مقام پر ہوں گے وہ اسی مقام پر ہوگا۔ جہاں ہماری سکونت ہوگی اس کی بھی وہاں سکونت ہوگی ۔میں نے عرض کی کہ ان کے اسماء و انساب کی معرفت کے بغیر انسان مومن بن سکتا ہے ۔ تو آپ نے فرمایا: نہیں۔ اے سلمان ! میں نے عرض کی کہ میں ان کو کس طرح پہچانوں ؟ آپ نے فرمایا حسینؑ تک تو پہچان چکا ہے ؟ میں نے عرض کی جی ہاں ۔ آپ نے فرمایا پھر اس کے بعد سید العابدین علی بن الحسین پھر اس کا فرزند محمد بن علی باقر علم الاوّلین و آخرین ، پھر جعفر بن محمد اللہ کی سچی زبان ، پھر موسیٰ بن جعفر جو اللہ کی راہ میں غصہ کو ضبط کرنے والا ہوگا۔ پھر علی بن موسیٰ الرضا ، پھر محمد بن علی المختار ، پھر علی بن محمد الہادی پھر حسن بن علی پھر حسن کا فرزند القائم عج

سلمان کہتا ہے کہ میں نے رو کر عرض کی یارسول اللہ ! کیا مجھے ان کے زمانے تک مہلت دی جائے گی ؟ آپ نے فرمایا اس آیت کو پڑھ[1] فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۔ سلمان بیان کرتا ہے کہ یہ (سن کر) میرا اشتیاق اور گریہ زیادہ ہوا اور میں نے عرض کی یا رسول اللہؐ ! کیا یہ آپؐ کی طرف سے عہد ہے ؟ تو آپؐ نے فرمایا : ہاں میری طرف سے بھی اور علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ و باقی نو۹ ائمہ جو حسینؑ کی نسل سے ہونے والے ہیں۔ سب کی طرف سے ، تیرے ساتھ اور ہر اس شخص کے ساتھ جو ہم میں سے اور ہماری محبت کی وجہ سے ظلم کا شکار ہے اور ایمان خالص رکھتا ہے ، عہد ہے ۔

ہاں خدا کی قسم اے سلمان ! ابلیس اور اس کے سب لشکر اور تمام خالص کافر حاضر کئے جائیں گے اور ان سے انتقام و بدلہ لیا جائے گا اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا ۔ اس آیۂ مجیدہ کی تاویل ہم ہی ہیں ۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے ۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ	ہم ارادہ رکھتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں کمزور کر دیئے گئے اور ان کو امام خلق اور ان کو زمین کا وارث قرار دیں اور ان کو زمین میں پوری قدرت دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وُہ انجام دکھائیں جس سے وہ ڈرتے تھے ۔

سلمانؓ کہتا ہے کہ میں سرکار دو عالم کی خدمت سے اٹھ کھڑا ہوا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب پرواہ نہیں کہ موت پر جا پڑوں یا موت مجھ پر آ پڑے ۔

---

[1] اس آیت سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ مومنین کو حضرت حجتؑ کے زمانے میں دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اسی لئے حضرت سلمان نے عرض کی کہ کیا آپ کا عہد ہے کہ مجھے بھی اس حق کے دور میں دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ تو آپ نے فرمایا کہ تجھے بھی اور ہر مخلص مومن کو اٹھایا جائے گا یہ ہمارا عہد ہے منہ

(۵) محاسن برقی سے منقول ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ اہلِ بیت کی محبت کو لازم پکڑو۔ مجھے قسم ہے! اس ذات کی جس کے یدِ قدرت میں میری جان ہے ہمارے حق کی معرفت کے سوا کسی انسان کیلئے کوئی عمل فائدہ مند نہیں ہے۔

(۶) مقدمہ تفسیر میں حضرت باقرؑ سے منقول ہے کہ ہم اللہ کے اسماء حسنٰی ہیں۔ انسان کا کوئی عمل ہماری معرفت کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہے۔

(۷) نیز سلمان سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب ہم بروز احد حضرت حمزہؓ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو جبرئیل کا نزول ہوا اور کہا اے محمدؐ! خدا بعد درود و سلام کے فرماتا ہے کہ میں نے نماز فرض کی ہے لیکن بیمار[1] سے ساقط کی ہے اور میں نے روزہ واجب کیا ہے لیکن بیمار سے اور مسافر[2] سے معاف ہے۔ اسی طرح حج واجب کی ہے لیکن زاد و راحلہ نہ رکھنے والے پر معاف ہے زکوٰۃ واجب ہے لیکن جس کا نصاب پورا نہ ہو اس سے یہ فریضہ اٹھا لیا گیا ہے اور حُبِّ علیؑ ایسا فریضہ ہے کہ اس میں کسی کو کوئی رخصت نہیں ہے۔

(۸) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب انسان میدانِ محشر میں اللہ کی بارگاہ میں حساب کے لئے کھڑا ہوگا تو اس سے سب سے پہلے واجب نماز، زکوٰۃ مفروضہ، روزہ حج واجب اور ہماری ولایت کا سوال ہوگا اگر ہماری ولایت کا قائل ہوا تو نماز روزہ، زکوٰۃ و حج وغیرہ جملہ عبادات اس کی قبول ہوں گی اور ہماری ولا کا قائل نہ ہوا تو اس کے دیگر اعمال ہرگز قابلِ قبول قرار نہ دیئے جائیں گے۔

(۹) عیون اخبار الرضا سے جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ انسان سے پہلے پہل ہماری اُہلبیتؑ کی محبت کے متعلق سوال ہوگا

(۱۰) مجالس شیخ سے مروی ہے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا: اللہ کے سامنے انسان سے چار چیزوں کے متعلق سوال ہوگا (۱) عمر کے متعلق کہ اس کو کس کام میں فنا کیا؟ (۲) جسم کے متعلق کہ اس کو کہاں کہنہ کیا؟ (۳) مال کے متعلق کہ کہاں سے کمایا اور کہاں صرف کیا؟ (۴) ہم اہلِ بیت کی محبت کا سوال ہوگا۔ ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا۔ یا رسول اللہؐ آپ کی محبت کی علامت کیا ہے؟ آپ نے علیؑ کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اس کی محبت

(۱۱) امالی سید سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی نے آکر حضرت رسالتمآبؐ کی خدمت اقدس میں عرض کی یا رسول اللہؐ جنت کی بھی کوئی قیمت ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! اعرابی نے عرض کی کہ حضورؐ فرمائیے کیا قیمت ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اخلاص سے پڑھنا، اس نے عرض کی حضورؐ! اخلاص کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے [illegible] ایا عمل کرنا ساتھ اس چیز کے جس کے ساتھ میں مبعوث ہوا ہوں اور محبت اہلِ بیتؑ کے ساتھ

---

[1] نماز کے ساقط ہونے سے مراد اس کے بعض واجبات ساقط یعنی تکلیف حسبِ طاقت کردی۔ قیام سے عاجز تو قیام ساقط ہے پس بیٹھ کر پڑھے اور اگر عاجز ہے تو سو کر پڑھے یا کہ بیمار اتنا زیادہ ہو کہ ہوش و حواس نہ رہیں پس زمانِ بے ہوشی میں نماز اصلاً ساقط ہے۔ (منہ)

[2] لیکن بیماری یا سفر ختم ہو جانے کے بعد قضا واجب ہوتی ہے۔ مسئلہ کی تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے۔ (منہ)

اس نے عرض کی۔ حضور! محبت اہل بیت بھی اس کے حقوق میں سے ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس کے حقوق میں سے بڑی چیز تو اہل بیت ہی کی محبت ہے۔

(۱۲) حضرت صادق آل محمدؑ سے منقول ہے کہ ہر چیز کی بنیاد ہوا کرتی ہے اور اسلام کی بنیاد محبت اہل بیت ہے۔

(۱۳) حضرت باقر العلوم سے مروی ہے اسلام کی بنا کے پانچ ستون ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور محبت اہل بیت۔

(۱۴) عن معانی الاخبار عن ابن عباس عن النبی ایها الناس من اختار منکم علی علیؑ اماماً فقد اختار علی نبیاً ومن اختار علی نبیاً فقد اختار علی الله عز وجل ربّاً

معانی الاخبار سے منقول ہے کہ ابن عباس نے جناب رسالتمآبؐ سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا" لوگو! جس نے علیؑ کو چھوڑ کر کسی اور کو امام بنایا گویا اس نے میری نبوت سے اعراض کر کے کسی اور نبی کو مانا اور جس نے مجھے چھوڑ کر کسی اور نبی کو مانا گویا اس نے اللہ کو چھوڑ کر کسی اور رب کو مان لیا۔

مقصد روایت کا یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی امامت کا منکر ایسا ہے جیسے منکر نبوت و منکر توحید)

(۱۵) عن عقائد الصدوق قال النبیؐ من ظلم علیا مقعدی هذا بعد وفاتی فکانما جحد نبوتی ونبوة الانبیاء من قبلی ومن تولی ظالماً فهو ظالم

عقائد صدوق میں جناب رسالتمآبؐ سے مروی ہے کہ جو شخص علیؑ پر میری مسند کے معاملہ میں ظلم کرے (میرے بعد اس سے میرا منبر غصب کرے) لوگو! اس نے میری اور مجھ سے سابق انبیاء کی نبوت کا انکار کیا اور جو ظالم سے دوستی رکھتے وہ بھی ظالم ہے۔

(۱۶) قال: یا علی انت والائمة من ولدك حجج الله علی خلقه واعلامه فی بریته فمن انکر واحدا منهم فقد انکرنی ومن عصی واحدا منهم فقد عصانی ومن اطاعکم فقد اطاعنی الخبر

حضورؐ نے فرمایا۔ یا علی! تو اور تیری اولاد سے ہونے والے آئمہ، مخلوق پر اللہ کے خلیفے اور زمین پر اس کے اعلام ہیں۔ جس نے ان میں سے کسی ایک کا انکار کیا۔ اس نے گویا میرا انکار کیا اور جس نے ان میں سے کسی ایک کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی اور جس نے تمہاری اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔

(۱۷) قال یا علی ما من عبد لقی الله وهو جاحد ولایتك الا لقی الله بعبادة صنم او وثن

آپ نے فرمایا: اے علیؑ جو تیری ولایت کے انکار کے ساتھ محشور ہوگا وہ بت پرست اور صنم پرست محشور ہوگا۔

(۱۸) وفی تفسیر الامام انه لا یکون مسلماً من قال ان محمد رسول الله فاعترف به ولم یعترف علیا وصیه وخلیفته وخیراته ثم وقال ان تمام الاسلام باعتقاد ولایة علی علیه السلام ولا ینفع الاقرار بالنبوة

اور تفسیر امام حسن عسکریؑ میں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جناب محمد مصطفےٰ کی رسالت کے اقرار سے اور محمد رسول اللہ کہنے سے انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جبتک علیؑ کے وصی، خلیفہ اور خیر امت ہونے کا اعتراف نہ کرے اور فرمایا اسلام کی تکمیل حضرت علی علیہ السلام کے اقرار ولایت سے ہی ہے اور امامت علیؑ کے انکار کے

مع جحد امامة علی کما لا ینفع الاقرار بالتوحید من جحد النبوۃ۔

ساتھ نبوت کے اقرار کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس طرح کہ نبوت کے منکر توحید کے اقرار کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

بہرکیف توحید اور نبوت کے اقرار سے اسلام نہیں آسکتا جب تک حضرت امیرالمومنینؑ کی امامت و ولایت کا اقرار نہ ہو۔

(۱۹) عن امیرالمومنینؑ من لم یقر بولایتی لم ینفعہ الاقرار بنبوۃ محمد الا انھما مقرونان و ذٰلک ان النبی نبی مرسل وھو امام الخلق وعلی من بعدہ امام الخلق ووصی محمد فمن استکمل معرفتی فھو علی الدین القیم کما قال اللہ تعالٰی وَ ذَالِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃ ثم قال بعد کلام کنت انا ومحمد نورا واحدا من نور اللہ فامر اللہ ذالک النور ان ینشق فقال للنصف کن محمدا وقال للنصف کن علیا (ومنھا) قال رسول اللہ عَلِیٌّ مِنِّی وَاَنَا من علی۔ ولا یؤدی عنی الا علیؑ۔ ثم قال بعد کلام طویل یا سلمان ویا جندب۔ اَنَا مُحَمَّدٌ وَمُحَمَّدٌ اَنَا وَاَنَا مِنْ مُحَمَّدٍ وَمُحَمَّدٌ مِنِّی۔ ثُمَّ قال بعد کلام یا سلمان ویا جندب انا امیر کل مؤمن ومومنۃ ممن مضی وممن بقی وقال ایضا بعد کلام یا سلمان ویا جندب انا احیی وامیت باذن ربی وانا عالم بضمائر قلوبکم والائمۃ من اولادی یعلمون و یفعلون ھذا اذا احبوا وارادوا۔ لانا کلنا واحد

حضرت امیرالمومنین سے منقول ہے کہ جس نے میری ولایت کا اقرار نہ کیا اس کو جناب رسالتمآبؐ کی نبوت کا اقرار کوئی فائدہ نہ دے گا آگاہ ہو! یہ دونوں ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ کیونکہ نبی، رسول اور امام خلق ہے اور علی اس کے بعد، امام خلق اور وصی نبی ہے پس جو شخص پوری طرح میری معرفت حاصل کرے وہ سیدھے دین پر ہے جس طرح خدا فرماتا ہے وَ ذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃ۔ پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ میں اور حضرت محمد مصطفیٰ اللہ کے نور سے ایک ہی نور تھے تو پھر اللہ نے اس نور کو دو حصوں میں منقسم ہونے کا حکم دیا اور ایک حصہ سے حضرت محمد مصطفیٰ کو بنایا اور دوسرا حصہ علیؑ بنا (اسی حدیث میں ہے) کہ سرکار رسالتؐ نے فرمایا کہ علی مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ میری طرف سے علیؑ ہی پہنچا سکتا ہے۔ پھر کلام طویل کے بعد فرمایا۔ اے سلمان اور اے جندب! میں محمدؐ ہوں اور محمدؐ میں ہوں، میں محمدؐ سے اور محمدؐ مجھ سے ہے پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔ اے سلمان اور اے جندب! میں گزشتہ اور آئندہ کے ہر مومن مرد و عورت کا امیر ہوں۔ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پھر آپ نے فرمایا اے سلمان اور اے جندب! کہ اللہ کے اذن سے میں مارتا[1] اور جلاتا ہوں میں تمہاری دلوں کی پوشیدگیوں کو جانتا ہوں اور میری اولاد سے آئمہ جب چاہیں تو یہ باتیں جان اور کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم سب کے سب ایک ہیں۔ ہمارا پہلا محمدؐ اور آخری محمدؐ اور درمیان میں محمدؐ

[1] انسان کی حقیقی زندگی ایمان اور حقیقی موت کفر ہے اور حضرت علیؑ کی محبت ایمان اور ان کا بغض کفر ہے۔ پس حضرت علیؑ انسان کے لئے حقیقی موت و حیات کا موجب ہیں (منہ)

اولنا محمد و آخرنا محمد و اوسطنا محمد وكلنا محمد فلا تفرقوا بيننا و نحن اذا شئنا شاء الله و اذا كرهنا كره الله الويل كل الويل لمن انكر فضلنا وخصوصيتنا وما اعطانا الله ربنا ان من انكر شيئاً مما اعطانا الله فقد انكر قدرة الله ومشيته۔

اور ہم سب محمدؐ ہیں۔ پس ہمارے درمیان تفریق نہ ڈالو اور جب ہم چاہتے ہیں تو اللہ بھی چاہتا ہے اور جب ہم ایک چیز کو نہ چاہیں تو اسے اللہ بھی نہیں چاہتا ---------- مکمل ویل ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی عطاکردہ ہماری فضیلت اور خصوصیت کا انکار کریں، تحقیق جن لوگوں نے ہماری کسی خدائی عطا کردہ فضیلت کا انکار کیا گویا اس نے اللہ کی قدرت و مشیت کا انکار کیا۔

(۲۰) مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً

جو شخص امام زمان کی معرفت حاصل کئے بغیر مر جائے پس اس کی موت جاہلیت (کفر) کی موت ہے (حدیث مشہور بین الفریقین ہے)

(۲۱) عن الباقرؑ حبنا ایمان وبغضنا کفر ونفاق

حضرت امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ ہماری محبت ایمان اور ہمارا بغض کفر و نفاق ہے

(۲۲) جامع الاخبار (باب النوادر) مر علی فی مسجد الکوفہ وقنبر معہ فرأی رجلا قائما یصلی فقال یا امیرالمومنین ما رأیت رجلا احسن صلوٰۃ من ھذا فقال امیرالمومنین یا قنبر فواللہ لرجل علی یقین من ولایتنا اھل البیت خیر من عبادۃ الف سنۃ ولو ان عبدا عبد اللہ الف سنۃ لا یقبل اللہ منہ حتی یعرف ولایتنا ولو ان عبداً عبد اللہ الف سنۃ وجاء بعمل اثنین و سبعین نبیا ما یقبل اللہ منہ حتی یعرف ولایتنا اھل البیت والا اکبہ اللہ علی منخریہ فی نار جھنم

کتاب جامع الاخبار کے نوادر میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام قنبر کو ساتھ لئے مسجد کوفہ عبور فرما رہے تھے کہ قنبر نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا پس عرض کی مولا! اس شخص سے بہتر نماز پڑھتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا تو آپ نے فرمایا۔ اے قنبر۔ خدا کی قسم۔ ہم اہلبیت کی ولایت پر یقین رکھنے والا شخص ہزار برس کی عبادت سے بہتر ہے اگر کوئی انسان ہزار برس خدا کی عبادت کرے جب تک ہماری ولایت کی معرفت نہ رکھے گا خدا اس کی کوئی عبادت قبول نہ فرمائے گا اگر کوئی انسان ہزار سال اللہ کی عبادت کرے اور بہتر نبیوں کے برابر اعمال کر کے لائے۔ خدا قبول نہ فرمائے گا جبتک کہ ہماری اہلبیت کی ولایت کا اقرار نہ کرے۔ اگر ایسا نہ ہو) تو خدا اس کو اُلٹے منہ جہنم میں ڈالے گا۔

بہرکیف اس مضمون کی احادیث کتب امامیہ میں تواتر سے منقول ہیں۔ اس مقام پر جس قدر ذکر کی جاچکی ہیں جلا ایمانی کے لئے کافی ہیں۔ اختصار کے پیش نظر بعض کا صرف ترجمہ ہی ذکر کر دیا ہے۔ اور ان میں سے اکثر مقدمہ تفسیر سے

---

[1] ص ۱۳۶ پر اس حدیث کو ملاحظہ فرمائیے۔ (منہ)

منقول ہیں۔ لہٰذا اختصاراً حوالہ کتاب کو عموماً ترک کر دیا ہے۔ (مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار)

اس قسم کی جملہ احادیث کا خلاصہ یہی ہے کہ چونکہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد قرآن مجید کے حقیقی محافظ و مبلّغ اور اسلام کے مروّج اور اس کی تعلیمات کے مدرّس آل محمدؐ ہی ہیں۔ لہٰذا ان کی محبت واجب ہے اور ان کی ولایت و امامت کے اقرار و معرفت کے بغیر کوئی عمل صالح، صالح نہیں کہا جا سکتا لہٰذا قابلِ قبول بھی نہیں ہو سکتا جس طرح کہ توحید کے بعد نبوت کے انکار سے کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوا کرتا۔

نکتہ: امامت و مودّت میں تلازم

ان احادیث کی رُو سے معلوم ہُوا کہ امام خلق آل محمدؐ سے غیر نہیں اور آلِ محمدؐ امامت سے جُدا نہیں۔

بعض احادیث میں ہے کہ جو شخص معرفتِ امام کے بغیر مر جائے اس کی معرفت کفر و جہالت کی موت ہے۔

ایک طرف ہے (حبِ اہلبیت ہے تو ایمان ہے) دوسری طرف ہے (معرفت امام ہے تو ایمان ہے) نتیجہ نکلا کہ جس کو حبِ اہل بیت حاصل ہے اسی کو ہی معرفت امام حاصل ہے چونکہ دونوں حدیثیں فریقین سے مروی ہیں تو اب ذرا ان دونو کا تجزیہ کر کے دیکھیں۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ امام اہلبیت سے نہیں (غیر از اہل بیت کو عہدۂ امامت دیا جائے) تو قطعاً دونوں حدیثیں صادق نہیں آ سکتیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اہلِ بیت رکھتا ہو اور اس امام کا منکر ہو جو غیر از اہلِ بیت ہے) تو حبِ اہلِ بیت والی حدیث کی رُو سے وہ مومن کامل الایمان ہے اور اس کی موت ایمان کی موت ہے لیکن معرفت امام والی حدیث کی رُو سے وُہ غیر مومن ہے اور اس کی موت جہالت و کفر کی موت ہے

اسی طرح فرض کرو ایک شخص اہلِ بیت سے بغض رکھتا ہے اور اس امام کی امامت کا قائل ہے جو غیر اہلبیت سے ہے تو حبِ علیؑ والی حدیث کی رُو سے وہ کافر و منافق ہے اور معرفت والی حدیث کی رُو سے وُہ مومن ہے۔

پس اگر امامت کو اہل بیت سے جُدا مانا جائے تو جناب رسالتمآبؐ کی ہر دو حدیثوں سے صرف ایک سچی ہو گی اور دوسری معاذ اللہ جھوٹی ہو گی اور جناب رسالتمآبؐ کی زبان وحی ترجمان کی کوئی فرمائش غلط نہیں ہو سکتی تو ماننا پڑے گا کہ حدیثیں دونوں صحیح اور صادق ہیں اور جن کی محبت واجب ہے وہی امامت کے اہل ہیں اور جو عہدہ امامت کے سزاوار ہیں۔ ان ہی کی محبت واجب ہے۔

جس طرح محبت و معرفت ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں کیونکہ محبت بغیر معرفت کے اور معرفت بغیر محبت کے محال ہے۔ اس طرح امامت بغیر اہلِ بیت کے اور اہلِ بیت بلا امامت کا قول لغو اور بے سود ہے۔ پس جناب رسالتمآبؐ کی دونو فرمائشیں دُرست ہیں اور امامت صرف اہل بیت ہی میں منحصر ہے۔

عدل و احباط و شفاعت

قال اللہ تعالیٰ فی کتابہٖ العزیز — خدا قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔

مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۔ (جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا (اس کی جزا پائیگا)

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ (جو شخص ذرہ بھر برائی کرے گا اسے دیکھے گا (اس کی سزا پائے گا)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا (جو شخص نیکی کرے اس کے لئے اس کا دس گنا ثواب ہے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَھَا (اور جو شخص برائی کرے پس اس کو اس کا اس کے مثل ہی دیا جائے گا۔

وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (احسان کا بدلہ احسان ہی ہے۔

بہرکیف قرآن مجید میں اس مضمون کی آیات بہت زیادہ ہیں۔ تمام کو یکجا کرنے کی خاص ضرورت نہیں۔

کتاب جامع الاخبار میں عدل کے بیان میں عباد بن صہیب سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ابوحنیفہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ہمکلام ہوا۔ امام کا عالم شباب تھا۔ ابوحنیفہ نے امام کو یوں خطاب کیا۔ اے جوان! بتا گناہ کس سے سرزد ہوتے ہیں؟ آپ نے جواباً فرمایا "اے بڈھے! تین صورتوں سے خالی نہیں یا تو صرف اللہ کی طرف سے ہیں۔ یا صرف بندوں کی جانب سے ہیں۔ یا اللہ و بندے دونوں کی شرکت سے ہیں۔

(۱) اگر پہلی صورت ہو یعنی خدا سے ہی صادر ہو تو بندہ بے قصور ہے۔ لہٰذا اس کو سزا نہیں ملنی چاہیئے۔

(۲) اگر تیسری صورت کہ دونوں فعل گناہ میں شریک ہوں تو دونوں برابر کے مجرم ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہ صاحبِ قوت و طاقت ہے اور یہ کمزور ہے، پس سزا صرف کمزور پر کیوں رکھی گئی؟ حالانکہ طاقتور کے لئے کمزور پر ظلم کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے گناہ کرنے میں برابر کا شریک اور سزا صرف کمزور پر؟

(۳) باقی صرف ایک صورت رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ بندہ خود مختار ہے اور نیکی و بدی کی جزا و سزا کا بھی خود مستحق و سزاوار ہے

پس ابوحنیفہ اٹھا اور امام عالی مقام کی پیشانی اقدس پر بوسہ دے کر کہنے لگا کہ واقعی آپ وارثِ رسولؐ ہیں۔

تمام علمائے امامیہ کا اتفاق ہے کہ خداوند کریم عادل ہے اور قطعاً اس سے ظلم صادر نہیں ہو سکتا کیونکہ ظلم فی نفسہٖ قبیح اور عیب ہے اور خدا جملہ عیوب و قباحتوں سے پاک و منزہ ہے نیز انسان سلیم الطبع اگر اپنے وجدان کی طرف دھیان کرے تو اس کو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ وہ جو کام کرتا ہے اپنے ذاتی اختیار سے ہی کرتا ہے اس

میں اس کو کوئی چیز مجبور نہیں کر رہی ہوتی نہ نیکی میں نہ برائی میں۔ اگر خدا کسی آدمی کو نیکی پہ اور کسی کو برائی پہ مجبور کر دے اور پھر نیک کو انعام اور بُرے کو سزا کا سزاوار قرار دے تو اس قسم کا غیر منصفانہ رویّہ تو عام انسانوں کے لئے بھی زیبا نہیں چہ جائیکہ خالقِ کائنات یہ رویّہ اختیار کرے۔

ہاں خداوند کریم نے انسان کو خیر و شر کی طاقت عطا کر دی ہے اس کے بعد انسان کو اپنے اختیار سے سب کچھ کرنا ہے خواہ اپنی طاقت کو نیکی کے کاموں میں استعمال کرے یا بُرائی کے کاموں میں استعمال کرے۔ اس نے اپنے دین میں کوئی جبر و اکراہ روا نہیں رکھا۔ مثال کے طور پر اگر ایک شریف کسی فقیر مسکین کو کچھ روپے بطور اعانت عطا کر دے تاکہ وہ بیوی بچوں کے اخراجات و مصارف میں صرف کر کے آسودہ حال ہو جائے۔ فقیر کے پاس پیسہ آجانے کے بعد اس کو اختیار ہے کہ وہ پیسہ اپنے خانگی ضروریات پر خرچ کر کے اپنے فرائض منصبیہ سے عہدہ برآ ہو جائے یا اِدھر سے پیسہ وصول کر کے اُدھر فضول خرچ کر کے ویسے کا ویسا گھر آجائے۔ اب یہ شخص ہر دو صورتوں میں ہرگز مجبور نہیں ہے اگر بالفرض یہ شخص وہی پیسہ برائی پر خرچ کر دے تو اس پیسہ دینے والے شریف انسان کا قصور ہرگز قرار نہ دیا جائے گا اور یہ کہنا بالکل بےجا ہوگا کہ اس کے افعالِ بد کا موجب وہ شریف آدمی ہے اگر اس نے یہ امداد نہ کی ہوتی تو اس سے یہ فعل سرزد نہ ہوتا۔

جو لوگ خیر و شر کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ عدلِ خداوندی کے قائل نہیں وہ قرآن مجید کی ان آیات سے لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن میں ہدایت و ضلالت کی نسبت خدا کی طرف ہے یا ختم و طبع کو خدا نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ان چیزوں کے مفصّل بیانات تو اپنے مناسب وقت پر آئیں گے۔ لیکن اس مقام پر بھی اس شُبہ کا ازالہ مختصر طور پر کر دینا ضروری ہے خداوند عالم جو محسن و خالقِ کائنات ہے اس نے اپنے فضلِ عمیم سے اشیاء کو خلق فرما کر ان میں علّیت و معلولیت اور سببیت اور مسببیّت تفویض فرما دی۔ انسان کو اعضاء عطا فرمائے اور ان کو افعال کا سبب قرار دیا۔ پاؤں کو چلنے کی، ہاتھوں کو پکڑنے کی، آنکھوں کو دیکھنے کی۔ وعلیٰ ہذا القیاس طاقتیں عطا فرمائیں اور دل عطا فرمایا۔ جس کو اچھائی یا برائی کی طرف میلان کی قوت عطا فرمائی تاکہ اس کے ایک طرف میلان کے بعد قوتِ ارادیہ سے بذریعہ حرکاتِ اعضاء کے افعال کا ظہور ہو۔ اب اعضاء افعالِ بد کی طرف بھی چل سکتے ہیں اور افعالِ حسنہ کی طرف بھی بڑھ سکتے ہیں لیکن ہیں تابع ارادہ کے اور ارادہ بھی ہر دو طرف ہو سکتا ہے لیکن نفع و نقصان کے تصوّر کے تابع ہے اور تصوّر میں نفع و نقصان کا امتیاز اور ان کا صحیح فیصلہ قوتِ عاقلہ پر موقوف ہے اگر قوتِ عاقلہ نہ عطا کرتا تو نفع و نقصان کا صحیح فیصلہ نہ ہو سکتا۔ لہٰذا میلانِ قلب اور اس کی قوتِ ارادیہ اور افعالِ صادرہ سب کے سب قابلِ بازپرس نہ رہتے اور جزا و سزا کا قصّہ سرے سے ساقط ہو جاتا اور اگر قوتوں کو صرف ایک ہی رُخ عطا فرماتا اور دوسری طرف ان کا قطعاً رُخ ہی نہ ہوتا تو پھر بھی تکلیف ساقط تھی کیونکہ انسان اس صورت میں اسی ایک رُخ پر چلنے کے لئے مجبور محض ہو جاتا۔ پس انسان کو اعضائے سلیمہ، قوتِ عاقلہ اور قوتِ ارادیہ کا عطا فرمانا ذاتِ احدیت کا عین فضل اور کمال

احسان ہے لیکن خدا کے بذریعہ انبیاء وکتب سماویہ ،عقل کو صحیح و فاسد ، جائز و ناجائز کی طرف متوجہ کرنے کے بعد اپنے اختیار اور قوتِ ارادیہ کو صحیح اور جائز کی طرف موڑنا انسان کا فرض عین ہے ۔

اب قرآن مجید میں ہدایت وضلالت یا ختم وطبع کا خدا کی طرف منسوب ہونا ، اس کا یہی مطلب ہے کہ اس نے تمام طاقتیں عطا کرنے کے بعد اس کو اختیار دے دیا ہے اور اس نے بذریعہ انبیاء و رسل خیر و شر کے رستے واضح فرما دیے ہیں ۔ کوئی خیر کے رستہ پر چلے تو اپنے اختیار سے اور شر کا رستہ پسند کرے تو اپنی مرضی سے فرماتا ہے اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۔ قرآن میں ہر دو کا اللہ کی طرف منسوب ہونا ، اس لئے ہے کہ وہ ان تمام قوتوں اور قوتِ ارادیہ کا خالق ہے اگر اس نے یہ قوتیں نہ دی ہوتیں تو انسان سے یہ اعمال کیونکر سرزد ہوتے ؟ لیکن اعتراض تو جب وارد ہوتا کہ اس نے صحیح راہنمائی نہ فرمائی ہوتی ۔ پس خدا کی طرف نسبت اسی طرح ہے جس طرح سبب کی طرف نسبت دی جاتی ہے جیسا کہ مجازاً مثال گذشتہ میں فقیر کے افعال ناشائستہ کو پیسہ دینے والے شریف انسان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے اس سے یہ کام کروایا ہے ۔ حالانکہ وہ صرف اس کا محسن ہی ہے اور اس کے افعال ناشائستہ کا قطعاً ذمہ دار نہیں ۔ پس خداوند کریم محسن ہے اور انسان کے افعال کی ذمہ داری قطعاً اس پر عائد نہیں ہوتی ۔ اور انسان اپنے اختیار سے عمل کرنے کے بعد سزا و جزا کا مستحق بھی ہے اور یہی مقتضائے عدل ہے ۔

انسان کے اوپر جس طرح خالق کے احسانِ عمیم اور فضل جسیم کا شکر ادا کرنا واجب ہے اسی طرح اس کے فرستادہ پیغمبروں کے حقوق سے عہدہ برآ ہونا بھی انسان پر واجب ولازم ہے ۔ جنہوں نے ہماری صحیح رہنمائی فرمائی اور مفید اصولوں سے آگاہ فرمایا ۔ پس جس طرح خدا کا انکار اور اس کی نافرمانی موجب عتاب وعقاب ہے اسی طرح اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کا انکار اور ان کے حکم سے سرتابی ، درحقیقت خدا کے اوامر و نواہی کی توہین اور اس کی اس نعمت عظمیٰ کی تحقیر کے مترادف ہونے کی حیثیت سے مستوجب عذاب ہے ۔

اب اگر کوئی انسان اپنے مقام پر خلق خدا کا خادم ہو اور کسی کو بلاوجہ تکلیف نہ پہنچاتا ہو اور اس کے تمام اعضاء عقل کے کنٹرول میں ہوں لیکن معرفت خدا نہ رکھتا ہو تو اس کے تمام کارہائے حسنہ جزائے اخروی اور نعماتِ ابدیہ کے مستحق قرار نہیں دیئے جا سکتے ۔ بلکہ اخروی لحاظ سے یہ سب اس وقت ثمر آور ہوں گے ۔ جب اللہ کی معرفت بھی ہوگی ۔ نیز معرفتِ خدا کے بعد بھی اس کے اعمال موجب جزا تب ہوں گے جب اس کے تعلیم کردہ اصولوں کے ماتحت ادا کیے جائیں ورنہ اپنی ایجاد کردہ عبادت کا کوئی فائدہ نہیں ۔

چنانچہ تفسیر برہان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے ۔ حضرت آدمؑ کے سجدہ سے انکار کرنے کے بعد ابلیس نے کہا تھا کہ اے میرے اللہ ! مجھے حضرت آدمؑ کے سجدہ سے معاف کر ۔ ویسے میں تیری اس قدر عبادت کروں گا جو نہ کسی ملک مقرب نے کی ہوگی اور نہ نبی مرسل اتنی عبادت کرے گا ۔ پس ارشاد قدرت ہوا مجھے تیری

عبادت کی ضرورت نہیں۔ بیں وہ عبادت چاہتا ہوں جو میری مرضی کے مطابق ہو اور مرضئ خدا کے مطابق صرف وہی عبادت ہوسکتی ہے جو اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی تعلیمات کے مطابق ہو۔ پس معلوم ہوا کہ خدا کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت سے جُدا نہیں اور رسولؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت سے علیحدہ نہیں۔

پس جسطرح خدا کا منکر و نافرمان سزاوارِ عذاب کا سزاوار ہے اسی طرح رسولؐ کا منکر و نافرمان بھی عذاب کا مستحق ہے تو رسولؐ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد جس کو وہ اپنا جانشین مقرر کر کے جائیں چونکہ وہ بھی رسولؐ کی قائمقامی میں رسولؐ کی طرح تعلیماتِ الٰہیہ کا مبلغ و مدرس ہے لہٰذا اس کی اطاعت مثل خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے فرض ہے اور اس کی نافرمانی مثل خُدا اور رسولؐ کی نافرمانی کے موجب عتاب و عقاب ہے اور مقبولیت اعمال کے فصل میں متعدد احادیث اسی موضوع کی ذکر کی جاچکی ہیں کہ خلفائے رسولؐ میں سے کسی ایک کا منکر کافر ہے اور جس نے ان میں سے کسی ایک کا انکار کیا۔ گویا اس نے سب کا انکار کیا اور ان کا منکر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کے منکر کی مثل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کا منکر گویا خدا کا منکر ہے تو جس طرح نبی کا نافرمان خدا کا نافرمان شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے برحق جانشین کا انکار و نافرمانی چونکہ احکام نبویہ کی توہین کے مترادف ہے۔ لہٰذا خدا اور رسولؐ کا انکار و نافرمانی شمار ہوتی ہے۔

پس معلوم ہوا ... کہ انسان اپنی مرضی کے مطابق خواہ کتنے ہی اعمال صالحہ کرتا رہے مقبول بارگاہِ احدیت صرف وہی اعمال ہوں گے جو خدا کے حکم کے ماتحت رسولؐ اور خلفائے رسولؐ کی رہبری سے ادا ہوں تو جو شخص خلفائے رسولؐ کا منکر ہو اس کے تمام اعمال نہ خدا اور رسولؐ کی مرضی کے مطابق ہو سکتے ہیں اور نہ مرتبۂ مقبولیت کو پہنچ سکتے ہیں اسی بناء پر مقبولیت اعمال کی گزشتہ فصل میں متعدد احادیث ذکر کی جاچکی ہیں کہ آلِ محمدؐ کی اطاعت و محبت کے بغیر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ تمام عبادات رائگاں اور ناقابل قبول ہیں اور یہ چیز خدا کے عدل کے منافی نہیں بلکہ عین عدل ہے۔

اس کی واضح مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص ایک ملک میں نہایت نیک اور وطن پرست ہو۔ حکومت کے سرکاری ٹیکس وغیرہ بلا کم و کاست ادا کرتا ہو۔ چور، ڈاکو بھی نہ ہو۔ اراکین حکومت کے لئے کسی اندرونی نظامی معاملہ میں باعثِ تکلیف بھی نہ ہو۔ لیکن بایں ہمہ حکومت کو حکومت نہ سمجھتا ہو۔ ان کے اعلیٰ آفیسران کو وقار کی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو بلکہ حکومت کے احکام پر نکتہ چینی اور اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے سے گریز نہ کرتا ہو تو آپ اندازہ فرمائیں کہ اس کے جملہ افعال و کردار کی حکومت کی نگاہوں میں کیا وقعت ہوگی؟ ایسا شخص حکومت کی نظروں میں چوروں، ڈاکوؤں، غنڈوں اور بدمعاشوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔ اور نظامی معاملات میں باعثِ تکلیف ہونیوالے مجرموں سے اس کی سزا سنگین تر ہوگی کیونکہ وہ لوگ جو کہ حکومت کو حکومت ماننے کے بعد نظامی معاملات میں جرم کا ارتکاب

کرتے ہیں اُن کے جُرم کا اثر نہایت محدود ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ محدود سزا کے سزاوار گردانے جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ باقی ہر طرح نیک ہوں اور قوم و وطن کے خیر خواہ بھی ہوں۔ لیکن حکومت کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ حکومت کے ضابطۂ قانون پر عمل کرتے ہوں لیکن جن کو حکومت کے ضابطۂ قانون کے نفاذ کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔ ان سے دشمنی رکھتے ہوں ان کا حلقۂ تخریب وسیع تر ہوگا۔ گویا ایسے لوگ ایک وقت میں حکومت کا تختہ اُلٹنے کے منتظر ہیں۔ پس ایسے لوگ گرفتاری اور ثبوت جُرم کے بعد کسی مراعات کے مستحق نہ ہوں گے۔ ان کا کوئی عمل خیر، عمل خیر نہ شمار ہوگا۔ اور ان کے ضابطۂ قانون کا احترام کرنا بے سود محض قرار دیا جائے گا۔ پس صرف یہ شخص سزا ہی سزا کا بلکہ ڈبل سزا کا مستوجب ہوگا۔ تاکہ اس کی عبرتناک سزا سے دوسروں کو نصیحت حاصل ہو۔ اب یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کی باقی خوبیاں کیوں نظر انداز کی گئیں؟ اس کا احترامِ قانون کیوں موجب انعام نہ ہُوا۔ بلکہ صاحب ہوش اس کی فرد جُرم پر نگاہ کرنے کے بعد یہی کہے گا کہ اس کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیئے تھی اور یہی عین دانائی اور مقتضائے عدل ہے۔

پس بعینہٖ اسی طرح ایک انسان کتنا ہی صالح ہو۔ عبادت گذار ہو اور حکومتِ الٰہیہ کے ضابطۂ قانون (قرآن مجید) کا احترام بھی کرتا ہو۔ اس کے قوانین کی خلاف ورزی حسب امکان نہ کرتا ہو اور بایں ہمہ نظامِ حکومتِ الٰہیہ کے حفظ و ضبط کے لئے جو خُدا نے فرمانروا معین فرمائے اور جناب رسالتمآبؐ نے ضابطۂ قوانین اسلامیہ (قرآن مجید) کی حفاظت و نفاذ و ترویج کے لئے جن پاک و معصوم ہستیوں کو بذریعہ حدیث متواتر (ثقلین) و دیگر فرامینِ نبویہ امّت کے لئے تاقیامت نامزد فرمایا اور بذریعہ حدیثِ غدیر متواتر بازو پکڑ کر لاکھوں کے اجتماع عظیم میں بلند کر کے دکھایا۔ اگر ان کو حکومتِ الٰہیہ کا صحیح فرمانروا نہ سمجھے اور ان کی حکومت کو قطعاً تسلیم نہ کرے تو وہ دیگر اخلاقی، نجی معاملات کے مجرمین کی بہ نسبت سنگین ترین مجرم ہے اور وہ بعد از گرفتاری و پیشی عدالتِ عالیہ الٰہیہ و ثبوتِ جُرم، کسی اپنی نیکی کو بروئے کار لانے کا سزاوار نہ ہوگا اور نہ اس کی کوئی نیکی نیکی قرار دی جائے گی اور نہ اس کا احترامِ قرآن موجب اجر قرار پائے گا۔ بلکہ وہ صرف سزا کا اور ڈبل سزا کا مستحق ہوگا اور اس کی سزا تمام اہلِ محشر کے لئے باعثِ عبرت ہوگی اور ہر اہلِ دل سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کے مجرم کے لئے مراعات کی امید رکھنا بھی خلافِ عقل ہے اور ایسے شخص کی دوسری عام نیکیوں کو موجب اجر قرار دینا قطعاً مبنی بر انصاف نہیں پس اس کی نیکیوں کا رائیگان قرار دینا اور اس کو سخت ترین سزا دینا عین عدل ہے اور ایسے مجرم کے جُرم کو قابل معافی سمجھنا ظلم عظیم ہے۔

اسی بناء پر حضرت رسالتمآبؐ نے جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کو قَسِیْمُ النَّارِ وَالْجَنَّۃ فرمایا۔

حضرت امام شافعی کی طرف یہ اشعار منسوب ہیں۔

عَلِیٌّ حُبُّہٗ جُنَّۃ ؛ امامُ الْاِنسِ وَالْجِنَّۃ — علیؑ کی محبت دوزخ کی ڈھال ہے (علیؑ جنوں اور انسانوں کا امام ہے)

وَصِیُّ الْمُصطَفٰی حَقًّا ؛ قَسِیمُ النَّارِ وَالْجَنَّۃ — محمد مصطفٰےؐ کا برحق وصی ہے۔ جنت و نار کا تقسیم کرنے والا ہے۔

اور صواعق محرقہ اور دیگر کتب عامہ و خاصہ سے منقول ہے کہ حضرت رسالتمآب نے فرمایا کہ کوئی شخص صراط سے نہ گزرنے پائے گا۔ جب تک علیؑ اس کو گذرنے کا اجازت نامہ نہ لکھ دیں۔

سابقہ مثال سے یہ واضح کر دیا جاچکا ہے کہ معصیت دو قسموں پر ہے ایک اصولی اور دوسری فروعی۔ اصل حکومت کی مخالفت اصولی معصیت ہے اور حکومت کی تسلیم کے بعد انتظامی معاملات میں کوتاہی فرعی معصیت ہے دوسری نوع معصیت کی سزا بہ نسبت پہلی نوع کے خفیف ہے۔ پہلی نوع کے مخالف کو معاف کرنا اور اس کو سزا نہ دینا خلافِ عدل ہے۔ جبتک کہ وہ سابقہ نظریۂ فاسدہ سے تائب ہوکر اپنی وفاداری کا عہد نہ کرے۔ لیکن دوسری نوع کے مخالف کو بعض مصالح کی بناء پر معاف کر دینا بعید از عقل نہیں۔

توحید، نبوّت، امامت چونکہ اصولِ اسلام میں سے ہیں۔ لہٰذا ان کی مخالفت و انکار اصولی معصیت میں داخل ہے اور ان تین اصولوں کے اقرار کے بعد اسلام کے فرائض و واجبات مثلاً نماز و روزہ وغیرہ میں کوتاہی فروعی معصیت ہے پس پہلی نوع قابلِ عفو قطعاً نہیں جب تک کہ تائب نہ ہو اور خاتمہ ایمان پر نہ ہو۔ لیکن اگر اصول کا انکاری نہ ہو تو فروعی معصیت اگر خدا چاہے تو معاف کرسکتا ہے۔

پس اطاعت بھی ایک اصولی ہے اور دوسری فروعی۔ اگر انسان اصولی طور پر اطاعت گزار ہو یعنی توحید و نبوّت و امامت کا قائل ہو لیکن فروعی اطاعت میں کچھ کوتاہی کرتا ہو تو اس کا جرم قابلِ عفو ہے وہ دائمی عذاب کا سزاوار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ فروعی اطاعت کو ترک کرنے سے اس کی اصولی اطاعت کو خالی از جزا و ثواب نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اصولی اطاعت نہ ہوتے ہوئے فروعی ہزارہا اطاعتیں کرتا پھرے ان میں سے ایک بھی قابلِ قبول نہیں اور ایسا شخص آخرت میں ابدی سزا کا مستحق ہوگا۔

کیونکہ فرع (شاخ) کے کٹنے سے اصل خشک نہیں ہوجایا کرتی لیکن اگر اصل کٹ جائے یا خشک ہوجائے تو فروعات کا خشک اور ضائع ہوجانا یقینی ہے چونکہ اقرار امامت جس کو اقرارِ نبوّت و توحید لازم ہے اصل ہے تمام اعمالِ خیر کی اور انکار امامت جس کو انکار نبوّت و توحید لازم ہے اصل ہے تمام اعمال بد کی۔ پس جس کے پاس پہلی اصل ہو اس کے لئے اس کے فروعات کا کٹ جانا یا خشک[1] ہوجانا عذابِ دائمی کا موجب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عذابِ دائمی تو واجب ہوگا کہ اس کے نامۂ اعمال میں نیکی کوئی نہ ہو۔ اس کے نامۂ اعمال میں ولایت و نبوت و توحید کی معرفت و اقرار کی ایسی نیکی موجود ہے جس کو نہ کوئی [illegible] بداعمالی فاسد کرسکتی ہے اور نہ اس تک ریاکاری یا ظاہرداری یا دیگر اغراضِ فاسدہ کی رسائی ہے کیونکہ اس کا تعلق محض باطن اعتقاد سے ہی ہے۔ پس نتیجہ یہی ہوگا کہ فروعی معصیت پر اس کو محدود

---

[1] بلا لحاظ شرائط اس کا بجالانا۔

سزادیکر آخر جنت میں اس کو اصولی نیکی کی بناء پہ بھیج دیا جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ جنت ہی میں رہے گا۔

اور جس شخص کے پاس دوسری اصل ہو یعنی انکار امامت تو اب فروع اس کے پاس یا صالح ہونگی یا غیر صالح؟ اگر صالح ہوں تو بے کار محض ہیں کیونکہ اصل کے بغیر فرع بیکار ہوتی ہے اور حکومت کے دشمن کے لئے بزدوی نیکیاں قابلِ جزا نہیں ہوتیں اور اگر اس کے پاس فروع بھی بد ہوں تو دگنا مجرم ہوگا۔ ہر دو صورت میں اس کے پاس ایسی چیز کوئی بھی نہیں جو اس کو عذابِ دائمی سے نجات دلا سکے۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ صرف اصولی معصیت کے ساتھ ہمیشگی عذاب ہوگا لیکن فروعی معصیت کی سزا کا بوجھ نہ ہوگا اور فروعی معصیت کی موجودگی میں دگنا عذاب ہوگا۔ حاتم اور نوشیرواں سے تخفیف عذاب کا یہی معنی ہے۔

پس ان احادیث کا مطلب صاف واضح ہوگیا کہ آلِ محمدؐ کے دشمن کی کوئی نیکی قابلِ قبول نہیں[1] اور اس کے لئے عذاب دائمی ہے اور اس کی موت کفر کی موت ہے۔ مزید وضاحت کے لئے چند احادیث اور نقل کرتا ہوں چنانچہ علامہ حلی اعلی اللہ مقامہٗ نے بعض کتب عامہ سے نقل فرمایا کہ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا۔

اِن اللہ جعل لاخی علی فضائل لاتحصی کثرۃ فمن ذکر فضیلہ من فضائلہ مقرابہا غفر اللہ لہٗ ما تقدم من ذنبہ وما تاخر ومن کتب فضیلۃ من فضائلہ لم تزل الملائکۃ تستغفر لہٗ ما بقی لتلک الکتابۃ رسم ومن استمع فضیلۃ من فضائلہ غفر اللہ لہ الذنوب التی اکتسبہا بالاستماع ومن نظر الی کتاب من فضائلہ غفر اللہ لہ الذنوب التی اکتسبہا بالنظر ثم قال النظر الی علی عبادۃ و ذکرہ عبادۃ ولا یقبل اللہ ایمان عبد الابولایتہ والبراۃ من اعدائہ

تحقیق اللہ نے میرے بھائی علیؑ کو وہ فضائل عطا فرمائے جو شمار سے باہر ہیں۔ جو شخص علیؑ کے فضائل میں سے کسی فضیلت کا ذکر اس کا اقرار کرتے ہوئے کرے تو اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہوجائیں گے اور جو شخص اس کے فضائل میں سے ایک فضیلت لکھے تو جب تک اس کی کتابت کے نشان باقی رہیں گے ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے رہیں گے اور جو شخص اس کے فضائل میں سے کوئی فضیلت سُنے تو اس کے وہ گناہ خدا معاف کردے گا جو اس نے کانوں سے کمائے ہوں گے اور جو شخص علیؑ کے لکھے ہوئے فضائل پہ نگاہ کرے اس کے خدا وہ گناہ معاف کرے گا جو اس نے آنکھوں سے کمائے ہوں گے پھر فرمایا کہ علیؑ کو دیکھنا عبادت ہے اس کا ذکر عبادت ہے اور علیؑ کی ولایت اور اس کے دشمنوں سے بیزاری کے بغیر خدا کسی عبد کا ایمان قبول ہی نہیں کرتا۔

نیز علامہ نے بطریق جمہور ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ آدمؑ کی خلقت اور نفخ روح کے بعد ذاتِ احدیت

---

[1] اور یہ بھی ثابت کردیا گیا ہے کہ یہ چیز عین عدل ہے بلکہ اس کا خلاف خلافِ عدل ہے چنانچہ گزشتہ مثال حکومت کی تطبیق سے صاف طور پر واضح ہے ۱۲ منہ

کا حضرت آدمؑ سے یوں ارشاد ہوا۔

وعزتی وجلالی لولا عبدان اریدا خلقهما فی دار الدنیا ما خلقتك قال الٰهی فیکونان منی؟ قال نعم یا آدم ارفع راسك وانظر فرفع راسه فاذا مکتوب علی العرش لا الٰه الا الله محمد نبی الرحمة وعلیٌ مقیم الحجة من عرف حق علی زکا وطاب ومن انکر حقه لعن وخاب اقسمت بعزتی وجلالی ان ادخل الجنة من اطاعه وان عصانی واقسمت بعزتی ان ادخل النار من عصاه وان اطاعنی۔

مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم اگر دار دنیا میں مجھے دو بندوں کا پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو تجھے پیدا نہ کرتا۔ حضرت آدمؑ نے عرض کی میرے اللہ کیا وہ دو تو میری اولاد سے ہوں گے؟ فرمایا ہاں اے آدمؑ سر کو بلند کر اور دیکھ پس آدمؑ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تو عرش پر لکھا ہوا پایا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد مصطفےٰ نبی رحمت ہیں اور حضرت علیؑ حجت خدا کے قائم کرنے والے ہیں پس جو علیؑ کے حق کا عارف ہوگا وہ پاک و پاکیزہ ہوگا اور جو اس کے حق کا منکر ہوگا وہ ملعون اور خاسر ہوگا مجھے اپنے عزّ وجلال کی قسم کہ اس کے فرمانبردار کو جنت میں داخل کروں گا خواہ میرا نافرمان ہی ہو اور مجھے اپنی عزت کی قسم کہ اس کے نافرمان کو جہنم میں داخل کروں گا۔ خواہ میرا اطاعت گذار ہی ہو۔

ونقل احادیث منها قال لو اجتمع الناس علی حب علیؑ لم یخلق الله النار وقال حب علیؑ حسنة لا یضر معها سیئة وبغض علی سیئة لا ینفع معها حسنة۔

علامہ نے متعدد احادیث کتب عامہ سے نقل فرمائی ہیں مثلاً حضورؐ نے فرمایا اگر تمام لوگ علیؑ کی محبت پر جمع ہو جاتے تو خدا جہنم کو پیدا نہ کرتا۔ نیز حضورؐ نے فرمایا۔ علیؑ کی محبت وہ نیکی ہے جس کے ساتھ کوئی گناہ نقصان دہ نہیں اور علیؑ سے بغض رکھنا ایسی برائی ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ مند نہیں۔

وقال من احب علیا قبل الله صلوته وصیامه واستجاب دعائه الا ومن احب علیا اعطاه بکل عرق فی بدنه مدینة فی الجنة الا ومن احب آل محمد امن الحساب والمیزان والصراط (الحدیث)

اور آپ نے فرمایا جو علیؑ سے محبت رکھے اس کی نماز، روزہ قیام خدا مقبول فرماتا ہے اور اس کی دُعا کو مستجاب کرتا ہے۔ آگاہ ہو جو بھی علیؑ سے محبت رکھے اس کے بدن کی ہر رگ کے بدلہ میں خدا اس کو جنت کا ایک شہر عطا کرے گا۔ آگاہ ہو جو آل محمدؐ سے محبت رکھے گا وہ حساب میزان اور صراط کی منازل میں امن ہوگا۔

اس قسم کی احادیث بکثرت وارد ہیں۔ جن میں سے بعض پہلے عنوانات کے تحت میں مذکور ہو چکی ہیں میرے سابق بیان سے ان کا مطلب بھی صاف واضح ہے اور یہ عدل الٰہی کے عین مطابق ہے بلکہ اس کا خلاف عقل کے خلاف ہے کیونکہ دشمن علیؑ کی نیکیوں اور عبادتوں کے مردود ہونے کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) جو علیؑ کا دشمن ہے وُہ نبیؐ کا دشمن ہے اور جو نبی کا دشمن ہے وُہ خدا کا دشمن ہے۔ پس دشمن علی حسب حکومت الٰہیہ کا اصولی طور پر نافرمان ہے تو اس کی دوسری نیکیوں اور فروعی عبادتوں کی کیا وقعت رہ سکتی ہے جس طرح کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔

(۲) جس شخص کو خلیفۂ رسولؐ کی معرفت نہیں اس کو رسولؐ کی معرفت نہیں اور جو رسولؐ کی معرفت نہیں رکھتا وہ صحیح طور پر عارف خُدا نہیں۔ پس ایسی صورت میں اس کی جُملہ عبادات خدا و رسولؐ و خلیفۂ رسولؐ کی ہدایات کے مطابق نہیں ہوں گی۔ بلکہ اس کا خود ساختہ طریقہ ہوگا اور سابق میں گزر چکا ہے کہ خدا صرف وہ عبادت منظور فرماتا ہے جو اس کے فرمان کے مطابق ہو اور ہرگز ایسی عبادت نہیں چاہتا جو عبد کی اپنی بنائی ہوئی ہو۔ اور خدا کی مرضی کے مطابق صرف وہی عبادت ہی ہو سکتی ہے۔ جس کا طریقہ ادائیگی۔ اس کا اپنا فرستادہ رسولؐ ہی تعلیم فرمائے۔ یا اس کے بعد اس کا صحیح قائمقام اس کی طرف رہنمائی فرمائے۔ پس جو شخص علیؑ سے بغض رکھتا ہوگا۔ اس کی عبادات مرضئ خدا کے خلاف ہوں گی۔ لہٰذا ان کا ناقابلِ قبول ہونا عین مطابق عقل اور موافق عدل ہے اور سابقہ ابحاث میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ رسولؐ کا صحیح جانشین سوائے علیؑ اور اس کی اولاد معصومینؑ کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

پس حدیث کے اس حصہ کا مطلب واضح ہوگیا کہ بغضِ علیؑ کے ساتھ کوئی عمل مفید نہیں۔ کیونکہ اصل کے کٹ جانے یا خشک ہو جانے کے بعد فروعات خود بخود خشک اور مُردہ ہو جاتے ہیں۔ پس یہ دُرست ہے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے خواہ اپنی مرضی سے کتنی ہی عبادتیں کرتا رہے۔ اب رہا حدیث کا دوسرا حصہ کہ علیؑ کے محب کے لئے جنت ضروری ہے۔ خواہ خدا کا نافرمان ہی ہو۔ یا یہ کہ علیؑ کی محبت کے ساتھ کوئی گناہ نقصان دہ نہیں ہوتا۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ علیؑ کی محبت بتلاتی ہے کہ یہ رسولؐ کا محب ہے۔ اور خدا کا بھی محب ہے۔ گویا علیؑ کا عارف خدا و رسولؐ کا عارف ضرور ہوا کرتا ہے پس اصولی طور پر تو اس کا قطعاً کوئی گناہ ہے ہی نہیں اور یہ اصولی نیکی اس کی قطعاً باطل ہو نہیں سکتی۔ اب اگر ایسے شخص سے گناہ سرزد ہوں گے تو وہ فرعی گناہ ہوں گے اور چونکہ فرع کی موت اصل کی موت کا موجب نہیں ہوتی لہٰذا صرف فرعی سزا کا مستحق ہوگا۔ پس اسی قدر جہنم میں جائے گا۔ جس قدر اس کے گناہ مقتضی ہوں گے اور اس کے بعد رہائی حاصل کر کے اصولی اطاعت کے ماتحت جنت میں داخل ہوگا۔ پس حدیث کا یہ جملہ کہ علیؑ کی محبت کے ساتھ کوئی گناہ نقصان دہ نہیں۔ یعنی ابدی جہنم کا موجب نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو ان فرعی معصیتوں کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیا جائے

اور آخرت کا عذاب اس سے ساقط ہو جائے ۔ لیکن دشمن علیؑ کے اعمال کی اصل ہی جب مردہ ہے تو فرعی اعمال تو مُردہ ہیں ہی ۔ لہٰذا ان کے بدلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اور گزشتہ حکومتِ ظاہریہ دنیاویہ کی مثال میں واضح کیا گیا ہے کہ اس قسم کے اصولی مُجرم کو معاف کرنا خلاف عقل اور منافی عدل ہے ۔

علیؑ قسیم جنّت و نار ہے

پس جن حدیثوں میں حضرت علیؑ کو جنّت و نار کا قسیم کہا گیا ہے ۔ ان کا مطلب بھی صاف صاف واضح ہو گیا ۔ چنانچہ حدیث وسیلہ میں ہے کہ جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے کہ جب میں اور علیؑ اپنی منازل قرب خدا پر فائز ہو چکیں گے ۔ اس کے بعد

فیاتی النداء من قبل اللہ یسمعہ النبیون والصدیقون والشہداء والمومنون ھذا حبیبی محمدؐ وولی علی ۔ طوبیٰ لمن احبہ وویل لمن ابغضہ وکذب علیہ فلا یبقی یومئذٍ احد احبک یا علی الا استراح الی ھذا الکلام وابیض وجھہ وفرح قلبہ ولا یبقی احد ممن عاداک ونصب لک حرباً وجحد لک حقاً الا اسود وجھہ واضطربت قدماہ فبینما انا کذٰلک اذا ملکان قد اقبلا الی ۔ احدھما رضوان خازن الجنۃ واما الآخر فمالک ۔ خازن النار فیدنوا رضوان فیقول السلام علیک یا احمد فاقول السلام علیک یا ایھا الملک من انت فما احسن وجھک واطیب ریحک فیقول انا رضوان خازن الجنۃ وھٰذہ مفاتیح الجنۃ بعث بھا الیک رب العزۃ فخذھا یا احمد فاقول قد قبلت ذٰلک من ربی فلہ

پس جانب خدا سے ندا ہو گی جن کو تمام نبی، صدیق، شہداء اور مومن سنیں گے کہ یہ میرا حبیب محمد مصطفےٰؐ ہے اور میرا ولی علیؑ ہے اس کے محب کیلئے طوبیٰ ہے اور اس کے دشمن مکذب کیلئے ویل ہے پس اس دن (یا علیؑ) تیرا کوئی محب نہ ہوگا ۔ مگر یہ کہ اس کلام کو سن کر خوش ہوگا اس کا چہرہ نورانی ہوگا ۔ اس کا دل مسرور ہوگا اور تیرے دشمنوں اور تیرے ساتھ لڑنے والوں اور تیرے حق کا انکار کرنیوالوں میں سے کوئی شخص نہ ہوگا مگر یہ کہ اس کا چہرہ سیاہ اور اس کے قدموں میں لرزہ پیدا ہوگا ۔ پس اسی اثناء میں دو فرشتے میرے پاس حاضر ہوں گے ایک رضوان (دربان جنت) اور دوسرا مالک داروغہ جہنّم، پس رضوان قریب آکر کہے گا ۔ السلام علیک یا احمد، میں اس کو جواب سلام دوں گا ۔ اور پوچھوں گا کہ تو کون ہے ؟ تیرا چہرہ کیسا خوبصورت اور تیری خوشبو کس قدر پاکیزہ ہے پس وہ کہے گا ۔ میں رضوان خازن جنت ہوں اور یہ کلید ہائے جنّت ہیں ۔ جو خدا نے تیری طرف بھیجی ہیں ۔ یہ لے لو ۔ پس میں کہوں گا کہ میں نے اپنے رب کی طرف سے قبول کر لی ہیں اور ------ اس فضیلت کے عطا کرنے پر اس کی حمد کرتا ہوں ۔ پس میں وہ علیؑ

---

[1] البرہان ۔ وابتغوا الیہ الوسیلۃ کے تحت میں ہے ۔ منہ ۔ وذکر العلامہ المجلسیؒ ہذا الحدیث فی ثالث البحار ص۲۵۲ مع اختلاف بعض الالفاظ ۱۲ منہ

الحمد علی ما فضلنی به ادفعها الی اخی علی بن ابی طالب ثم یرجع رضوان فیدنوا مالک فیقول السلام علیک یا احمد فاقول السلام علیک ایها الملک فما اقبح وجهک انکر رویتک فیقول انا مالک خازن النار وهذه مقالید النار بعث بها الیک رب العزة فخذها یا احمد فاقول قد قبلت ذلک من ربی فله الحمد علی ما فضلنی به ادفعها الی اخی علی بن ابی طالب علیه السلام ثم یرجع مالک فیقبل علی ومعه مفاتیح الجنة ومقالید النار حتی یقف علی جهنم وقد تطایر شررها وعلا زفیرها واشتد حرها وعلی اخذ بزمامها فتقول لجهنم جزنی یا علی فقد اطفاء نورک لهبی فیقول لها علی قری یا جهنم خذی هذا واترکی هذا خذی هذا عدوی واترکی هذا ولیی (الخبر)

کر دوں گا۔ پھر رضوان واپس جائے گا اور مالک قریب آکر سلام کہے گا اور اس کو جواب میں السلام علیک کہہ کر دریافت کروں گا کہ تیرا چہرہ کتنا قبیح اور تیرا منظر کس قدر بدنما ہے؟ تو وہ کہے گا میں مالک خازن جہنم ہوں اور یہ کلید ہائے جہنم خدا نے تیری طرف بھیجی ہیں۔ یہ لے تو۔ پس میں کہوں گا کہ میں نے قبول کی ہیں۔ اور اللہ کے اس فضل پہ اس کی حمد کرتا ہوں۔ اور پھر وہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حوالے کردوں گا۔ پھر مالک واپس چلا جائے گا۔ اور علی کلید ہائے جنت و نار کو لے کر آگے بڑھے گا حتیٰ کہ جہنم کے کنارا پہ آکر کھڑا ہوگا۔ اس وقت جہنم کے شعلے امڈ رہے ہوں گے۔ اس کی آواز بلند ہوگی۔ اور گرمی تیز ہوگی اور حضرت علیؑ کے ہاتھ میں اس کی مہار ہوگی۔ اور وہ کہے گی۔ یا علیؑ آپ جلد گذر جائیں۔ کیونکہ آپ کا نور میرے شعلوں کو بجھاتا ہے۔ پس حضرت علیؑ فرمائیں گے صبر کر اے جہنم، اس کو لے لے اور اس کو چھوڑ دے اس کو لے کیونکہ میرا دشمن ہے اور اس کو چھوڑ کیونکہ میرا دوست ہے۔

پس اس حدیث کا صاف مطلب یہی ہے کہ جنت و نار کا معیارِ استحقاق حب علیؑ اور بغض علی ہی ہے چونکہ محب علی، خداوند کریم کا اصولِ معرفت میں اطاعت گذار ہے۔ لہٰذا وہ جہنم کی سزا کا مستحق نہیں۔ پس وہ فرعی گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد آزاد ہو جائیگا اور دشمن علیؑ چونکہ اصولِ معرفت میں خدا کا نافرمان ہے۔ لہٰذا اس کی فرعی نیکیوں کی کوئی قیمت نہیں پس وہ جہنم کی دائمی سزا کا سزاوار ہے اور اس کو صرف توحید و نبوت کا اقرار کوئی فائدہ نہ دے گا۔ جس طرح نبوت کے منکر کو صرف توحید کا اقرار فائدہ مند نہیں ہے۔

مقدمہ تفسیر مرآۃ الانوار میں بروایت علل صدوق مفضل سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام قسیم الجنۃ والنار کس طرح ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ چونکہ علیؑ کی محبت ایمان اور اس کا بغض کفر ہے اور جنت ایمان والوں کے لئے اور جہنم اہل کفر کے لئے ہے۔ پس علی قسیم الجنۃ والنار ہوگئے

یعنی جنت میں صرف علیؑ کے محب جائیں گے اور دوزخ میں صرف علیؑ کے دشمن ہی جائیں گے۔
مفضل کہتا ہے میں نے عرض کی۔ یا ابن رسولؐ اللہ! کیا گذشتہ انبیاء و اوصیاء بھی علیؑ کے محب تھے اور ان کے دشمن علیؑ کے دشمن تھے آپؑ نے فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کی حضورؑ! اس کی وضاحت فرمائیے؟ آپ نے فرمایا کیا تجھے یوم خیبر کا سرکار رسالت کا فرمان معلوم نہیں کہ حضورؐ نے فرمایا تھا[1] لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُحِبُّ اللهَ وَرَسُوْلَهُ لَا يَرْجِعُ حَتّٰى يَفْتَحَ اللهُ عَلٰى يَدَيْهِ (کل علم فوج ضرور ایسے شخص کو دوں گا جو خدا اور رسولؐ کا محب ہوگا اور بغیر فتح کے نہ پلٹے گا) میں نے عرض کی۔ ہاں۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب حضورؐ کے پاس بھونا ہوا پرندہ لایا گیا تو آپ نے دعا مانگی۔ اَللّٰهُمَّ ايْتِنِيْ بِاَحَبِّ خَلْقِكَ اِلَيْكَ يَاكُلُ مَعِيَ هٰذَا الطَّيْرَ وَعَنٰى بِهٖ عَلِيًّا۔ (اے اللہ اپنی مخلوق میں سے اپنا محبوب ترین انسان بھیج جو میرے ساتھ اس پرندے کے کھانے میں شریک ہو اور آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو ہی مراد لیا تھا) میں نے عرض کی کہ ہاں! ایسا ہی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کے نبی و رسولؐ اور ان کے اوصیاء ایسے شخص کو دوست نہ رکھتے ہوں جس کو اللہ اور اس کا رسولؐ دوست رکھتے ہوں اور وہ اللہ و رسولؐ کو دوست رکھتا ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا پس معلوم ہوا کہ خدا کے نبی و رسولؐ اور گذشتہ تمام مومنین علیؑ کے محب تھے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اُن کے مخالفین۔ حضرت علیؑ اور اس کے تمام محبوں کے دشمن تھے۔ میں نے عرض کی بے شک آپ نے فرمایا (پس نتیجہ یہ ہوا) کہ جنت میں علیؑ کا محب ہی جائے گا۔ خواہ اولین سے ہو یا آخرین سے ہو۔ لہٰذا وہ قسیم الجنۃ والنار ثابت ہو گئے۔
میں نے عرض کی۔ آپ نے میرا عقدہ حل کر دیا ہے۔ خداوند کریم آپ کی جملہ مشکلات و مصائب رفع فرمائے مجھے اپنے علم خاص سے کچھ اور افادہ فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اے مفضل! تو دریافت کر۔ میں نے عرض کی۔ یا ابن رسول اللہ! اگر علیؑ اپنے محبوں کو جنت اور دشمنوں کو جہنم بھیجیں گے تو رضوان اور مالک؟ (کیا کریں گے؟)
آپ نے فرمایا۔ اے مفضل! کیا تجھے معلوم ہے کہ خداوند کریم نے تمام مخلوق سے دو ہزار سال قبل عالم ارواح میں جناب رسالتمآبؐ کو ارواح انبیاء پر مبعوث فرمایا اور آپ نے ارواح انبیاء کو توحید کی دعوت دی اور اپنی اطاعت و اتباع کے لئے حکم دیا اور بصورت اطاعت جنّت اور بصورت معصیت جہنّم کا ان کے ساتھ وعدہ و وعید کیا۔ مفضل نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا رسولؐ خدا خدا کی جانب سے وعدہ وعید کے ضامن نہیں تھے؟ میں نے عرض کی۔ ہاں (بے شک وہ ضامن ہیں) آپ نے فرمایا۔ کیا علیؑ بن ابی طالبؑ ان کے خلیفہ اور ان کے بعد ان کی امّت کے امام نہیں

---

[1] مجمع البیان۔ لاعطین الرایۃ غداً رجلاً یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ کرارا غیر فرار لا یرجع حتی یفتح اللہ علی یدیہ (الحدیث)

میں نے عرض کی: ہاں: آپ نے فرمایا کہ کیا رضوان اور مالک شیعانِ علیؑ اور تمام محبان علیؑ کی مغفرت کے لئے دُعا مانگنے والے ملائکہ میں سے نہیں ہیں؟ میں نے عرض کی ہاں! ہیں، آپ نے فرمایا اے مفضل یہ مخزون و مکنون علم میں سے ہے اس کو محفوظ کر اور نااہل کے حوالہ نہ کر۔ مفضل نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہا کہ یہ علم کا وہ دروازہ ہے جس سے ہزار دروازے کھلتے ہیں۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر دشمن علیؑ کے اعمال کو ضائع قرار دیا جائے تو عدل خداوندی کے منافی ہے۔ کیونکہ مزدوری کرنے کے بعد مزدور کو حق اُجرت سے محروم کرنا ظلم ہے، تو اس کے کئی جوابات ہیں۔

(۱) اصل کی مخالفت کے ساتھ فرعی نیکیاں، نیکیاں ہی نہیں جس طرح اصل حکومت ظاہریہ کا دشمن جزوی اطاعتوں کی وجہ سے حکومت کا مخلص یا اطاعت گذار نہیں کہا جا سکتا اور اس کی جملہ نیکیوں کو تلف قرار دینا عین مرافق عقل اور اس کی سزا مطابق عدل ہے۔

(۲) علیؑ کی مخالفت کی وجہ سے چونکہ اس کے تمام اعمال منشار خدا کے مطابق نہیں۔ لہٰذا وہ قابلِ قبول نہیں، کیونکہ عبادت وہی مقبول ہے جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور وہ صرف وہی ہو سکتی ہے جو خدا کے رسولؐ اور اس کے صحیح قائمقام کی تعلیمات کے ماتحت ہو۔

(۳) اعمال کو مزدوری قرار دینا ہی غلط ہے اگر انسان عمر بھر عباداتِ الٰہیہ میں مصروف رہے۔ تاہم اس کے سابقہ احسانات کا بدلہ نہیں ادا کیا جا سکتا اور حق عبادت ادا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے احسانات حد شمار سے بیش تر ہیں۔ خود فرماتا ہے۔ اِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ پس جب عباداتِ انسانیہ اس کے سابقہ احسانات کا بدلہ نہیں ہو سکتیں تو آئندہ کے لئے استحقاقِ اجر اُن میں کس طرح پیدا ہو جائے گا۔

(۴) اور بالفرض اگر ان عبادات کو آئندہ کے انعامات کے لئے مزدوری ہی کہا جائے۔ تاہم مزدوری قابل اجر اس وقت ہوا کرتی ہے جب منشار مالک کے مطابق ہو اور اس کی طرف سے عائد شدہ تمام شرائط کا لحاظ رکھا جائے اور معرفتِ خدا و رسولؐ و امام عبادات کی جملہ شرائط میں سے اہم ترین شرط ہے (اِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ شرط چلی جائے تو مشروط خود بخود ختم ہو جایا کرتا ہے) پس معرفتِ امام حق کے بغیر اس کی عبادت، عبادت ہی نہیں۔ لہٰذا اجر کا اس میں کوئی استحقاق نہیں خدا فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (الآیۃ) مقصد یہ ہے کہ اللہ کی محبت اطاعتِ رسولؐ کے بغیر قطعاً نہیں ہو سکتی اور رسولؐ کی اطاعت کے متعلق

لہ صفحہ ۔۔۔ پر یہ فرمانِ رسول گذر چکا ہے کہ اگر تمام لوگ علیؑ کی محبت پر جمع ہو جاتے تو خدا جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا۔ اس کا مطلب بھی اب صاف واضح ہو گیا۔ منہ۔

فرماتا ہے مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (جو کچھ تم کو رسولؐ دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ روکے اس سے رُک جاؤ) اور رسولؐ کی دی ہوئی چیزوں میں سے ولایت علیؑ ہے جس کا لاکھوں کے اجتماع عظیم میں بازو پکڑ کر دکھا دکھا کے اتمامِ حجت کی اور فرمایا۔ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ یہ حدیث غدیر وہ متواتر حدیث ہے جس کو ایک سو سے زائد صحابہ کرام نے خود نقل کیا اور اس کے بعد دعا مانگی اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ (الحدیث) اے اللہ تو اس کو دوست رکھ جو علیؑ کا دوست ہو اور اس کو دشمن رکھ جو علیؑ کا دشمن ہو۔

پس معلوم ہوا کہ علیؑ کا محب ہی محبت خدا حاصل کر سکتا ہے نیز اطاعتِ ثقلین رسولؐ کی عطا کی ہوئی چیزوں میں سے ہے جو کتبِ عامہ وخاصہ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے اور گذشتہ فصول میں متعدد جگہوں پہ اس کو واضح کیا گیا ہے اور ثقلین کے مستقل عنوان کے تحت کافی احادیث بھی جمع کردی گئی ہیں۔ نیز جناب رسالتمآبؐ نے علیؑ کی محبت کو ایمان اور اس کے بغض کو کفر و نفاق سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ ص۱۲۶ ص۱۲۷ پر احادیث مذکور ہو چکی ہیں۔

پس علیؑ کی مخالفت نبی کی مخالفت اور نبی کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے پس مخالفتِ علیؑ کے ہوتے ہوئے کوئی عبادت مقبول ہو ہی نہیں سکتی۔ جب علیؑ کی محبت ہی ایمان ہے تو بجز ایمان کے کوئی عبادت قابل قبول کیسے بن سکتی ہے؟

ظلم تو جب لازم آتا کہ عبادت کو شرائط کے ساتھ ادا کیا جاتا اور پھر اس کو معاذاللہ خدا ضائع کر دیتا۔ حالانکہ خدا ایسا ہرگز نہیں کرتا۔ فرماتا ہے میں محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ لیکن جب شرائط کو ترک کرکے انسان خود ہی اپنے اعمال کو ضائع کر دے تو ان کا اجر سے محروم رہنا کوئی منافیٔ عدل نہیں۔

اجرِ رسالت

(۵) خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی۔ فرما دے اے رسولؐ کہ میں تم سے اجر رسالت سوائے مودت فی القربیٰ کے اور کچھ نہیں مانگتا۔

وَذَکَرَ العلامۃ نقلاً عن مسند احمد و تفسیر الثعلبی وغیر ذلک من الصحاح عن بن عباس قال لما نزل قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی قالوا یا رسول اللہ من قرابتک الذین وجب علینا مودتھم؟ قال (علی وفاطمۃ وابناھما)

علامہ علی قدس سرہ نے مسند احمد، تفسیر ثعلبی اور اہلسنت کی دیگر کتب صحاح سے نقل فرمایا ہے کہ جناب ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی (کہہ دے میں اجر رسالت تم سے سوائے مودۃ فی القربیٰ کے اور کچھ نہیں مانگتا) لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ آپ کے کون قرابت دار ہیں جن کی مودت واجب ہے تو حضورؐ نے فرمایا۔ وہ علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دونوں فرزند ہیں۔

پس آل رسولؐ کی مودت ہے۔ اجر رسالت۔ تو جو شخص اسلام کا دعویٰ کرے اور جناب رسالتمآبؐ کے ان فرزندان سے مودت نہ رکھے تو اس نے گویا اجر رسالت کے ادا کرنے میں کوتاہی کی اور اجر کی ادائیگی کے بغیر کوئی عمل

درست ہو نہیں سکتا ۔ مثلاً مسجد تعمیر کرانیوالا اگر معمار یا مزدوروں کی اُجرت کو ادا نہ کرے یا کپڑے سلانے والا درزی کو حق سلائی نہ دے تو اس کا اس مسجد میں یا اس لباس میں نماز ادا کرنا صرف فضول ہی نہیں بلکہ وبالِ اُخروی کا موجب بھی ہے ۔ پس اسی طرح کلمہ توحید و رسالت زبان پر جاری کرنے کے بعد بغیر مودت آلِ رسولؐ کے اعمال سب رائیگاں ہیں اور ہرگز ہرگز قابلِ قبول نہیں ۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقی تمام انبیاء نے تو کبھی تبلیغ نبوّت پر اجر کا امّت سے مطالبہ نہیں کیا اور حضرت سیّد المرسلین نے کیوں ایسا کیا گویا ان نبیوں نے قربتہً الی اللہ تبلیغ کی ۔ اور انہوں نے اپنی تبلیغ دین کی اُجرت کا مطالبہ فرمایا ۔ یقیناً اس میں تنقیصِ شانِ رسالت ہے ۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات منافیٔ شان سیّد الانبیاء تب لازم آتی کہ اُجرت کا تعلق ان کی ذاتی اغراض کی تکمیل سے ہوتا ۔ حالانکہ ایسا نہیں ۔ بلکہ یہاں اُجرت کا تعلق صرف امّت ہی سے ہے اور اس کی منفعت صرف انہی پر عائد ہے ۔ چنانچہ حدیثِ ثقلین میں اس امر کی پوری وضاحت فرما دی کہ ان کے ساتھ تمسک پکڑنے سے تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور یہ اخلاص تبلیغ کی انتہائی حد ہے کہ متعدد مصائب جھیل کر تکالیف اُٹھا اُٹھا کر ان کو قعرِ ذلّت سے نکالا ۔ اوجِ رفعت پر پہنچایا اور پھر انتہائی محبت سے فرمادیا کہ دیکھو مجھے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے تمہارے روپوں ، اشرفیوں وغیرہ کی ضرورت نہیں ۔ بلکہ میری اُجرت یہی ہے کہ تم ان اسلامی نعمات اور اخروی لذّات کا راستہ کھو نہ بیٹھو ۔ پس اس کے لئے میری نصیحت مانو اور اس پر عمل کرو اور یہی میری اجرت ہے کہ میری آل کے ساتھ محبت رکھو تاکہ حوضِ کوثر تک میرے پاس صحیح پہنچ سکو ۔

نیز یہ طلب اجر نہیں بلکہ تبلیغ رسالت کا ایک کام ہے جس طرح آپ نے نماز پہنچائی روزہ پہنچایا وغیرہ ۔ یہاں بھی ارشاد ہے قُلْ یعنی پہنچادو ۔ اگر اُجرت طلب کرتے تو آیت میں لفظ قَالَ ماضی کا صیغہ ہوتا ۔ پس یہ آیت منجملہ تبلیغاتِ رسالت کے ہے اور مقصد صرف بقائے اسلام ہے ۔

احباطِ اعمال

چونکہ اعمال صالحہ کی جزا کے متعلق قرآن مجید میں بارہا وعدہ ہو چکا ہے اور عدلِ خداوندی سے کسی کے اعمال کا ضائع کرنا بعید ہے ۔ لہٰذا وہ آیات جن کا مضمون حبط اعمال کی لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ ان کی بناء پر یہ خطور ذہن میں پیدا ہونا لازمی ہے کہ عدل اور حبط کیا یہ دو باتیں آپس میں تنافی تو نہیں رکھتیں

تو اس اشکال کے جواب سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ ضبط اور حبط دو جدا لفظیں ہیں ۔ جن کے معانی جُدا جُدا ہیں ۔ ضبط کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو ایک چیز کا مستحق قرار دیتے ہوئے کسی اور معاملہ یا حق میں اس کو ماخوذ قرار دیکر بطور تاوان کے اس کے استحقاق کو باطل کر دینا اور اس کا سبب صرف تسکینِ جذبات ہی ہوا کرتا ہے اور یہ سراسر ظلم ہے ایسے امر کا صدور کسی شریف سے بھی بعید ہے چہ جائیکہ معبود برحق سے اس کا صدور ہو ۔

حبط کا مطلب یہ ہے کہ عمل میں معاوضہ کا استحقاق ہی نہیں۔ یعنی وہ عمل صوری طور پر عمل ہے۔ اس میں معنویت ہی نہیں۔ جس کی بدولت اس میں کسی قسم کا استحقاق پیدا ہو۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) عمل میں وہ شرائط ملحوظ نہ رکھی گئی ہوں جو اس کی مقبولیت کا معیار ہیں۔

(۲) بوقتِ عمل شرائط متعینہ کا لحاظ ہو جن کی بدولت وہ عمل صحیح قرار دیا جائے۔ لیکن اس کی مقبولیت و استحقاق کی آخری شرط (یعنی خاتمہ کا ایمان سے ہونا) مفقود ہو جائے۔

پس اگر نمازی، نماز کو شرائط صحت کے ساتھ ادا کرے اور بالآخر اس کا خاتمہ بھی ایمان سے ہو تو اس کی نماز یقیناً موجب اجر ہے اور وہ شخص فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ کا مصداق ہے۔ اسی طرح باقی تمام اعمال صالحہ اگر اسی صورت سے ہوں تو ان کی جزا ضروری ہے اور کوئی دوسرا جرم ان کی جزا کو ضبط نہیں کرا سکتا۔ کیونکہ ضبط ظلم ہے پس ایسے شخص سے اپنی زندگی میں اگر کوئی عمل موجب مواخذہ سرزد ہو بھی جائے تو وہ اس کی سزا علیحدہ پائے گا اور سزا کی میعاد ختم ہو جانے پر اپنے اعمال صالحہ کی جزا کا وہ ضرور مستحق ہوگا۔

لیکن اگر اس کی نماز یا دیگر عبادات میں بوقتِ ادائیگی شرائط صحت ملحوظ نہ ہوں اور من جملہ شرائط صحت کے محبت و ولاء آلِ محمد بھی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ بیانات میں اس پر کافی بحث گذر چکی ہے یا بوقتِ ادائیگی شرائط صحت ملحوظ تھیں لیکن خاتمہ ایمان پر نہ رہا ہو۔ تو ان ہر دو صورتوں میں اس کے اعمال میں استحقاق جزا ہی نہیں رہتا۔ جسے حبط عمل سے تعبیر کیا گیا ہے پس جب اس قسم کے اعمال موجب جزا ہی نہیں تو ضبط جزا کا قصہ ہی ختم ہے گویا اس کے اعمال کا وجود کالعدم ہے نماز کا سرے سے بے وضو پڑھنا یا قبل سلام کے وضو توڑ دینا دونوں مساوی ہیں۔ اسی طرح روزہ میں شروع سے نیت فاسدہ رکھنا یا قبل از غروب خواہ ایک منٹ ہی پہلے ہو توڑ دینا برابر ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس تمام عبادات

پس ایسا ہی ابتدائً ولائے اہل بیت سے منحرف ہونا اور قبل از موت منحرف ہو جانا ہر دو صورتیں برابر ہیں اور ہر دو مبطل جمیع اعمال ہیں۔

اس مقام پر گزشتہ مثال حکومت کو مقام کی مزید توضیح کے لئے مدّنظر فرمائیے کہ جو شخص حکومتِ وقت کا دشمن و غدار ہو خواہ ابتداً ایسا ہو خواہ عرصہ دراز کے بعد ایسا ہو جائے۔ ہر دو صورتمیں حکومتِ وقت کی طرف سے سخت ترین سزا کا مستوجب ہوا کرتا ہے اور اس کا یہ جُرم قطعاً قابلِ عفو نہیں ہوتا۔ خواہ ظاہری طور پر وہ حکومت کے قوانین کا کتنا ہی احترام کرتا ہو پس جب بھی جُرم مذکور میں گرفتار ہوگا۔ اس کی کسی دوسری خوبی کو سامنے نہ لایا جائے گا اور نہ وہ ان خوبیوں کو جتلا کر اپنا گناہ دھو سکے گا۔ بلکہ اس کی وہ تمام خوبیاں صرف ظاہر داری اور منافقت ہی پر محمول ہونگی۔ اب اس کی سزا محدود نہ ہوگی۔ تاکہ کسی وقت اس کو رہا کر کے دوبارہ اس کو اس قسم کی شرارتوں کا موقعہ دیا جائے۔ ایسی صورت میں اس کو رہا کرنا بھی حکومت کی دانائی کے سراسر خلاف ہے۔

لیکن بخلاف اس کے جو شخص حکومت کا دل سے وفادار ہو لیکن جذباتِ نفسانیہ کے ماتحت اگر اس سے حرکاتِ ناشائستہ کا صدور ہو جائے تو ایسا شخص اپنے جرم میں گرفتار ہو کر دفعاتِ حکومت کی رُو سے متعینہ سزا کا سزاوار ضرور ہو گا۔ لیکن اس کی سزا محدود ہو گی اور آخر کار رہائی کا مستحق ہو گا اور یہی عین مصلحت و عدالت ہے اور جرم کی حیثیت سے اس کو زیادہ سزا یا سب رکھنا عینِ ظلم ہو گا۔

پہلی صورت میں مجرم کا رہا کرنا نا انصافی اور دوسری صورت میں اس کو زیادہ دیر تک مبتلائے سزا رکھنا نا انصافی ہے پہلی صورت میں مجرم کی سزا کی تخفیف موجب خطرہ ہے اور دوسری صورت میں سزا کی تخفیف حکومت کی رحمدلی اور مجرم کے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ نیز دوسری صورت میں بعض مصالح کی بناء پر مجرم کا معاف کر دینا بھی ممکن ہے بشرطیکہ جرم کا تعلق حکومتی حقوق سے ہو اور اگر رعایا کے حقوق سے اس کا تعلق ہوا تو پھر اس کی معافی صاحب حق کے حق کی تلافی یا اس کی معافی پر موقوف ہے۔

یہ مثال صرف مطلب کی وضاحت کے لئے ہے ورنہ اخروی جزا و سزا کا اس پر قطعاً قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بعض اوقات حکومتِ ظاہریہ میں پہلی قسم کے مجرم کو بھی توبہ کرنے اور وفاداری کا یقین دلانے پر رہا کر دیا جاتا ہے لیکن قیامت کی عدالتِ عالیۂ الٰہیہ میں یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ وہاں مجرم کا توبہ کرنا یا آئندہ کی وفاداری کی یقین دہانی کرنا ناممکن ہے یہ صورت تو صرف موت سے پہلے پہلے ہو سکتی تھی اور اس صورت میں اس کو یقینی طور پر معاف بھی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب موت کے آہنی شکنجہ میں گرفتار ہو جانے کے بعد نہ تو توبہ کا امکان ہے اور نہ اس کی رہائی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے ہاں اگر اب کوئی خواہش کرے کہ دوبارہ مجھے دنیا میں بھیجا جائے تو اعمال سابقہ کی تلافی کروں گا۔ جواب ملے گا۔ كَلَّآ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا۔

اس مثال کے بعد آسانی سے اس نظریہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ جو لوگ حکومتِ الٰہیہ اسلامیہ کے اصول یعنی توحید نبوت، امامت یا ان میں سے کسی ایک عقیدہ کے باغی ہیں۔ ان کی تمام نیکیاں نہ قابل قبول ہیں اور نہ موجب ثواب۔ پس گرفتاری کے بعد ان کے لئے نہ امکانِ توبہ ہے نہ تخفیف عذاب بلکہ وہ جَزَآؤُهُمْ خَالِدِيْنَ فِيْهَا کے ہی مصداق ہیں

لیکن بخلاف اس کے جو لوگ اصل حکومت کے موافق وفادار ہیں تو ان کی جزوی کوتاہیاں موجب سزا ضرور ہیں لیکن سزائے محدود نہ دائمی۔ اگر توحید و رسالت و امامت کے قائل و عارف سے ایسا گناہ سرزد ہو جائے جو تعزیراتِ شرعیہ کی رُو سے دائمی سزا کا موجب ہے تو اب تعارض پیدا ہو جائے گا۔ ایک طرف اس کے پاس نیکی موجود ہے جس کی جزا ضروری ہے کیونکہ وہ کسی صورت میں ضائع نہیں کی جا سکتی اور وہ ہیں عقائدِ حقہ اور دوسری طرف اس کی برائی بھی اس قسم کی ہے کہ اس کی سزا دائمی مقرر شدہ ہے اب اگر اس کے گناہ کی سزا دائمی ہو تو اس کی نیکی کی جزا کا ضبط ہونا لازم آئے گا کیونکہ وہ [illegible] جزا سے بھی محروم ہے اور ضبط عدل خداوندی کے خلاف ہے۔

پس جمع کی صورت یہی ہوگی کہ اس کی سزا سے دوام کو ہٹا دیا جائے اور محدود کر دیا جائے پس گویا وہ شخص مستحق سزا [illegible] پہلے گناہ کی سزا لے گا اور پھر نیکی کی جزا میں داخل جنّت ہوگا۔ پس ایسی صورت میں اس کی سزا میں اگر خلود کی لفظ وارد ہو تو اس سے مراد مدّت طویلہ لینی ہوگی۔ تاکہ جزا و سزا ہر دو اپنے اپنے مقام پر برقرار رہیں۔

اب مجرم کی سزائے دائمی کو ہلکا کرکے کم کر دینا منافیٔ عدل نہیں ہے۔ بلکہ تخفیفِ سزا اس کا فضل و احسان ہے البتہ اس کی سزا کو دائمی کر کے اس کو اپنی نیکی کی جزا سے محروم کر دینا شانِ ربوبیت کے منافی اور عدل خداوندی کے خلاف ہے

میزان اعمال کے متعلق ارشاد قدرت ہے۔

اَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ — جس کا میزانِ عمل بھارا ہوگا وہ آرام کی زندگی میں ہوگا۔

وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ الایۃ — اور جس کا اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا اس کا ٹھکانا جہنّم ہے الخ

اعمال صالحہ کی زیادتی اور اعمالِ بد کی کمی کی صورت میں اس کے ان تھوڑے گناہوں کو معاف قرار دینا اور اس سے سزا کو قطعاً برطرف کر دینا اللہ کے فضل و کرم سے بعید نہیں۔ جس طرح پہلی آیت سے صاف طور پر ظاہر ہے۔

لیکن اعمال بد کی زیادتی کی صورت میں اس کی تھوڑی نیکیوں کو نظر انداز کرنا اور ضبط کرنا خلاف عدل ہے۔ پس دوسری آیت جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال بد کی زیادتی کی صورت میں اس کی نیکیاں بے اثر قرار دے کر اس کی بازگشت ہاویہ کو قرار دیا جائے گا۔ اس کی توجیہہ کی دو صورتیں ہیں (۱) اس کے نامۂ اعمال میں قطعاً عمل صالحہ کا وجود ہی نہ ہو اور خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ کا یہی معنی لیا جائے اور یہ خدا اور رسولؐ و آئمہ طاہرینؑ کے دشمن کی ہی صورت ہوسکتی ہے کیونکہ ان کے اعمال بوجہ حبط کے ناقابلِ جزا ہیں۔ لہٰذا ان کا میزان عمل خیر سے قطعاً خالی ہوگا۔ پس اس کے نامہ میں سوائے برائی کے اور کچھ نہ ہوگا اور حکومتِ الٰہیہ کے باغی ہونے کی حیثیت سے وہ صرف سزا ہی سزا کا سزاوار ہوگا۔ پس اس کی جزا ہاویہ ہی ہے (۲) اعتقاداً مومن ہو لیکن اعمال صالحہ کم اور اعمال بد زیادہ ہوں تو چونکہ دوسرے مقام پر فرماتا ہے مَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ۔ (جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کی جزا پائے گا) اور ادھر فرماتا ہے۔ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ پس اگر اس کی سزا دائمی ہو تو اس کے اعمال صالحہ کا ضبط خلافِ وعدہ بھی ہے اور منافیٔ عدل بھی۔ تو ماننا پڑے گا کہ اپنے اعمالِ فاسدہ کی محدود سزا بھگت لینے کے بعد وہ ضرور جنّت میں اپنی جگہ لے گا اور اگر خدا چاہے تو اپنے فضل و کرم سے اس کی ساری سزا ہی معاف فرما دے۔ بشرطیکہ اس کے گناہوں کا تعلق حقوق النّاس سے نہ ہو اور حقوق النّاس بھی صاحبِ حق کی معافی یا رضامندی سے معاف ہوسکتے ہیں اور اگر حقوق اللہ سے ہوں تو خود فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ — تحقیق خدا شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا اور اس کے علاوہ تمام گناہ بخش سکتا ہے جس کے لئے وہ چاہے۔

روایت میں ہے اس استثنائ سے مراد شیعانِ حضرت امیرالمومنین علیہ السّلام ہی ہیں۔

پس نتیجہ بحث یہ ہُوا کہ اعمالِ صالحہ صحیحہ کا ضبط کرنا خلاف عدل ہے اور منکر توحید و نبوت و امامت کے اعمال کا حبط ہونا عین عدل ہے۔ نیز عقائدِ حقہ کی صحت کی صورت میں تخفیف کا ہونا یا سزا کا سرے سے معاف ہو جانا اس کا فضل و احسان ہے۔

مسئلہ شفاعت بیان سابق سے یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ ولایتِ آلِ محمدؐ خود اپنے مقام پر شفاعت کا کام کرتی ہے۔ یعنی ولایتِ آلِ محمدؐ کے ساتھ جس قدر اعمال صالحہ انسان سے ادا ہو سکیں وہ قطعاً ضائع تو ہو نہیں سکتے۔ پس ان کا ضبط نہ ہونا اور ان کی جزا کا ضروری قرار دیا جانا لازمی طور پر دخولِ جنت کا موجب ہے۔

پس دائمی عذاب تو قطعاً ہو نہیں سکتا کیونکہ اعمالِ صالحہ کی جزا کا ضبط ہونا لازم آتا ہے۔ جو منافیٔ عدل خداوندی ہے۔ لہٰذا دائمی سزا کو تخفیف کرکے محدود تک لے آنا مودّت آلِ محمدؐ ہی کا کام ہے اب اگر خدا چاہے تو پوری معافی بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ حقوق العباد نہ ہوں۔ ورنہ صاحب حق کی تلافی یا معافی پر اس کی بخشش کلی کا انحصار ہوگا۔

اور جناب رسالتمآبؐ اور ان کے خلفائے طاہرینؑ کو حق خصوصی یہ بھی حاصل ہے کہ وہ گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے اور وہ صرف انہی گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے۔ جن پر بوجہ کفر و شرک و نفاق (انکار توحید و رسالت و امامت) دوام جہنم کی سزا واجب نہ ہوگی اور وہ صرف شیعانِ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ہی ہیں چنانچہ ارشادِ سرکارِ رسالت ہے۔

يَا عَلِيُّ أَنْتَ وَشِيْعَتُكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ اے علیؑ تو اور تیرے شیعہ ہی نجات پانے والے ہیں۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

ولایتِ آلِ محمدؐ علیہم السلام

چونکہ تعلیماتِ قرآن اور ان پر عمل کرنے کے بعد نعماتِ آخرت کا استحقاق آلِ محمدؐ کی ولا پر ہی موقوف ہے۔ لہٰذا اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق چند احادیث ذکر کر دی جائیں۔ تاکہ طالبانِ حق کے لئے راستہ زیادہ ہموار ہو جائے اور اہلِ بیتِ عصمت کے فرامین سے ایمان والوں کے دلوں میں نورِ معرفت اور زیادہ ہو جائے۔

مقدمہ تفسیر مراۃ الانوار میں ریاض الجنان سے بروایت جابر جعفی منقول ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب اللہ تھا اور اس کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی۔ پہلے پہل ذاتِ احدیت نے حضرت محمد مصطفےٰؐ اور ہم کو اپنے نور سے خلق فرمایا ہم اللہ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ اس وقت نہ زمین تھی نہ آسمان، نہ مکان، نہ زمان، شب و روز اور نہ شمس و قمر (غرضیکہ کوئی اور شے نہ تھی) ہمارا[1] مقام نور پروردگار کے سامنے ایسا تھا جیسے شعاع شمس شمس کے مقابلہ میں

[1] یہ نظیر صرف سمجھانے کے لئے ہے ورنہ سورج اپنی شعاع کے لئے فاعل موجب ہے فاعل مختار نہیں۔ یعنی یہ شعاعیں سورج کے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۴۹ پر)

پس ہم اس کی تقدیس و تحمید و عبادت کرتے تھے جس طرح حق عبادت ہے پھر خدا نے مکان[1] کو پیدا کیا اور اس پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ عَلِیٌّ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ وَصِیُّہٗ بِہٖ اَیَّدْتُہٗ وَ نَصَرْتُہٗ کا نقش فرمایا ۔ پھر عرش کو پیدا کیا اور اس کے سرادقات پر اسی کلمہ طیبہ کا نقش کیا ۔ پھر آسمانوں کو خلق فرما کر ان کے اطراف کو اسی پاک کلمہ کی تحریر سے مزین فرمایا ۔ اس کے بعد ملائکہ کو پیدا کر کے ان کو آسمانوں میں سکونت دی اور ان پر اپنی ربوبیت اور حضرت محمد مصطفےٰ کی نبوت اور حضرت علیؑ کی ولایت کا اقرار پیش کیا ملائکہ کے جسم لطیف پر یہ سن کر لرزہ پیدا ہو گیا ۔ بوجہ تاخیر جواب کے خداوند کریم نے ان سے اظہار عتاب ، کے طور پر ایک وقت کیلئے منظر رحمت اٹھالی ۔ اس کے بعد سات برس[2] تک ملائکہ عرش کا طواف کرتے رہے اور اللہ سے معافی طلب کرتے رہے جب انہوں نے اسی کلمہ طیبہ کا اقرار زبان پر جاری کیا تو خدا نے ان سے عتاب کو دور فرما کر اظہار رضا مندی فرمایا اور ان کو اپنی عبادت کے لئے چن لیا ۔ پھر ہمارے انوار کو تسبیح کا حکم ہوا ۔ پس ہمارے انوار نے تسبیح جاری کی تو ملائکہ نے سن کر تسبیح جاری کی ۔ اگر ہمارے انوار کی تسبیح نہ ہوتی تو ملائکہ کو تسبیح و تقدیس کے ادا کرنے کا طریقہ معلوم نہ تھا ۔ پھر خدا نے ہوا کو پیدا کیا اور اس پر کلمہ طیبہ (توحید و نبوت و ولایت) کا نقش فرمایا ۔ پھر قوم جن کو پیدا کر کے ان کو ہوا میں سکونت دی اور ان سے اسی کلمہ طیبہ کے اقرار کو طلب کیا ۔ چنانچہ ان میں سے اقرار کرنے والوں نے اقرار کیا اور انکار کرنے والوں نے انکار کر دیا اور ان میں سے پہلا انکار کرنے والا شخص ابلیس تھا ۔ پس اس پر شقاوت (بدبختی) کی مہر لگ گئی ۔ پھر خدا نے ہمارے انوار کو تسبیح کا حکم دیا چنانچہ ہمارے انوار نے تسبیح زبان پر جاری کی اور قوم جنات میں سے مومنین نے بھی تسبیح جاری کی ۔ اگر ہماری تسبیح نہ ہوتی تو ان کو تسبیح کا پتہ نہ ہوتا ۔ پھر خداوند کریم نے زمین کو پیدا کیا اور اس کی اطراف کو کلمہ توحید و نبوت و ولایت کی تحریر سے مزین فرمایا ۔

اے جابر ! انہی کلمات مقدسہ کی بدولت آسمان بغیر ستونوں کے قائم ہیں اور زمین اپنے مقام پر ثابت ہے پھر خداوند کریم نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور اس میں روح کو پھونکا اور اس کی ذریت کو اس کی صلب سے عالم ذر میں جمع کر کے اپنی ربوبیت اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت اور حضرت علیؑ کی ولایت کا اقرار لیا ۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۴۸ سے آگے) اختیار میں نہیں بلکہ وہ مجبور ہے وہ شعاعوں کو قطعاً نہیں روک سکتا لیکن اللہ سبحانہٗ حضرات محمدؐ و آل محمدؐ کیلئے فاعل مختار ہے نیز سورج جب سے ہے شعاع اس کے ساتھ ہے لیکن یہاں ایسا ہرگز نہیں ہے ایک حال میں خدا تھا اور یہ نہ تھے وہ قدیم ہے یہ حادث ہیں وہ خالق ہے یہ مخلوق ہیں پس یہاں تشبیہ سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح شعاع شمس شمس کی مظہر ہے شمس کے وجود کی دلیل ہے اور اس کے فیض کی قاسم ہے اسی طرح یہ پاک ہستیاں اللہ کی مظہر اور اس کے وجود کی برہان ساطع اور اس کے فیض قدس کے مخلوق تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں (منہ) [1] یہاں مکان سے مراد مطلق جائے قرار ہے (منہ) [2] برس کی تعبیر مجازی ہے کیونکہ روایات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ملائکہ کی تخلیق نظام شمسی کے قیام سے پہلے ہے ۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال ۔ حسین بخش عفی عنہ

اور اس اقرار میں بھی ہمارے انوار کو ہی سبقت حاصل تھی۔
پس جناب محمد مصطفےٰؐ (کے نورِ پاک) کو خطاب کرکے فرمایا مجھے اپنی عزّت و جلال کی قسم، اگر تجھے اور علیؑ کو اور تمہاری عترتِ طاہرہ کو جو ہادی و مہدی ہیں، خلق نہ کرتا، تو نہ جنّت کو پیدا کرتا اور نہ نار کو، نہ مکان و زمین کو نہ آسمان و ملائکہ کو اور نہ کسی دوسری مخلوق کو پیدا کرتا۔
اے محمدؐ! تو تمام مخلوقات سے میرا خلیل و حبیب و صفی و برگزیدہ و محبوب ترین ہے تو ہی اوّل مخلوق ہے۔ تیرے بعد تیرا وصی صدیق امیر المومنین علیؑ ہے جو تیرا مؤید و ناصر، میری مضبوط رسی اور میرے اولیاء کا نور ہے اور اس کے بعد آئمہ طاہرین ہیں جو ہادی و مہدیؑ ہیں۔ تمہاری خاطر میں نے سب مخلوق کو خلق کیا ہے تم ہی میرے اور میری تمام مخلوق کے درمیان برگزیدہ ہو۔ تمہیں میں نے اپنی عظمت کے نور سے پیدا کیا۔ تمہاری وجہ سے مخلوق میری رضا و غضب کی حقدار بنے گی اور تمہاری وجہ سے مخلوق سے سوال و جواب ہوگا۔ پس ہر شے ہلاک ہونے والی ہے۔ سوائے میرے "وجہ" کے اور تم ہی میراؑ "وجہ" ہو۔ تم ہلاک نہ ہوگے اور تم سے محبت رکھنے والے ہلاک نہ ہوں گے اور جو تم کو واسطہ قرار دینے کے بغیر میری طرف متوجہ ہوں گے وہ گمراہ اور ہلاک ہوں گے۔ تم ہی میری مخلوق میں برگزیدہ اور اہلِ ارض و سما کے سردار ہو۔
سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جب خداوندکریم نے حضرت آدم کی اولاد سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا اور فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ تو پہلے ہم ہی تھے جنہوں نے بَلٰی کہا اس کے بعد حضرت محمدؐ کی نبوت اور حضرت علیؑ کی ولایت کا اقرار لیا۔ پس اقرار کرنے والوں نے اقرار کیا اور انکار کرنے والوں نے انکار کیا۔
سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے حضرت باقر العلوم علیہ السّلام نے فرمایا پس ہم ہی پہلی مخلوق ہیں جنہوں نے پہلے پہل اللہ کی عبادت کی اور اس کی تسبیح زبان پر جاری کی اور ہم ہی تمام مخلوق کی خلقت کا ذریعہ اور ان کی تسبیح و عبادت کا وسیلہ ہیں خواہ ملائکہ ہوں یا انسان۔ پس ہم ہی کے ذریعہ سے اللہ کی معرفت حاصل کی گئی اور ہم ہی کے ذریعہ سے اس کی عبادت ہوئی اور ہم ہی کی وساطت سے اس کی توحید پہچانی گئی۔ تمام مخلوقات میں سے جن کو عزت ملی وہ ہماری ہی بدولت ہے نیز ثواب کا استحقاق ہماری اطاعت سے ہے ---------- اور عذاب کا استحقاق ہماری ہی نافرمانی سے ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی اِنَّا نَحْنُ الصَّافُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ اور یہ آیت تلاوت فرمائی قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعَابِدِيْنَ پس جناب رسالتمآبؐ ہی پہلے وہ شخص ہیں۔ جنہوں نے خدا کے لئے "ولد" کی نفی کی اور اس کے شریک کو محال قرار دیا اور ان کے بعد ہماری یہی شان ہے۔
ہمارا نور صلب آدمؑ میں رہا۔ پھر یکے بعد دیگرے اصلاب و ارحام میں منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ صلب عبد المطلب میں پہنچا اور یہاں سے آگے دو حصّوں میں تقسیم ہوا۔ ایک حصّہ حضرت عبد اللہ کی طرف اور دوسرا حصّہ حضرت ابو طالب کی طرف منتقل ہوا۔ چنانچہ خدا ارشاد فرماتا ہے۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْنَ اس سے مراد اصلاب انبیاء اور ان کی زوجات

کے ارحام طاہرہ ہیں۔

نوٹ :۔ یہ حدیث اختصار کے پیشِ نظر مراوی ترجمہ سے ذکر کی ہے۔

(۲) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ارشاد خدا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا میں فطرت سے مراد توحید و رسالت اور ولایت امیر المومنین علیؑ ہے۔

(۳) نیز حضرت صادق آلِ محمدؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ خداوندکریم نے تمام مخلوقات کے پیدا کرنے سے قبل چودہ ہزار سال نور محمدی کو خلق فرمایا اور اس کے ساتھ بارہ حجاب پیدا کئے (ان حجابوں سے مراد آئمہ طاہرین ہیں) مقدمۂ تفسیر

(۴) عن تفسیر الامامؑ انہ قال ان ولایۃ محمد وَآلِ محمد ھی الفرض الاقصیٰ والمراد الافضل مَا خَلَقَ اللّٰهُ اَحَدًا من خلقہ ولا بعث احدا من رسلہ الالیدعوھم الی ولایۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم وعلیؑ وخلفائہ ویاخذ علیھم العھد لیقیموا علیہ ولیُعْلِمُوا بہ سائر عوام الامم (الخبر)

تفسیر امام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تحقیق محمدؐ و آل محمدؐ کی ولایت انتہائی مقصود و مراد خداوندی ہے خدا نے جس قدر مخلوق پیدا کی ہے اور جتنے انبیاء مبعوث فرمائے ہیں وہ صرف اس لئے کہ باقی مخلوق کو حضرت محمد مصطفیٰؐ اور حضرت علیؑ اور ان کے جانشینوں کی ولایت کی طرف دعوت دیں اور ان سے عہد لیا کہ وہ خود بھی اس پر ثابت قدم رہیں اور اپنی امتوں کو بالعموم اس کی تعلیم دیں۔

(۵) عن امالی الشیخ عن الصادقؑ قال ولایتنا ولایۃ اللّٰہ التی لم یبعث نبی قط الا بھا

امالی شیخ سے منقول ہے کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا کہ ہماری ولایت اللہ کی ولایت ہے کوئی نبی اس کے بغیر مبعوث نہیں کیا گیا۔

(۶) عن الکافی عن الصادق ما من نبی جاء قط الا بمعرفۃ حقنا وتفضیلنا علی من سوانا

حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں آیا جو ہماری معرفت نہ رکھتا ہو اور ہمیں غیروں سے افضل نہ مانتا ہو۔

(۷) عنہ ایضاً عن ابی الحسنؑ قال ولایۃ علی مکتوبۃ فی جمیع صحف الانبیاء ولم یبعث اللّٰہ رسولاً الا بنبوۃ محمد و ولایۃ علیؑ

حضرت ابوالحسن علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ علیہ السلام کی ولایت تمام صحف انبیاء میں مکتوب ہے اور خدا نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نبوت اور علیؑ کی ولایت کے بغیر کسی نبیؑ کو مبعوث نہیں فرمایا۔

(۸) عن تفسیر العیاشی عن الحسن بن علی انہ قال من دفع فضل امیر المومنین فقد کذب بالتوراۃ والانجیل والزبور وصحف ابراھیم وموسیٰ وسائر کتب اللّٰہ المنزلۃ فانہ ما نزل شَیْئٌ مِنْھَا اِلَّا واھم ما فیہ بعد الاقرار

تفسیر عیاشی میں حضرت امام حسن علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو شخص حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے فضل کا انکار کرے تو گویا اس نے تورات، انجیل، زبور، صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور تمام کتب سماویہ کو جھٹلایا۔ کیونکہ ان کتب میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں اتری جس میں اقرار توحید اور اقرار نبوت کے بعد حضرت علیؑ

بتوحید الله والاقرار بالنبوة الاعتراف بولایة
علی والطیبین من اله قال قال رسول الله
ما قبض الله نبیا حتی امره ان یوصی
الی عشیرة من عصبته وامرنی ان اوصی
فقلت الی من یا رب فقال الی ابن عمک
علی بن ابی طالب فانی قد اثبته فی
الکتب السالفة وکتبت فیها انه وصیک
وعلی ذلک اخذت میثاق الخلائق و
مواثیق انبیائی ورسلی اخذت مواثیقهم
لی بالربوبیة ولک یا محمد بالنبوة و
لعلی بالولایة

(۹) عن حذیفة بن اسید قال قال رسول
الله ما تکاملت النبوة لنبی فی الاظلة حتی
عرضت علیه ولایتی وولایة اهل
بیتی ومثلوا له فاقروا بطاعتهم و
ولایتهم

(۱۰) عن کتاب سلیم بن قیس الهلالی عن
المقداد قال سمعت رسول الله یقول والذی
نفسی بیده ما استوجب آدم ان یخلقه
وینفخ فیه من روحه وان یتوب علیه
ویرده الی جنته الا بنبوتی وبولایة علی
بعدی والذی نفسی بیده ما اری ابراهیم
ملکوت السموات ولا اتخذه الله خلیلا
الا بنبوتی ومعرفة علی بعدی والذی نفسی
بیده ما کلم الله موسی تکلیما ولا اقام

علیہ السلام اور ان کی آل طاہرین کی ولایت کا اعتراف کرتے کا بیان
اہلبیت کے ساتھ مذکور نہ ہو۔ پھر فرمایا کہ حضرت رسالتمآبؐ
نے فرمایا کہ خدا نے کسی نبی کی قبض روح نہیں کی مگر یہ اس کو
اپنی عترت میں سے ایک کو وصی بنانے کا حکم دیا۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ اور مجھے بھی وصی مقرر کرنے کا حکم دیا۔ تو میں نے
عرض کی کہ یارب کس کو وصی بناؤں؟ فرمایا۔۔۔ اپنے عم زاد علیؑ
بن ابی طالبؑ کو۔ کیونکہ میں نے کتب سابقہ میں اسی کو حتمی طور پر قرار
دیا ہے اور ان میں لکھ دیا ہے کہ تحقیق وہی تیرا وصی ہوگا۔۔۔۔
۔۔۔۔ اور اسی پر میں نے تمام مخلوق اور انبیاء و رسل سے عہد و
پیمان لیا۔ میں نے ان سے اپنی ربوبیت اور تیری نبوت اور علیؑ
کی ولایت کا ہی میثاق لیا تھا۔

حذیفہ بن اسید سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا
کہ کسی نبی کی نبوت پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی۔ یہاں تک کہ ان پر میری
اور میرے اہلبیت کی ولایت پیش کی گئی اور ان کے سامنے ان کی
صورتیں لائی گئیں۔ پس انہوں نے ان کی اطاعت و ولایت کا
اقرار کیا۔

کتاب سلیم بن قیس ہلالی سے بروایت مقدادؓ منقول ہے کہ میں نے جناب
رسالتمآبؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے قسم ہے اس ذات
کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ آدمؑ کا مستحق خلقت ہونا۔
اس میں روح کا پھونکنا اس کی توبہ کا قبول ہونا اور اس کا جنت کی
طرف پلٹنا صرف میری نبوت اور علیؑ کی ولایت ہی کی بدولت تھا
مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ ابراہیمؑ
کا ملکوت سما کی سیر کرنا اور اس کا خلیل اللہ بننا میری ہی نبوت اور
میرے بعد علیؑ کی معرفت کے طفیل سے تھا اور مجھے قسم ہے اس
ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ خدا کا حضرت موسیٰ سے کلام

عیسی آیۃ للعالمین الا بنبوتی والاقرار
لعلی من بعدی والذی نفسی بیدہ
ما تنباء نبی قط الا بمعرفتی والاقرار لنا
بالولایۃ ولا استاھل خلق من اللہ النظر
الا بالعبودیۃ لہ والاقرار لعلی بعدی

(۱۱) عن السرائر عن جامع البزنطی عن سلیمان
بن خالد قال سمعت اباعبداللہ یقول ما
من نبی ولا من آدمی ولا من انسی
ولا جنی ولا ملک فی السموٰت والارض الا
ونحن الحجج علیھم وما خلق اللہ خلقا
الا وقد عرض ولایتنا علیہ واحتج بنا
علیہ فمومن بنا وکافر جاحد حتی السموٰت
والارض والجبال

(۱۲) عن مناقب بن شہر اشوب عن محمد بن
الحنفیہ عن امیر المومنینؑ فی حدیث قال
ان اللہ تعالی عرض ولایتی وامانتی علی الطیور
فاول من آمن بھا البزاۃ البیض والقنابر
اول من جحدھا البوم والعنقا فلعنھما
اللہ من بین الطیور فاما البوم فلا تقدر ان
تطیر بالنہار لبغض الطیر لھا واما العنقا
فغابت فی البحار لا تری وان اللہ عرض
امانتی علی الارض فکل بقعۃ آمنت
بولایتی جعلھا طیبۃ زکیۃ وجعل
نباتھا وثمرھا حلوا عذبا وجعل ماءھا
زلالا وکل بقعۃ جحدت امامتی وانکرت

کرنا اور عیسیٰؑ کو عالمین کے لئے معجزہ بنا (میری) نبوت اور میرے
بعد علیؑ کے اقرار کی وجہ سے تھا اور مجھے قسم ہے اس ذات
کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ہماری معرفت اور ہماری ولایت
کے اقرار کے بغیر کوئی نبی، نبی نہیں بن سکا۔ اور کوئی مخلوق خدا کی
نظر رحمت کی مستحق نہیں ہوئی مگر اسکی عبودیت اور میرے بعد علی کی ولایت کے اقرار سے

سرائر میں بروایت جامع بزنطی سلیمان بن خالد کہتا ہے کہ میں نے حضرت
امام جعفر صادق علیہ السلام سے سُنا کہ آپ نے فرمایا، کوئی نبی،
کوئی بشر، کوئی جن و انس و ملک خواہ زمین میں خواہ آسمان میں ایسا
نہیں جس پر ہم حجت خدا نہ ہوں اور خداوند کریم نے کوئی ایسی
مخلوق پیدا نہیں کی جس پر ہماری ولایت کو پیش نہ کیا گیا ہو پس جو
مومن ہوئے وہ بھی ہماری وجہ سے اور جو کافر و منکر ہوئے وہ بھی
ہمارے بغض کے سبب سے ہوئے۔ حتیٰ کہ آسمانوں، زمینوں
پہاڑوں کا بھی یہی حال ہے۔

مناقب ابن شہر آشوب سے منقول ہے کہ حضرت محمد بن حنفیہ حضرت
امیر المومنینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ تحقیق اللہ سبحانہ
نے میری امامت و ولایت کو پرندوں پر پیش فرمایا۔ پس سب سے
پہلے سفید بازوں اور قمریوں نے قبول کیا اور بوم اور عنقار نے انکار
کیا۔ پس پرندوں میں سے ان دونوں پر خدا نے لعنت کی۔ لیکن بوم۔
پس وہ تو دن میں پرواز نہیں کر سکتا کیونکہ باقی پرندے اس کو مبغوض جانتے
ہیں اور عنقا؛ پس وہ سمندروں میں غائب ہو کر لاپتہ ہو گئی ہے اور
تحقیق اللہ نے میری ولایت کو زمین پر پیش کیا۔ پس جو بقعہ میری ولایت
پر ایمان لایا۔ خدا نے اس کو پاکیزہ قرار دیا اور اس کی انگوری
اور پھل کو میٹھا اور شیریں بنایا اور اس کے پانی کو خوشگوار بنایا اور
جس بقعہ نے میری امامت کا انکار کیا اور میری ولایت کو ترک
کیا۔ خدا نے اس کو زمین شور بنایا۔ اور اس کی انگوری کو تلخ اور

ولایتی جعلها سجا وجعل نباتها مرا دعلقما وجعل ثمرها العوسج والحنظل وجعل ماءها ملحا اجاجا۔ الخبر

بدمزہ قرار دیا اور اس کا پھل الوا و کوڑتمہ بنایا اور اس کا پانی نمکین و شور بنایا۔

(۱۳) عن الاختصاص عن جابر عن ابی جعفرؑ فی حدیث قال یاجابر سمّی اللہ الجمعۃ جمعۃ لان اللہ عزوجل جمع فی ذلک الیوم الاوّلین والاٰخرین وجمیع ماخلق اللہ من الجن والانس وکل شیئ خلق ربنا والسمٰوٰت والارضین والبحار والجنۃ والنار وکل شیئ خلق اللہ فی المیثاق فاخذ المیثاق منہم لہ بالربوبیۃ ولمحمد بالنبوۃ ولعلی بالولایۃ الخ

اختصاص سے بروایت جابر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اے جابر خدا نے جمعہ کا نام جمعہ اس لئے رکھا ہے کہ اس روز اوّلین و آخرین جن و انس، آسمان و زمین، خشک و تر اور جنت و نار غرضیکہ تمام مخلوق جو خداوند کریم نے پیدا کی ہے ان سب کو جمع کر کے ان سے اپنی ربوبیت اور حضرت محمدؐ مصطفٰے کی نبوّت اور اور حضرت علیؑ کی ولایت کا اقرار لیا۔ اسی مضمون کی روایات جلد ۱۴ صد ۲ پر ملاحظہ ہوں۔

(۱۴) فی حدیث عن النبیؐ قال یاجارود لیلۃ اسریٰ بی الی السماء اوحی اللہ عزوجل ان سل من ارسلنا قبلک من رسلنا علی ماقد بعثوا فقلت لہم علی ما بعثتم فقالوا علی نبوّتک وولایۃ علی بن ابی طالب والائمۃ منکما ثم اوحی الی ان التفت عن یمین العرش فالتفت فاذا علی والحسن والحسین وعلی بن الحسین ومحمد بن علی وجعفر بن محمد بن علی ۔۔۔۔۔۔۔ وموسٰی بن جعفر وعلی بن موسٰی ومحمد بن علی وعلی بن محمد والحسن بن علی والمھدی فی ضحضاح من نور یصلون فقال لی الرب تعالٰی ھؤلاء الحجج اولیائی الخبر

ایک حدیث میں حضرت رسالتمآبؐ نے جارود کو ارشاد فرمایا کہ جس رات مجھے آسمانوں کی سیر کرائی گئی تو خدا نے میری طرف وحی کی کہ اپنے سے پہلے رسولوں سے دریافت کیجئے کہ وہ کس شرط پر مبعوث کئے گئے پس میں نے ان سے پوچھا کہ تم کس شرط پر مبعوث ہوئے؟ تو انہوں نے کہا کہ تیری نبوت اور علیؑ اور باقی آئمہ کی ولایت کے اقرار پر ہم مبعوث ہوئے پھر میری طرف وحی ہوئی کہ عرش کی دائیں جانب نظر کر پس میں نے دیکھا تو علیؑ، حسنؑ، حسینؑ، علی بن الحسینؑ، محمد بن علی، جعفر بن محمد، موسٰی بن جعفر، علیؑ بن موسٰیؑ، محمد بن علیؑ، علی بن محمدؑ، حسنؑ بن علیؑ اور حضرت مہدیؑ علیہم السلام۔ ایک ایوانِ نور میں مشغول عبادت ہیں۔ پس مجھے ارشاد ہوا کہ میرے اولیاء حجت علی الخلق یہی ہیں۔ مزید تفصیل جلد ۸ صد ۲۷۲ اور جلد ۱۲ صد ۲۴ پر ملاحظہ ہو۔

(۱۵) عن ینابیع المودۃ عن ابن مسعود قال قال

ینابیع المودۃ سے بروایت ابن مسعود منقول ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ

رسولؐ اللہ لما عرج بی الی السماء انتھی بی السیر مع جبرئیل الی السماء الرابعۃ فرأیت بیتاً من یاقوت احمر فقال جبرئیل ھذا البیت المعمور قم یا محمد فصلّ الیہ قال النبیؐ ، جمع اللہ النبیین فصفوا ورائی صفاً فصلیت بھم فلما سلمت اتانی آتٍ من عند ربی فقال یا محمد ربک یقرئک السلام ویقول سل الرسل علی ما ارسلتھم من قبلک فقلت معاشر الرسل ، علی ماذا بعثکم ربکم قبلی ؟ فقالت الرسل علی نبوتک وولایۃ علی بن ابی طالب الخبر

نے فرمایا کہ جب مجھے معراج آسمانی کرائی گئی ۔ میرا گذر جبرئیل کے ہمراہ چوتھے آسمان سے ہوا پس میں نے وہاں یاقوت احمر کا ایک محل دیکھا تو جبرئیل نے کہا کہ یہ بیت المعمور ہے ۔ یہاں ٹھیر کر اس کی طرف رُخ پھیر کر نماز پڑھئے ۔ پس حضور فرماتے ہیں ۔ کہ خدا نے تمام انبیاء کو جمع کیا اور انہوں نے میرے پیچھے صف باندھی پس میں نے ان کو نماز پڑھائی ۔ جب سلام پڑھا ۔ تو فرشتہ اللہ کی طرف سے آ پہنچا ۔ پس کہا ۔ اے محمدؐ ! خدا بعد تحفہ سلام کے فرماتا ہے کہ رسولوں سے سوال کیجئے کہ میں نے ان کو کس شرط پر مبعوث کیا ۔ پس میں نے پوچھا ۔ اے گروہ انبیاء تم کو خدا نے مجھ سے پہلے کس شرط پر مبعوث کیا ۔ پس رسولوں نے جواب دیا کہ تیری نبوت اور علیؑ بن ابی طالب کی ولایت کے اقرار پر ہم مبعوث ہوئے)

نقل العلامۃ ھذا الحدیث عن ابن عبد البر و ابی نعیم وفی تفسیر القمی والبصائر عن الصادقؑ قال والذی نفسی بیدہ لملائکۃ اللہ فی السموات اکثر من عدد التراب فی الارض وما فی السماء موضع قدم الا وفیھا ملک یسبحہ ویقدسہ ولا فی الارض شجر ولا مدر الا وفیھا ملک موکل بھا وما منھم احد الا ویتقرب کل یوم الی اللہ بولایتکم اھل البیت ویستغفر لمحبینا ویلعن اعدائنا ۔

علامہ حلّی نے اس حدیث کو ابن عبد البر اور ابی نعیم سے بھی نقل کیا ہے تفسیر قمی اور بصائر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے البتہ آسمان میں اللہ کے فرشتے زمین میں مٹی کے ذرات سے زیادہ ہیں ۔ آسمان میں کوئی قدم رکھنے کی ایسی جگہ نہیں ۔ جہاں ایک فرشتہ مشغول تسبیح و تقدیس نہ ہو اور زمین پر کوئی انگوری یا کوئی ڈھیلا ایسا نہیں ۔ جہاں ایک فرشتہ موکل موجود نہ ہو اور ان میں سے ہر ایک ہر دن اللہ کی بارگاہ میں محبت اہل بیت کو ذریعہ قرب قرار دیکر مناجات کرتے ہیں اور ہمارے محبوں کے لئے استغفار اور ہمارے دشمنوں پر لعنت بھیجتے ہیں ۔

۱۷ ۔ بحار الانوار ج ۷ ص ۲۶ ۔ جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا قرآن پر ایمان نہیں اس کا تورات پر بھی ایمان نہیں کیونکہ ان میں سے ایک پر ایمان لانا بغیر دوسرے کے قابل قبول نہیں ہے ۔ اسی طرح ولایت علیؑ پر ایمان لانا ایسا ہی فرض ہے ۔ جس طرح نبوت محمدؐ پر ایمان لانا فرض ہے ۔ پس جو نبوت محمدؐ پر ایمان لائے اور ولایت علیؑ کا منکر ہو پس اس کا نبوت پر کوئی ایمان نہیں ۔

چنانچہ آپ نے فرمایا کہ بروز محشر جب خلق سے ایمان کا سوال ہوگا۔ تو پہلے منادی کلمۂ توحید کی صدا بلند کرے گا۔ پس تمام موحد یہ کلمہ زبان پر جاری کریں گے اس کے بعد حضرت محمد مصطفٰے کی نبوت کی شہادت (اشھد ان محمد رسول اللہ) کی صدا بلند کرے گا۔ پس تمام مسلمان یہ کلمہ زبان پر جاری کریں گے۔ اس کے بعد عرصۂ محشر سے کوئی کہنے والا کہے گا کہ ان کو جنت میں لے جاؤ۔ کیونکہ نبوت محمدؐ کا اقرار زبان سے ان لوگوں نے جاری کر دیا ہے تو اللہ کی طرف سے ندا آئے گی:۔ قفوھم انھم مسئولون۔ ان کو ابھی روکو کہ ان سے سوال ہونا ہے پس عرض کیا جائے گا کہ یہ لوگ حضرت محمد مصطفٰے کی نبوت کی شہادت دے چکے ہیں۔ اب ان کو مزید کیوں روکا جا رہا ہے؟ تو ارشاد قدرت ہوگا۔ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ عن ولایۃ علی بن ابی طالب ان کو روکو کیونکہ ان سے ابھی ولایت علیؑ بن ابی طالب کا سوال باقی ہے۔ اے میرے عباد (ملائکہ) میں نے ان لوگوں کو حضرت محمدؐ کی نبوت کے ساتھ ایک اور چیز کی شہادت کا حکم بھی دیا تھا (ولایت علی بن ابی طالب) اگر بجا لائیں تو لائق اکرام و اعزاز ہیں۔ ورنہ ان کو نہ مصطفٰیؐ کی نبوت کی شہادت فائدہ مند ہے اور نہ میری ربوبیت کا اقرار مفید ہے پس ولایت کا اقرار کرنے والے کامیاب ہوں گے اور انکار کرنے والے ہلاک ہوں گے اور بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو کہہ دیں گے کہ ہم ولایت علیؑ کے قائل اور آل محمدؐ کے محب تھے۔ حالانکہ وہ جھوٹے ہوں گے اور ان کا یہ خیال ہوگا کہ ہم اس جھوٹ کی وجہ سے بچ جائیں گے پس حضرت علیؑ فرمائیں گے کہ جنت میرے اولیاء کی خود گواہی دیگی۔ اور جہنم میرے دشمنوں کو خود پہچان لے گی۔ پس جنت سے ایک ہوا باہر آئے گی اور وہی نسیم جنت علیؑ کے دوستوں کو اٹھا کر خود محلات جنت میں پہنچا دے گی اور جہنم سے شعلے بلند ہوں گے جو دشمن علیؑ کو اپنی لپیٹ میں لے کر داخل نار کریں گے۔

پس جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا۔ یا علیؑ تو اسی طرح قسیم جنت و نار ہے تو دوزخ سے کہے گا کہ وہ تیرا ہے اور یہ میرا ہے۔ اس مضمون کی احادیث بکثرت ہیں اس مقام پر اسی قدر کافی ہے۔ یہ باختلاف الفاظ جلد ۲ ص ۱۴۳ پر ملاحظہ ہو۔

اللّٰھُمَّ صلّ علی محمد و آلِ محمد وعجل فرجھم وسھل مخرجھم واھلک اعدائھم واجعلنا من المتمسکین بولائھم یارب العلمین

مسئلۂ تفویض

بعض جہلاء لوگ آئمۂ معصومین علیہم السلام کے کمالات کی تاب برداشت نہ لا کر ان کے بعض کلمات سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان کو خالق و رازق کہہ دیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ شانِ اقدس اہلِ بیت میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے جن لوگوں نے اہل بیت عصمت کی خصوصیات کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے ان کو آپ جیسا عام انسان تصور کر لیا اور ان کی جانب سے مافوق العادۃ صادر شدہ امور کی تاویلیں تلاش کر لیں۔ اور بعض اوقات متعلقہ روایات کو ضعف کی

ان لوگوں سے اظہار برأت کرتا ہوں جو ہماری طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں۔ جن کو ہم اپنے وجود میں نہیں پاتے۔ اے اللہ! خلق و امر کا مالک صرف تو ہے ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اے اللہ! تو ہمارا بھی خالق ہے اور ہمارے آباء اولین و آخرین کا بھی خالق ہے۔ اے اللہ ربوبیت تیری ذات کو زیبا ہے اور خدائی تیرے لئے ہی موزوں ہے۔

لعنت ہے ان نصاریٰ پر جنہوں نے تیری عظمت کو گھٹایا اور لعنت ان لوگوں پر جو ان جیسی باتیں کریں۔

اے اللہ ہم تیرے بندے اور تیرے بندوں کی اولاد ہیں۔ ہم اپنے نفسوں کے لئے نفع و نقصان اور موت و حیات کے مالک نہیں۔ اے اللہ! جو ہم کو خالق و رازق سمجھے ہم تیری طرف اس سے بری ہیں جس طرح کہ حضرت عیسیٰ نصرانیوں سے بری ہیں۔ اے اللہ! ہم نے ان لوگوں کو اس (عقیدہ فاسدہ) کی دعوت نہیں دی۔ لہٰذا ان کے قول فاسد کی گرفت میں ہم کو نہ لانا

نیز زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ ایک شخص عبداللہ بن سبا کی اولاد میں سے آپ کے متعلق تفویض کا قائل ہے۔ آپ نے فرمایا! تفویض کا کیا مطلب؟ میں نے عرض کی وہ کہتا ہے کہ خدا نے حضرت محمد مصطفےٰ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کو پیدا کیا اور پھر سب کچھ ان کے سپرد کر دیا پس باقی سب مخلوق کو ان دونوں نے پیدا کیا اور یہی ان کو جلاتے اور مارتے ہیں اور یہی رزق دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا! اس دشمن خدا نے جھوٹ کہا ہے۔ جب دوبارہ تو اس سے ملے تو یہ آیت اس کو پڑھ کر سنانا جو کہ سورۂ رعد میں ہے اَمْ جَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (کیا ان لوگوں نے اللہ کے شریک بنائے کہ وہ اسی کی طرح خلق کر سکتے ہیں پس ان پر معاملۂ خلق متشابہ ہو گیا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ ہی ہر شے کا خالق اور وہ واحد و قہار ہے) مقصد یہ تھا کہ اس آیت کی رُو سے خُدا کے سوا کسی کو خالق ماننا شرک ہے۔

مقدمہ تفسیر میں احتجاج طبرسی سے منقول ہے کہ ایک دفعہ تفویض کے مسئلہ میں شیعوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ایک گروہ کہتا تھا کہ اللہ نے آئمہ کو طاقت دی ہے کہ یہ پیدا بھی کرتے ہیں اور رزق بھی دیتے ہیں اور یہ معاملہ انہی کے سپرد ہے اور دوسرا گروہ اس عقیدہ کی تردید کرتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چیز محالات میں سے ہے کیونکہ اجسام سوائے اللہ کے کوئی پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ پس ان دونوں گروہوں کی رائے یہ ٹھہری کہ محمد بن عثمان (نائب امام) کی طرف رجوع کیا جائے پس ان دونوں گروہوں نے (نائب مذکور) کی وساطت سے حضرت حجتؑ کی خدمت میں عریضہ بھیجا پس حضرت حجت علیہ السلام کی جانب سے یہ جواب صادر ہوا۔

ان اللہ تعالیٰ ھو خلق الاجسام کلھا وقسم
الارزاق لانہ لیس بجسم ولا حال
فی جسم لیس کمثلہ شئ وھو السمیع

تحقیق اللہ تعالیٰ تمام اجسام کا خالق ہے اور رزقوں کے تقسیم کرنے
والا ہے کیونکہ نہ وہ جسم ہے اور نہ جسموں میں حلول کرنے والا ہے
اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

البصیر فاما الائمۃ فانھم یسئلون اللہ فیخلق و یسئلونہ فیرزق ایجابا لمسئلتھم و اعظاماً لحقھم

لیکن آئمہ علیہم السلام پس وہ اللہ سے سوال کرتے ہیں اور وہ پیدا کرتا ہے اور یہ سوال کرتے ہیں اور وہ رزق دیتا ہے ان کی دعاؤں کو مستجاب کرتے ہوئے اور ان کے حق کی عظمت کو بڑھاتے ہوئے۔

نیز روضۃ الواعظین سے منقول ہے۔ ایک شخص کامل بن ابراہیم کہتا ہے کہ میں حضرت امام حسن عسکری کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ مسئلہ تفویض کے متعلق دریافت کروں پس میں خدمت اقدس میں پہنچ کر سلام کرکے بیٹھ گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک مہ جبیں خوردسال بچہ جس کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی میرے قریب آیا اور پھر فرمایا اے کامل تو ولی اللہ اور حجۃ اللہ کے پاس مفوضہ کے بارے میں کچھ دریافت کرنے کے لئے آیا ہے وہ تو جھوٹے ہیں بلکہ ہمارے دل اللہ کی مشیت کے ظرف ہیں چنانچہ فرماتا ہے۔ وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ

پس ان احادیث سے بھی صاف طور پر واضح ہو گیا کہ خالق، رازق، محی، ممیت صرف اللہ سبحانہ کی ذات ہی ہے اور اس کی مخلوق میں سے کوئی شخص ان صفات میں اس کا شریک نہیں بلکہ اہلبیت اطہار کی طرف ان اوصاف کا منسوب کرنا شرک و کفر ہے اور اس قسم کا عقیدہ رکھنے والے لوگوں سے آئمہ اہلبیتؑ بری و بیزار ہیں۔

البتہ حضرات محمدؐ و آل محمدؐ مقصودِ کائنات ہیں اور اللہ کی طرف رسائی کے لئے مخلوق کا وسیلہ ہیں۔ نیز اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو نہ خلق ہوتی اور نہ رزق ہوتا۔ پس بارگاہِ رب العزت میں رسائی انہی کے ذریعہ سے ہے اور استجابت دعا انہی کے توسل سے ہوتی ہے نیز یہ بھی واضح رہے کہ آئمہ اہلبیتؑ کی شان و منزلت جو اللہ کے نزدیک ہے ہمارے ناقص عقول اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کے مراتب کی حقیقت یا خدا جانے یا محمدؐ مصطفےٰ جانے۔ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ہر صفت کمال میں جہاں تک امکانات بشریہ کا تعلق ہے آئمہ طاہرین اس کی آخری حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔

پس بے جا نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ رضائے خدا ان کے پیچھے ہے اور حق ان کے تابع ہے یعنی ان کے پیچھے چلنے والا ہی حق بجانب ہوتا ہے اور اسی کو ہی رضائے خدا حاصل ہو سکتی ہے اور بس

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ رضائے خدا کے آگے اور حق سے بڑھے ہوئے ہیں یا یہ کہ خدا ان کا محتاج ہے کیونکہ یہ عقیدہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے ہر ایک کو خدا کی طرف احتیاج ہے اور خدا کسی کا محتاج نہیں پس آل محمدؐ جس طرف چلتے ہیں حق ان کے پیش نگاہ ہوتا ہے اور رضائے خدا مطمح منظر ہوا کرتی ہے وہ حق کی طرف اور رضائے خدا کی جانب ہی اقدام کرتے ہیں پس وہ حق کے تابع اور رضائے خدا کے پیچھے ہی ہیں۔

البتہ جب عام لوگوں کے سامنے حق و باطل کے درمیان اشتباہ پڑ جائے اور رضا و غضب کے مسلک میں التباس ہو جائے اور چاہیں کہ حق مل جائے اور رضائے خدا دستیاب ہو تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ محمدؐ و آل محمدؐ کی سیرت کا مطالعہ کریں اور ان کے کردار کا جائزہ لیں پس جس طرف ان کا عمل ہوگا ماننا پڑے گا کہ حق اسی طرف ہے اور رضائے خدا

بھی اسی جانب ہے کیونکہ آلِ محمدؐ کا عمل حق و رضا کے پیچھے ہی ہوا کرتا ہے۔

پس آلِ محمدؐ کا حقیقی شیعہ و موالی وہی ہے جس کا کردار آلِ محمدؐ کے کردار کے پیچھے اور عمل آلِ محمدؐ کے عمل کے تابع ہو۔ گزشتہ عنوانات میں شیعان و محبانِ آلِ محمدؐ کے متعلق جس قدر فضائل گذر چکے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے حق میں ہیں جو ولایت آلِ محمدؐ کے ساتھ ساتھ اطاعت آلِ محمدؐ بھی رکھتے ہوں۔ جیساکہ اکثر احادیث کا صریحی مضمون یہی ہے۔ ورنہ صرف زبان سے دعویٰ کرکے عملی طور پر ان کے خلاف کرنا قطعاً فائدہ مند نہیں ہے۔ خداوند کریم تمام محبان آلِ محمدؐ کو توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین۔

والحمد للہ رب العٰلمین وصلی اللہ علیٰ محمد وآلہ الطاہرین

حرفِ آخر

بحمد اللہ باوجود نامساعد حالات اور انتہائی عدیم الفرصتی کے اس مقدمہ میں جن خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا اس سے فارغ ہوگیا ہوں خداوند کریم سے دست بدعا ہوں کہ بطفیل محمدؐ و آلِ محمدؐ مجھے اپنے اس مقصد خیر بلکہ جمیع مقاصدِ حقہ میں کامرانی عطا فرمائے اور میرے والدین کا سایہ میرے سر پر تا دیر سلامت رکھے جن کی دعاؤں سے میں ان خدمات کے بجا لانے کا اہل ہوا ہوں اور خداوند کریم ان کو اس کار خیر کا اجر جزیل عطا فرمائے اور قارئین کرام سے استدعا ہے کہ ہمارے حق میں دعا کریں کہ خداوند کریم اس مرحلہ میں توفیق اتمام مرحمت فرمائے۔

آج بتاریخ ۵ ذوالقعدۃ الحرام ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۵۹ء بروز جمعرات قریباً ۱۰ بجے صبح اس مقدمہ کی تکمیل سے فارغ ہوا ہوں اور اس کے بعد پارہ اوّل کی تفسیر کا کام شروع کروں گا۔ اگر قوم نے توجہ کی اور مالی رکاوٹیں حائل نہ ہوئیں تو انشاء اللہ ہر دو ماہ بعد ایک پارہ کی تفسیر چھپ کر منظر عام پر آتی رہے گی۔

تفسیر قرآن میں الفاظ کا حل آیات کا سلیس با محاورہ اُردو ترجمہ شانِ نزول، اقوال مفسرین، اقوال آئمہ، تفسیر باطنی وضاحتِ عقائد، مخالف اعتراض کا جواب، مناسب مقامات پر فقہی نقطہ نظر سے جزئیات مسئلہ کا بیان وغیرہ امور کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ اللہ سبحانہٗ کی توفیق مزید اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کی غیبی تائید سے ہو سکتا ہے۔

وھو الموفق والمعین وھو حسبی ونعم الوکیل۔

چہل حدیث

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو بطور وصیت کے ارشاد فرمایا۔ یا علی۔ میری امت میں سے جو شخص خوشنودیٔ خدا کے لئے چالیس حدیثیں یاد کرلے تو قیامت کے روز انبیاء صدیقین شہداء و صالحین کے ساتھ محشور ہوگا۔ حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی یارسولؐ اللہ! بیان فرمایئے۔ آپ نے چالیس حدیثیں بیان فرمائیں۔

(۱) اللہ پر ایمان لاؤ جو واحد و لاشریک ہے اس کی عبادت کرو اور غیر کی عبادت نہ کرو۔

(۲) صحیح وضو کے بعد نماز کو اپنے صحیح وقت میں ادا کرو کیونکہ بلا وجہ اس کو وقت سے ٹال کر پڑھنا اللہ کی ناراضگی کا موجب ہے۔

(۳) زکوٰۃ واجبہ کو ادا کیا کرو

(۴) ماہِ رمضان میں روزے رکھا کرو۔

(۵) اگر صاحب مال و استطاعت ہو تو حج بیت اللہ ادا کرو۔

(۶) اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو۔

(۷) از راہِ ظلم کسی یتیم کا مال نہ کھاؤ

(۸) سود خوری نہ کرو۔

(۹) شراب نوشی نہ کرو بلکہ کسی نشہ آور پانی کا استعمال نہ کرو

(۱۰) زنا و لواطہ نہ کرو۔

(۱۱) چغلخوری نہ کرو۔

(۱۲) اللہ کی جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

(۱۳) چوری نہ کرو۔

(۱۴) جھوٹی گواہی نہ دو کسی کے حق میں خواہ اپنا ہو یا بیگانہ۔

(۱۵) حق کو قبول کرلو۔ خواہ بیان کرنے والا چھوٹا ہو یا بڑا۔

(۱۶) ظالم کی طرف نہ جھکو خواہ اپنا قریبی ہی کیوں نہ ہو۔

طرف منسوب کر دیا اور جن لوگوں نے اہل بیت کی فرائشات اور ان سے صادر شدہ کمالات کو تسلیم و رضا کی نگاہ سے دیکھا وہ بعض اوقات، دوسری طرف اصول مذہب اور دیگر تصریحات، قرآن و حدیث سے غافل ہو گئے ۔پس تطبیق پر موفق نہ ہو سکنے کی وجہ سے جادۂ مستقیمہ سے ہٹ گئے اور اہل بیت عصمت کو خالق و رازق کہہ کر دامن توحید سے الگ ہو کر شرک کی وادی میں جا گرے۔

حالانکہ اہل بیت عصمت کے حق میں، نہ وہ بات درست تھی نہ یہ درست ہے وہ تفریط تھی اور یہ افراط ہے۔

قرآن مجید میں متعدد آیات جن میں خلق و رزق کا مسئلہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اور غیر مبہم الفاظ میں ذاتِ احدیت نے خالقیت اور رازقیت کا اپنی ذات میں حصر فرمایا ہے جن میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

اور حضرات محمدؐ و آل محمدؐ ہی چونکہ مقصد تخلیق کائنات ہیں جس طرح گذشتہ صفحات میں مضمون احادیث گزر چکا ہے اور حدیث قدسی مشہور لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ کے حقیقی مصداق بھی یہی ہیں تو گویا مقصد یہ ہوا کہ اگر یہ نہ ہوتے تو باقی مخلوقات میں سے کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ پر خلاق عالم کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کو اس عظیم مرتبہ پر فائز فرمایا اور اپنے اختیار سے ہی ایسا کیا۔ وہ مقصدِ کائنات ہیں اور مصداق لولاک ہیں۔ لیکن خدا کا ہی احسان ہے کہ اس نے ان کو اس عظمت کا حامل اور اس شان کا اہل قرار دیا۔ یہ اُس کا ان پر فضل و احسان ہی ہے ورنہ ایسا کرنا اس پر واجب نہیں تھا کیونکہ اگر نہ کرتا تو اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہ تھا۔

پس جب وہ مقصد و غایتِ خلقت کائنات ہیں تو باقی تمام مخلوق کا وجود خلق و رزق انہی کے صدقہ سے ہے اور یہ کہنا بجا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو نہ ہم موجود ہوتے نہ مخلوق ہوتے اور نہ مرزوق ہوتے۔ خداوند کریم نے اپنے لطف و کرم سے ان کو اپنے اور باقی مخلوقات کے درمیان واسطہ و وسیلہ قرار دیا ہے۔ ورنہ موجد بھی وہی ہے اور خالق و رازق بھی وہی ہے جس طرح اس نے ان کو پیدا کیا اسی طرح ہم کو اور ساری مخلوق کو بھی اسی نے ہی پیدا کیا ہے۔ وہ ان کا بھی رازق ہے اور ہمارا بھی رازق ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اگر وہ نہ پیدا ہوتے تو ہم نہ ہوتے ہمارا وجود خلق و رزق سب انہی کی مبنیّہ وساطت سے ہے پس اگر ان کو خالق و رازق کہنے سے یہی مطلب ہے کہ وہ چونکہ واسطہ ہیں۔ لہٰذا نسبت مجازاً ان کی طرف کی گئی ہے تو یہ کفر نہیں ہے لیکن آئمہ پر ان الفاظ کا اطلاق اذن شارع کا محتاج ہے اور اگر مطلب یہ ہو کہ وہ حقیقتاً خالق و رازق ہیں یہ عقلاً و نقلاً باطل ہے اور اس عقیدہ کا رکھنا کفر ہے۔

پس اگر احادیث آئمہ میں ایسے الفاظ وارد ہوں جن سے خلق و رزق کا ان کی طرف منسوب ہونا ثابت ہو تو بجائے اس کے کہ اس کو رد کیا جائے یا اس کو مبنی بر حقیقت قرار دے کر دامن توحید سے دست کشی کی جائے اس کا صحیح حل یہی ہے کہ ان کو واسطہ فی الخلق اور واسطہ فی الرزق قرار دے کر نسبت کو مجازیت پر محمول کر لیا جائے۔ اس کی عام فہم مثال یوں ہے کہ اگر ایک شریف انسان اپنے نوکروں کو ہمراہ لے کر کسی دوسرے شریف کا مہمان ہو اور میزبان اس کے لئے پُرتکلف کھانے

لائے تو اس کے بعد دستر خوان پر جملہ حاضر ہونے والے مہمانوں کو کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں میں نے کھلایا ہے اور اگر اس کے نوکر کہہ دیں کہ ہمیں اپنے آقا نے یہ کھانے کھلائے ہیں تو یہ بھی بے جا نہیں۔ حالانکہ حقیقتاً یہ انتظام و اہتمام ہوتا میزبان کی طرف سے ہی ہے اور وُہ شریف مہمان چونکہ سب کے لئے واسطہ ہے لہٰذا اس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور اگر میزبان کے کانوں تک یہ بات پہنچ جائے تو وہ بھی اسے برا نہیں مانتا کیونکہ اس نے سب کچھ کیا ہو اسی ایک مہمان کی خاطر ہوتا ہے لیکن اگر اس نسبت کو مبنی بر حقیقت قرار دیا جائے تو یقیناً کذب صریح بلکہ بہتان عظیم ہے پس بعض جہلا جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ خداوند کریم محمدؐ و آل محمدؐ کو پیدا کرنے کے بعد بالکل بے کار اور معطل سا ہو گیا ہے۔ اور یہی جو جلسے ہم میں خود کرتے ہیں وہ بحیثیت تماشائی کے دیکھ رہا ہے اور سب کچھ ان کے حوالہ کر چکا ہے۔ لہٰذا ان کے معاملات میں اس کو کوئی دخل دینے کا اختیار نہیں، خلق، رزق، زندگی و موت وغیرہ کا انتظام سب انہی کے ہاتھ میں ہے اور یہ بھی حقیقتاً نہ مجازاً ایسا عقیدہ رکھنا شرک و کفر ہے (خداوند کریم جملہ مومنین کو اس سے محفوظ رکھے۔)

عقلی طور پر ان کو خالق و رازق ماننے پر متعدد اشکالات وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ اگر یہ خالق ہوں تو جملہ مخلوق میں سے ان کے قاتلین عبدالرحمٰن بن ملجم، شمر وغیرہ سب ان کی مخلوق ہوں گے تو کونسی عقل یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ ادنیٰ ترین مخلوق اپنے خالق کو قتل کر دینے پر قادر ہو جائے۔

۲۔ اگر یہ خالق و رازق ہوں تو فدک تھا رزق اور اس پر ناجائز قبضہ کرنے والے تھے مخلوق و مرزوق تو کیا رازق کی شان یہی ہے کہ اپنے ادنیٰ ترین مخلوق و مرزوق سے رزق کا سوال کرے؟

۳۔ اگر یہ خالق ہوں تو ان کی مظلومیت کا رونا قیامت تک کس لئے ہے؛ کیا مخلوق خالق پر ظلم کر سکتی ہے۔

۴۔ کربلا کی سہ روزہ بھوک و پیاس کا رونا کس لئے ہے کیا مخلوق نے اپنے خالق کا تین دن تک رزق بند کر دیا تھا؟

۵۔ اگر حضرت علیؑ مثلاً خالق ہوں تو ان کے والدین حضرت ابوطالبؑ اور حضرت فاطمہؑ بنت اسد یا ان سے پہلے تا حضرت آدمؑ و حوّا تمام آباؤ امہات ان کی مخلوق ہوں تو کیا مخلوق کی پشت یا بطن سے خالق پیدا ہو سکتا ہے؟

۶۔ آئمہ معصومینؑ کی اولادیں بلا واسطہ یا بالواسطہ تا قیامت بھی یقیناً مخلوق ہیں تو کیا خالق کو مخلوق کے پیدا کرنے کیلئے شادی کی ضرورت ہے۔ بہرکیف اس فاسد عقیدہ سے متعدد اس قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

شیخ صدوق قدہ عقائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ مفوضہ اور غالیوں کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ کافر ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ و مجوس سے بھی بدتر ہیں چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ آپ نے فرمایا اے اللہ میں تیری طرف حول و قوت سے برأت چاہتا ہوں کیونکہ حول و قوت کا مالک صرف تو ہی ہے۔ میرے اللہ! میں تیری طرف،

لے یعنی جو لوگ میری طرف منسوب کرتے ہیں میں ان سے اور ان کے اس عقیدہ سے بری ہوں۔ منہ

(۱۷) خواہش نفس کے لئے عمل نہ کرو۔

(۱۸) کسی پاکدامن (نکاح والی عورت) کو زنا کی تہمت نہ دو۔

(۱۹) ریاکاری نہ کرو کیونکہ کم از کم ریاکاری بھی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے۔

(۲۰) کسی پست قد کو اوچھوٹے۔ اور کسی بڑی قدوالے کو اونچے لکڑنہ بلاؤ کیونکہ یہ عیب جوئی ہے اور خلق خدا سے مسخری نہ کرو۔

(۲۱) بلاء اور مصیبت پر صبر کرو۔

(۲۲) اللہ نے جو نعمتیں عطا کی ہیں اُن کا شکر ادا کرو۔

(۲۳) گناہ کے بعد اللہ کے عذاب سے نڈر نہ رہو اور اس کی رحمت سے مایوس بھی نہ ہوجاؤ۔

(۲۴) گناہوں سے توبہ کرو کیونکہ توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں اور استغفار کے بعد گناہ پر اصرار نہ کرو کیونکہ ایسا کرنا اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسولوں کے ساتھ مسخری کرنے کے برابر ہے (توبہ توبہ بھی کرتا رہے اور گناہ بھی کرتا رہے۔

(۲۵) یہ جان لو کہ جو مصیبت یا خوشی تمہیں پہنچی ہے اس نے پہنچنا ہی تھا اور جو چوک گئی اس نے چوکنا ہی تھا (مقصد یہ ہے کہ انسان ہائے ہائے کرکے اپنی مصیبت میں اضافہ نہ کرے بلکہ اللہ کے فیصلے کے سامنے سرتسلیم خم کرے۔)

(۲۶) کبھی ایسا نہ کرنا کہ مخلوق کی رضامندی کی خاطر اپنے اللہ کو ناراض کرلو۔

(۲۷) کبھی دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینا بلکہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا کیونکہ دنیا فانی اور آخرت باقی ہے۔

(۲۸) جو کچھ تم سے ہو سکے اپنے بھائیوں کی امداد سے بخل نہ کرنا۔

(۲۹) ظاہر و باطن کو ایک جیسا رکھو ظاہر اچھا اور باطن بُرا نہ بناؤ کیونکہ یہ منافقین کی نشانی ہے۔

(۳۰) نہ جھوٹ بولو نہ جھوٹوں کی صحبت اختیار کرو۔

(۳۱) حق بات کو سُن کر غصہ نہ کرو (جبکہ حق بات تمہارے مفاد کے خلاف ہو)

(۳۲) اپنے نفس کو اور اپنے اہل و عیال اور ہمسایوں کو حسب طاقت ادب سکھاؤ اور اپنے علم پر عمل کرو

(۳۳) اللہ کی مخلوق کے ساتھ جو معاملہ کرو حق کے ساتھ کرو۔

(۳۴) قریبی اور بعید کے لئے خوش خلق رہو اور جبار عنید نہ بنو۔

(۳۵) تسبیح تقدیس تہلیل اور دعا کو زیادہ کرو نیز موت کا ذکر اور موت کے بعد قیامت اور جنت و نار کا ذکر زیادہ کرو اور قرآن مجید کی قرأت زیادہ کرو اور اس کی ہدایات پر عمل کرو۔

(۳۶) مومنین و مومنات پر احسان و نیکی کرنے کو غنیمت سمجھو اور نیک کام سے گھبراہٹ محسوس نہ کرو۔

(۳۷) جس کام کو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسرے مومنوں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

(۳۸) کسی پہ بوجھ نہ ہو

(۳۹) کسی پر احسان کر کے جتلاؤ نہیں۔

(۴۰) دنیا کو قید خانہ سمجھو یہاں تک کہ خدا تجھے جنت کا گھر عطا فرمائے۔

یہ چالیس حدیثیں ہیں جو شخص ان کو یاد کرے اور ان پر عمل کرے وہ اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہوگا۔ اور لوگوں سے افضل اور اللہ کا محبوب ترین بندہ ہوگا انبیاء و صدیقین کے بعد۔ خداوند کریم ایسے شخص کو انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین کے ساتھ محشور کرے گا۔ اور یہ اس کے بہترین رفیق ہوں گے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص ہماری احادیث میں سے چالیس حدیثیں یاد کرے بروز محشر وہ فقیہہ ہو کر اُٹھے گا۔

معذرت

کافی عرصہ سے مقدمہ تفسیر انوار النجف کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا لیکن نامساعد حالات اور مالی مشکلات کے پیش نظر اس کو دوبارہ طبع نہ کرایا جا سکا۔ اب قارئین کرام کے بڑھتے ہوئے اصرار کے ماتحت ضروری اضافہ کے ساتھ اس کو دوبارہ طبع کرایا گیا ہے اور "دیر آید درست آید" کے مقولہ کے مطابق مقدمہ تفسیر کا تیسرا ایڈیشن، پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں مزید افادیت کا موجب ہوگا۔ انشاء اللہ۔ قارئین سے دعائے خیر کی اُمید رکھتا ہوں اور اپنی اس کاوش کا ثواب اپنے والدین مرحومین کو ہدیہ کرتا ہوں۔ جن کی نیک تمناؤں کا یہ ثمر اور نتیجہ ہے۔

الحمد للہ رب العالمین وصلّی اللہ علی محمد و آلہ الطاھرین

انا عبدہ الحقیر المسکین حسین بخش جاڑا ابن المرحوم المغفور ملک اللہ بخش جاڑا رضوان اللہ علیہ بانی جامعۃ العلمیہ باب النجف جاڑا من مضافات ڈیرہ اسمعیل خان، وبانی الجامعۃ العربیۃ "درس گاہ امامیہ" دریاخان ضلع میانوالی (پاکستان)

کتبہ محمد شفیق قریشی عفی عنہ سرگودھا وقد تمت الکتابۃ فی یوم الجمعۃ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء مطابق ۱۷ ذق ۱۳۹۸ھ فی دریاخان۔

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ ناظر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جبار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ دعا زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا احمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم